خوفناک اور تحیر انگیز حقیقی کہانی

شیطانی جال

مکمل ناول

راحیلہ مشتاق

مکروفریب، حرص وطمع، خودغرضی اوراحصال کی تاروں سے بُنے شیطانی جال میں پھنسے ابنِ آدم کی کہانی

شیطانی جال

مصنفہ : راحیلہ مشتاق

ڈر پبلی کیشنز
کتاب مارکیٹ، نیو اُردو بازار، کراچی
Ph: 021-32744391 & 32773302

شیطانی جال

آج چاند کی پندرہویں شب تھی۔ بابو کے چلے کی آخری رات، جو چلہ وہ کاٹ رہا تھا وہ پوری تین راتوں پر مشتمل تھا۔ دو بھیانک ترین اور دہشت انگیز راتیں وہ گزار چکا تھا اور تیسری و آخری رات کا وظیفہ پڑھنے کے لئے وہ مقررہ جگہ پر قدم رکھ چکا تھا۔

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دو راتوں کے وظیفے کے دوران پیش آنے والے دہشت ناک واقعات نے اس کے دل و دماغ پر بہت منفی اثرات مرتب کئے تھے۔ ڈر و خوف کے آکٹوپس نے بری طرح اسے اپنی گرفت میں کس رکھا تھا وہ لاکھ کوشش کے باوجود اپنے آپ کو خوف کی آہنی گرفت سے رہا نہیں کر پایا تھا۔ حالانکہ دو راتیں وہ کامیابی سے گزار چکا تھا اور اسے یہ بھی امید تھی کہ وہ آج کی تیسری اور آخری کامیاب رات کو بھی اپنے گلے سے لگائے گا کیونکہ برگد والے بابا نے اس کی کامیابی کی پیشین گوئی فرمائی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس کا دل اس بری طرح ڈر رہا تھا اور دھڑکنیں منتشر ہو رہی تھیں جیسے آج اس کے ساتھ ضرور کوئی بھیانک حادثہ پیش آنے والا ہو، کوئی اسے اس کے وجود کو اندر سے اکسائے دے رہا تھا کہ وہ یہ وظیفہ مکمل نہ کرے۔ یہاں سے بھاگ جائے لیکن بابو دل کی پکار اور اپنے اندر سے اٹھنے والی آواز کو نظر انداز کئے۔ دھڑکن کے انتشار کے ساتھ آگے بڑھا۔ دو راتوں کی کامیابی نے اسے ہمت و حوصلہ عطا کیا تھا۔ لہٰذا اس نے گردن اٹھا کر آسمان کی سمت دیکھا۔

چاند کو اپنے حصار میں لئے بے شمار ستارے یوں جگمگا رہے تھے جیسے مسکراتے ہوئے بابو کا حوصلہ بڑھا رہے ہوں اور کہہ رہے ہوں۔

''کامیابی تمہارا مقدر ہے بابو، آگے بڑھو اور آج کی رات کے سینے پر بھی اپنی فتح کے جھنڈے گاڑ دو'' ٹھنڈی اور خوشگوار ہواؤں نے بھی اسے تھپکیاں دے کر اس کا حوصلہ مستحکم کیا۔ یہی ٹھنڈی اور خوشگوار ہوائیں اس کے چہرے اور جسم سے ٹکرا کر اسے پر لطف احساس سے دوچار رہی تھیں۔ بلکہ اس کے اندر دبی ہمت کو جھنجھوڑ کو بیدار کر ڈالا۔

اگر زندگی میں محبت و دولت پانے کی خواہش ہے تو آج کی رات بھی اپنے دل کو مضبوط رکھ کر ہمت سے کام لینا ہوگا، ورنہ......؟'' اس سے آگے سوچنا بابو نے گوارہ نہ کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے چہرے کا رخ قبرستان کی سمت کر کے اپنے اطراف مقدس آیات کے الفاظ ادا کرتے ہوئے دائرے کی صورت میں حصار کھینچا اور خود حصار کے مرکز میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

☆......☆......☆

بابو کا اصل اور پورا نام ارباب بن عبداللہ تھا۔ اس کی ماں پیار و محبت سے اسے ''بابو'' کہہ کر بلایا کرتی تھی۔

اس کی بھولی بھالی اور سادہ طبیعت ماں کی نظر میں بابو ایک ایسے پڑھے لکھے انسان کو کہا جاتا ہے جو نیک و شریف ہونے کے علاوہ سچا کھرا اور اس قدر ذہین و سمجھدار شخص ہوتا ہے کہ دنیا کے مشکل سے مشکل ترین اور بے حد پیچیدہ مسئلے کو اپنی ذہانت کی بدولت چٹکی بجاتے ہی حل کر کے رکھ دیتا ہے۔

چونکہ بابو کی ماں بھی ہزاروں، لاکھوں ماؤں کی طرح اپنے بیٹے میں بے شمار خوبیاں دیکھنے کی شدید خواہش مند تھی اسی لئے اس معصوم عورت نے بابو کے پیدا ہوتے ہی اسے "میرا بابو، میرا بابو" کہنا شروع کر دیا جبکہ اس کے باپ نے اس کا نام ارباب تجویز کیا تھا۔

بابو نام رکھ کر اس کی ماں یہ سوچ کر مطمئن اور پر سکون رہنے لگی کہ اس کا بیٹا بھی زیادہ علم حاصل کرنے کا شوقین ہوگا اور ڈھیر ساری تعلیم حاصل کر کے اپنی عقل و سمجھداری سے ہر معاملے کو لمحات میں سلجھا کر رکھ دیا کرے گا۔ سیدھے سادے مزاج کا مالک ہوگا ہمیشہ سچی اور کھری بات کرے گا اور سب سے بڑھ کر اس قدر نیک و شریف انسان بن کر ابھرے گا کہ صرف اس کے ماں، باپ کو ہی نہیں پورے معاشرے بلکہ پورے ملک والوں کو اس پر فخر ہوگا۔ لیکن بابو کی غریب ماں! جس کا نام زلفاں بی تھا وہ قدرت کے فیصلے سے قطعی انجان و ناواقف تھی۔

یکے بعد دیگرے تین لڑکیوں کی پیدائش کے بعد سیکڑوں منتوں اور مرادوں کے بعد دنیا میں وارد ہونے والا ارباب بن عبداللہ المعروف بابو اپنی ماں کی تمام تر خواہشات کے قطعی برعکس ایک ایسا انسان نکل آیا جس نے سب سے زیادہ دکھ اپنی ماں کو ہی دیئے۔ اس ہستی کے دامن میں دکھوں کے کانٹے بھر دیئے جس نے بڑی تکلیفیں سہہ کر اسے پیدا کیا تھا۔

بچپن سے ماں، باپ کے بے جا لاڈ پیار نے اسے ایک بے انتہا ضدی انسان بنا کر رکھ دیا وہ اپنی ہر جائز و ناجائز بات منوانے کے ہنر سے اچھی طرح واقف تھا۔ تعلیم سے اسے رتی برابر دلچسپی نہ تھی یہی وجہ تھی کہ اس نے کئی سال برباد کرنے کے بعد بڑی مشکلوں اور نقل کے اصول پر عمل پیرا ہو کر میٹرک پاس کر لی۔

بابو کے لئے دس جماعتیں پاس کر لینا ہی ایک مکمل تعلیم کی حیثیت رکھتا تھا اسی لئے اس نے مزید تعلیم کا بوجھ اپنے ناتواں کاندھوں پر اٹھائے رکھنے کی زحمت گوارہ نہ کی اور میٹرک کی سند کو چوم کر فائل میں رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"اے تعلیم! یہ بابو اب تجھ سے وداع چاہتا ہے اور میری اللہ سے یہ دعا ہے کہ یہ سند جو میں نے بڑی مشکلوں سے حاصل کی ہے اور جسے میں آج اپنے دست مبارک سے فائل کے حوالے کر رہا ہوں زندگی میں پھر کبھی اس فائل کو کھولنے اور یہ سند نکالنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔" اور اپنی اس دعا کے اختتام پر اس نے با قاعدہ با آواز بلند "آمین" کہہ کر، اس طرح اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرے جیسے کسی عزیز کو منوں مٹی تلے دفنانے کے بعد اس کی ہستی کے لئے مغفرت کی دعا طلب کی ہو، ویسے اس نے اپنے طور پر اپنی میٹرک کی سند کو ایک مرحوم عزیز جان کر فائل کے سینے میں دفنا کر ہمیشہ کے لئے تجوری کی قبر میں بند کر دیا۔

بابو کے غریب باپ عبداللہ نے جب یہ دیکھا کہ بابو کو میٹرک کے بعد مزید تعلیم سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی تو اس نے بابو کے لئے ایک عدد پکی نوکری کی تلاش کا آغاز کر دیا۔ عبداللہ کو اس کا سارا دن بے کار بیٹھنا اور مفت کی درجنوں روٹیاں کھانا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔

"تیرا یہ لاڈلا! ایک انتہائی غیر ذمہ دار مفاد پرست اور بے حس انسان ہے۔ اس بے غیرت کو بوڑھے باپ پر تو کیا ترس آئے گا؟ جوان بہنوں کی خوشی و غمی کا بھی اسے معمولی سا احساس تک نہیں ہے۔" عبداللہ اکثر اپنے غصے کا اظہار کر دیا کرتا لیکن اللہ نے بابو کو ان کانوں ہی سے محروم رکھا تھا جس پر جوں رینگتی ہے وہ عبداللہ کی ہر کڑوی کسیلی ایک کان سے سن کر نہایت اطمینان و سہولت سے دوسرے کان کے راستے باہر دھکیل کر مزے

سے زندگی کے دن گزارے جا رہا تھا۔

"عزت مآب جناب بابو صاحب! آپ کا کہیں نوکری کرنے کا ارادہ ہے یا تا عمر میری کمائی پر عیش کرتے رہنے کا سوچ رکھا ہے۔"

عبداللہ کے باادب ہو کر طنز فرمانے پر وہ خوش دلی سے قہقہہ اگل کر رہ جاتا اور پھر باپ کو ستانے کے لئے جواب دیتا۔

"مابدولت نے کبھی نوکری نہ کرنے اور تاعمر باپ کی کمائی پر عیش کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ لہٰذا ہمیں دوبارہ نوکری کرنے کے لئے نہیں کہا جائے اس لفظ "نوکری" سے ہمیں بہت ذہنی اذیت پہنچتی ہے۔"

عبداللہ شہد میں ڈوبے طنز کے تیر برسا کر اور یہ سوچ کر چبھتے ہوئے جملے ادا کرتا کہ شاید لفظوں کی مار سے اس کا گہری نیند سویا ہوا ضمیر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے لیکن یہ دیکھ کر عبداللہ کو گہرا دکھ آن گھیرتا کہ بابو پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

"تیرا ضمیر سویا ہوا ہے یا مر چکا ہے؟" اس کی سب سے بڑی بہن کو اسی سوال نے پریشان کر رکھا تھا۔

"الحمدللہ زندہ ہے۔ لیکن چونکہ سلیپنگ پلز کھا کر سویا ہے اس لئے نیند بہت گہری ہے۔ لیکن تم لوگ فکر مت کرو ایک نہ ایک دن ضرور بیدار ہوگا۔" وہ گویا کسی کے طنز کا قطعی برا نہیں مانا کرتا۔

اب وہ کیسے کسی کو اس سچائی سے آگاہ کرتا کہ تعلیم کے بعد اگر اسے دوسری کسی چیز سے چڑ سی تھی یا دوسری کوئی چیز اسے سخت ناپسند تھی تو وہ اتفاق سے "نوکری" ہی تھی۔ خدا جانے کیا بات تھی کہ کام کرنے سے اس کی جان جاتی تھی بلکہ نوکری کے تصور ہی سے اسے ایک سو چار بخار آن گھیرتا۔ وہ آزاد فضاؤں میں پرواز کرنے والا ایک آزادی پسند پرندہ تھا یہ بات اس کے مزاج کے قطعی خلاف تھی کہ وہ کسی ایک جگہ ٹک کر مستقل مزاجی سے کسی ایک ملازمت کی انجام دہی کرے اور سب سے بڑھ کر تین یا پانچ ہزار روپے کی ملازمت کرنا وہ اپنی شان کے خلاف ہی نہیں سمجھتا تھا بلکہ اپنی توہین محسوس کرتا تھا۔

"تین ہزار روپے ماہانہ؟ یہ کہاں کی شرافت ہے؟ بندہ پورے مہینے گویا مفت میں ہی کام کئے جائے۔"

ایسی نوکریوں کی جانب تو وہ دیکھنا بھی پسند نہیں فرماتا تھا اس کی یہی شاہانہ باتیں عبداللہ کا دل جلا کر رکھ دیتیں۔

"ہاں، ہاں تو نے تو انگریزی میں ڈبل ایم اے کیا ہے نا تجھے تو تین ہزار روپے یومیہ والی نوکری ملے گی اور ملے گی نہیں بلکہ نوکری خود چل کر تیری خدمت میں حاضر ہو کر کہے گی۔ "اگر آپ نے مجھے قبول کرلیا تو یہ میرے لئے بڑے اعزاز کی بات ہوگی۔" عبداللہ کو اس کی یہ بات اس قدر بھڑکا کر رکھ دیتی کہ اس کا بس نہ چلتا وہ اپنے اس نالائق بیٹے کا سر پھوڑ ڈالتے۔

چونکہ نا تو اس میں صلاحیتوں کا خزانہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور نا ہی کسی فیکٹری یا دکان کے مالک کو کسی پاگل کتے نے کاٹا تھا کہ وہ ایک ڈی گریڈ میٹرک پاس بے ہنر آدمی کو تین ہزار روپے یومیہ کے حساب سے ادائیگی فرماتے اسی لئے عبداللہ کی ہزاروں کوششوں کے باوجود وہ بے روزگار ہی رہا۔

اپنی بے روزگاری کا تو اسے کوئی افسوس نہ تھا لیکن جب عبداللہ نے اس کی خوراک میں کمی کرنے کا عملی قدم اٹھایا تو آدھے پیٹ کی چیخ

وبیکار برداشت نہ کر کے اس نے غنڈہ گردی کی راہ اپنالی۔

کمزوروں کو طاقت کے بل پر شریفوں کو بدمعاشی کے جوہر دکھا کر اور غریبوں کو امیروں کے حکم پر ڈرائے اور دبائے رکھنا اس نے اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا غنڈہ گردی کے ساتھ ساتھ بھتہ وصولی بھی اس کا من پسند کھیل بن کر رہ گیا ضرورت پڑنے پر وہ مار پیٹ سے بھی گریز نہیں کرتا۔

جب کبھی اسے کسی بڑے ہوٹل میں جا کر اچھا کھانا کھانے کی خواہش جاگتی اور اس کی جیب بھی حسب معمول خالی ہوتی تو وہ کسی بھی راہ چلتے شریف بندے کو خنجر دکھا کر گھیر لیتا اور اس کے گلے پر خنجر کی تیز دھار رکھ کر کہتا۔

''جتنا مال تیری جیب میں ہے نہایت شرافت سے میرے حوالے کر دے ورنہ جان سے مار ڈالوں گا۔'' اس لمحے اس کے لہجے میں ایسی سفاکی اور چہرے پر درندگی چھا جاتی کہ کوئی بھی شخص مزاحمت کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا اور جیب میں موجود تمام نقدی اس کے حوالے کر کے جان بچ جانے پر شکر ادا کرتا ہوا خاموشی سے اپنی راہ ہو لیتا۔

''اگر پولیس تک بات پہنچائی تو اگلی بار جان دینی پڑ جائے گی۔'' بندے کو لوٹنے کے بعد وہ یہ دھمکی دینا ہرگز نہیں بھولتا تا کہ جان کا خوف ان کی زبان بندہی رکھے۔

ایک دن اس کا کیلے کھانے کو جی للچایا تو اس نے ایک غریب پھل فروش کے ٹھیلے پر اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر دھاوا بول دیا اور پھر وہ اور اس کے دو بدمعاش ساتھی اس وقت تک اس غریب کے ٹھیلے سے پھل اٹھا اٹھا کر کھاتے رہے اور پھلوں کے چھلکے اپنے اطراف پھینکتے رہے جب تک کہ پھل کھانے سے ان کا جی یا پیٹ نہیں بھر گیا۔

''صاحب! پیسے......'' جب ڈھیر سارے کیلوں پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد وہ سینہ تان کر جانے لگے تو پھل فروش کی آواز سن کر بابو نے پلٹ کر بوڑھے پھل فروش کو اپنی قہر برساتی نگاہوں سے گھورا۔

''کیا بولا تو......؟'' بابو نے قریب آ کر غصے سے دریافت کیا۔

''ابھی آپ لوگوں نے جو کیلے کھائے اس کے پیسے نہیں دیئے، میں نے پیسے مانگے ہیں۔'' پھل فروش نے جواب دیا۔

''میں پیسے دوں؟ بابو! بابو پیسے دے؟ ابے تو کیا میرے کو جانتا نہیں ہے۔ میں بابو ہوں بابو اور بابو نے کبھی کوئی چیز خرید کر نہیں کھائی۔ چھین کر کھانا بابو کی پہچان ہے۔ بابو! اس علاقے کا بادشاہ ہے۔ بادشاہ کیا سمجھا؟ چل پتلی گلی سے نکل لے۔'' بابو نے فلمی بدمعاشوں کے سے انداز میں چٹکی بجا کر کہا۔

''مجھے اپنے کیلوں کی قیمت چاہیے۔'' کیلے فروش کو اپنی بات پر قائم دیکھ کر بابو کی کھوپڑی گھوم کر رہ گئی۔

''کتنی بنی تیرے کیلوں کی قیمت؟'' بابو نے اپنی نگاہیں پھل فروش کی بوڑھی نگاہوں میں پیوست کرتے ہوئے گرجدار لہجے میں پوچھا۔

''ایک سو پچھتر روپے۔'' بوڑھے نے بے خوفی سے کہا ایک غریب پھل فروش کی یہی بے خوفی ہمت اور قیمت کا تقاضہ اس کے غصے کی آگ کو اس قدر بھڑکا گیا کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں بھی غصے کی اس آگ میں جل کر راکھ ہو گئیں اس نے غریب پھل فروش کو گریبان

سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچا اور ہاتھوں، پیروں کا بھرپور استعمال کر کے اسے اتنا مارا کہ وہ غریب نیم بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اتنا کچھ کرنے کے باوجود بھی جب اس کے غصے کی آگ ٹھنڈی نہ پڑی تو اس نے ٹھیلے پر موجود کیلے اٹھائے اور ایک بڑے سے مین ہول میں سارے کیلے انڈیل کر رکھ دیئے۔

اگر غلطی سے کوئی دوسرا بندہ اس کے ظلم و زیادتیوں کے خلاف آواز بلند کرنے کی حماقت کر بیٹھتا تو بابو اس کی تواضع بھی لاتوں، گھونسوں اور گالیوں سے کرتا اور حق بات کرنے والوں کو اسی کرب انگیز اذیتوں سے دوچار کرتا کہ دوسرا کوئی شخص حق بات کہنے کے لئے اپنی زبان کھولنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ بلکہ اکثر لوگ تو حق بات کہنے ہی سے توبہ کر لیتے۔

اس کی یہی دہشت ہر دل پر سانپ کی مانند پھن کاڑھے بیٹھی رہ گئی اور یہی دہشت شریفوں کی چپ اور کمزوروں کی کمزوری بنتی چلی گئی۔ ہر شریف انسان اسے مخاطب کرنے یا اس کے مخاطب ہونے سے خوف محسوس کرتا تھا اور ان کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ کبھی بابو کی "مہربانیوں" کی زد میں نہ آئے۔

بابو کی کوئی بات یا عادت محلے والوں کو پسند تھی تو وہ صرف یہ تھی کہ وہ عورتوں کو کبھی بری نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا اور محلے کی ہر عورت کی دل سے عزت کرتا تھا۔ وہ ان لڑکوں سے ہی دور رہتا تھا جو رنگ برنگی تتلیوں کو پکڑنے کے لئے سارا دن حسین تتلیوں کے پیچھے بھاگتے دوڑتے پھرتے تھے۔

بابو جیسے نئے نویلے غنڈوں سے لوگوں کی جان و مال اور عزت کا تحفظ پولیس کی اولین ذمہ داری ہے لیکن افسوس کہ انہی غنڈوں اور دہشت گردوں نے قانون کے ان محافظوں کو ایسی طوائف کے روپ میں ڈھال لیا تھا جیسے وہ جب چاہے اپنی انگلیوں پر نچا سکتے تھے۔ اسی لئے بابو اور اس جیسے کئی چھوٹے موٹے بدمعاش اس قدر بے خوف و خطر اور دن دھاڑے لوٹ کھسوٹ کی واردات کر جاتے تھے کہ ہزاروں آنکھیں محض بے بسی سے تماشہ دیکھتی رہ جاتیں۔

کوئی بھی پولیس والا بابو پر ہاتھ ڈالنا تو دور کی بات بابو کے خلاف رپورٹ تک لکھنے کو تیار نہیں ہوتا بلکہ لوگوں کی عزت و جان و مال کے یہ محافظ بابو کے خلاف بولنے والوں کی کسی بات پر کان ہی نہیں دھرتے اور نا ہی کبھی پولیس نے بابو کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھانے یا اسے تھانے میں بلا کر خبردار کرنے کی کوشش کی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ ہر گزر جانے والے دن کے ساتھ بے خوف، بے باک اور لوگوں بلکہ شریف لوگوں کے لئے ناقابل برداشت ہوتا چلا گیا۔

وہ جو چاہتا بہ آسانی کر گزرتا اسے روکنے ٹوکنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ کوئی ایک بھی نہیں۔ اب ایسی بات بھی نہیں تھی کہ بابو کی اپنی دہشت نے پولیس کے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ بابو پر ہاتھ نہ ڈالنے کی اصل وجہ خان بابا کی ہستی تھی۔

☆......☆......☆

خان بابا ایک بین الاقوامی مافیا تنظیم کا بے حد اہم کارکن تھا۔ وہ بڑے پیمانے پر منشیات کی اسمگلنگ کے علاوہ دہشت گردوں کو ملک میں آتشیں اسلحہ فراہم کرتا تھا اپنے علاقے میں وہ ایک بہت بڑا غنڈہ ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے نامور غنڈوں کا باپ بلکہ دادا کہلاتا تھا۔

خان بابا کا پورے شہر میں کوئی مقابل نہ تھا وہ جرم کی کالی دنیا کا بے تاج بادشاہ تھا۔

اس کی زیر نگرانی بابو جیسے کئی نوجوان غنڈہ گردی اور دہشت گردی کی تعلیم و تربیت پا رہے تھے۔ حالات و غربت کی چکی میں پسے ہوئے اپنوں کے ستائے ہوئے اور بے روزگاری کے ہنٹر کی مار سے بلبلائے ہوئے نوجوان خان بابا کے خاص شکار تھے۔ وہ ایسے نوجوانوں کی کمزوریاں پکڑ کر انہیں سہارا مہیا کر کے پھر ان سے اپنے حسب منشا کام لیا کرتا تھا اسے نوجوانوں کے بارے میں کہنا تھا۔

''یہ وہ نوجوان ہیں جو دولت کے حصول کی خاطر کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ کچھ بھی کر گزرتے ہیں۔ بڑے جی دار اور بہت ہمت والے ہوتے ہیں یہ جوان۔''

خان بابا میں لوگوں کو پہچاننے کی ایک قدرتی صلاحیت موجود تھی وہ پہلی ملاقات میں بندے کا چہرہ دیکھ کر۔ یا چند لمحوں تک اس کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال کر اس کی فطرت کے کسی خاص پہلو کی نشان دہی فرما دیا کرتا۔

جب بابو کے ایک دوست نے بابو کی شدید خواہش پر اسے خان بابا کے حضور پیش کیا تو اس سے چند لمحے باتیں کر کے ہی خان بابا نے بھانپ لیا کہ وہ ایک خود غرض اور مفاد پرست انسان ہے۔

''بے شک لڑکا بہادر اور مضبوط قوت ارادی کا مالک ہے لیکن بے حد خود غرض اور مفاد پرست بھی ہے اور انہی دو خامیوں نے اس کی عقل و سمجھ کو زنگ آلود کر رکھا ہے۔'' خان بابا نے اس کے خاص دوست اور اپنے بھروسے کے ایک لڑکے ''لٹو'' کو مخاطب کر کے کہا۔ نام تو اس لڑکے کا خدا جانے کیا تھا لیکن گینگ کے لوگ اس کی پھرتی اور چھوٹے قد کی وجہ سے اسے ''لٹو'' کہا کرتے تھے۔ دہشت گردی کی کوئی بھی واردات کر کے لوگوں کے ہجوم کے درمیان سے لٹو کی مانند برق رفتاری سے چکراتے ہوئے نکل جانا اس کی خاصیت تھی۔

''تو کیا میں اس کو یہ بول دوں کہ وہ ہمارے کام کا بندہ نہیں ہے۔'' خان بابا کی باتوں سے لٹو نے اپنی دانست میں یہی نتیجہ اخذ کیا۔

''ارے نہیں۔ نہیں ایسا غضب مت کرنا۔ بھرپور اور جسمانی لحاظ سے مضبوط نوجوانوں کو مایوس لوٹا دینا خان بابا کی عادت نہیں۔ ہمیں بابو پر ذرا محنت کرنی پڑے گی۔ اسے اپنے کام کا بندہ بنانے کے لئے تربیت دینی پڑے گی فی الحال اسے دکانداروں اور ٹھیلے والوں سے بھتہ وصولی کے کام پر لگا دو۔'' خان بابا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''اس کا جیب خرچ کتنا رکھے؟'' لٹو نے پوچھا۔ ''ڈیڑھ دو ہزار روپے روز دے دیا کرو۔'' خان بابا نے غیر دلچسپی سے جواب دیا لٹو اس کی بات پر اقرار میں گردن ہلاتے ہوئے جانے کے ارادے سے پلٹا ہی تھا کہ؟

''اور ہاں! ایک بات کا خاص خیال رکھنا۔''

خان بابا کی آواز پر لٹو اپنے پورے وجود کے ساتھ گھوم پڑا اور سوالیہ نگاہوں سے خان بابا کی جانب دیکھا جو ہاتھوں میں پکڑی ایک جدید طرز کی بندوق کو اپنے رومال کی مدد سے صاف کر کے چمکا رہا تھا۔

''اس لڑکے بابو پر کبھی کوئی بڑی ذمہ داری عائد نہیں کرنا۔ خاص طور پر لاکھوں روپوں کی کیش لین دین کا کوئی معاملہ کبھی اس کے ہاتھوں میں نہیں دینا۔'' خان بابا نے اتنا کہہ کر اپنے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کے لئے کہہ دیا اس لئے وہ بند لبوں کے پیچھے اور زبان پر مچلتے اس

سوال ”کیوں؟“ کو لفظوں میں ڈھال کر اپنی زبان سے ادا نہیں کر سکا اور ایک چبھن سی لئے پلٹ گیا۔ اس کے دماغ میں یہی سوچ چکراتی پھر رہی تھی کہ اگر خان بابا نے ایسا کہا ہے تو ضرور اس میں کوئی اہم بات پوشیدہ ہوگی کیونکہ خان بابا کی کوئی بات مصلحت سے خالی نہیں ہوا کرتی تھی۔

اور جب اس نے لٹو اور دو، تین اور لڑکوں کے ساتھ مل کر پہلی بار دکانداروں اور ٹھیلے والوں کو ڈرا دھمکا کر بھتہ وصول کیا تو دکانداروں اور ٹھیلے والوں کے چہروں پر دوڑ لگاتی دہشت اور ڈر سے ان کے تھر تھر کانپتے وجود کو دیکھ کر بابو کو اس قدر خوشی حاصل ہوئی کہ وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرنے لگا خود کو زمین کا ایسا خدا سمجھنے لگا جس کے آگے ہر شریف اور کمزور آدمی ہاتھ جوڑے اور سر جھکائے کھڑا تھا۔

”مزہ آیا۔“ لٹو نے بہت سارے نوٹ اور بے شمار سکے ایک چمڑے کے بیگ میں بھرتے ہوئے اس سے دریافت کیا جو اپنی چمکتی نگاہوں سے نوٹوں اور سکوں کو اس طرح ندیدوں کی طرح گھور رہا تھا جیسے کسی بھی لمحے وہ نوٹوں کے بیگ پر جھپٹ پڑے گا، اور بیگ لئے فرار ہو جائے گا۔

”ہاں! مجھے یہی کام کرنا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ جو بندہ جتنی دکانوں اور ٹھیلے مالکان سے بھتہ وصول کرے۔ بھتے کی وہ ساری رقم اسی بندے کی ملکیت قرار پائے۔“ بابو کی اس بات نے لٹو کے دماغ کو جھٹکا سا پہنچایا اسے خان بابا کے اس دن کہے الفاظوں کی آج سمجھ آئی۔

بے شک بابو جسمانی لحاظ سے بہت مضبوط اور پھرتیلا تھا لیکن اس کی فطرت حریصانہ تھی لاکھوں روپے تو کیا یہ بندہ محض ہزاروں روپوں کی خاطر اپنا ایمان بیچ سکتا تھا۔

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اس رقم کا تمام حساب خان بابا کے حضور پیش کرنا ہوتا ہے یہ لو خان بابا کی طرف سے تمہارا جیب خرچ......“

لٹو نے انہی نوٹوں میں سے دو ہزار روپے گن کر اس کی جانب مسکرا کر بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر دو ہزار گن کر اپنی جیب میں تو رکھ لئے لیکن لٹو نے دیکھا کہ چند گھنٹوں میں دو ہزار کمانے کی اس کے چہرے پر کوئی خوشی نہیں چھلک رہی تھی وہ اس طرح پر سوچ نگاہوں سے نوٹوں کے بیگ کی جانب تکے جا رہا تھا جیسے وہ راتوں رات دولت مند بننے کے سپنے دیکھ رہا ہو۔

”ان دو ہزار روپوں میں سے ایک ہزار اپنے باپ کے ہاتھ پر رکھ دینا خوش ہو جائے گا۔“ لٹو نے اسے اپنی دانست میں ایک دوستانہ مشورہ دیا جو سن کر اس نے اس قدر بری صورت بنالی جیسے اسے لٹو کا یہ مشورہ قطعی پسند نہ آیا ہو۔

”جس شخص کو میرا کھانا، پینا اور وجود بری طرح کھٹکتا ہو میں اسے ہزار روپے تو کیا ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں دینے والا۔ اس کے زہر میں بجھے طنز اور طعنے مجھے بھلائے نہیں بھولتے۔“ بابو نے جلے کٹے لہجے میں جواب دیا۔

”تو کیا ہوا یار؟ وہ تیرا باپ ہے۔ اپنی اولاد کو نہیں تو کیا وہ پڑوسی کی اولاد کو طعنے مارے گا۔“ لٹو نے ہنس کر کہا اور دو اور لڑکوں کو بھی ان کا جیب خرچ دے کر فارغ کیا۔

”میں نے اس کے ہاتھ، پاؤں جوڑ کر اس سے یہ التجا نہیں کی تھی کہ مجھے پیدا کرے۔ اس کی مستی میں اگر میں پیدا ہو گیا تو اس میں میرا کیا قصور؟ میری تین بہنیں بھی تو اس کی کمائی بیٹھ کر کھا رہی ہیں ان تینوں کو تو اس نے کبھی طعنے نہیں دیئے۔“ اس کی یہ بات سن کر لٹو زور سے ہنس پڑا۔

”ابے عقل سے پیدل کیا تیرا باپ اپنی بیٹیوں سے کہے گا کہ نوکریاں کرو اور پیسہ کما کر لاؤ خیر چھوڑ باپ کو نہیں دینا ہے تو مت دے اپنی

ماں بہنوں کے لئے کوئی چیز۔ کوئی تحفہ خرید کرلے جاوہ بے چاریاں؟'' اس سے پہلے کہ لٹو اپنی بات مکمل کر پاتا بابو اس کی پوری بات سنے بغیر وہاں سے نکل گیا۔

جب لٹو نے خان بابا کو ساری تفصیل بیان کی تو اس کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ نے آن کر بسیرا کرلیا۔

''بے شک لڑکا جسمانی لحاظ سے بہت مضبوط اور پھرتیلا سہی لیکن اس کی فطرت میں اپنوں کے لئے وفا نہیں ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ ہم سے بھی بے وفائی کرے گا لیکن بہر حال وہ ایک ایسا خطرناک زہریلا سانپ ہے جسے ہم لاکھ محبت وتوجہ دیں اور اپنے جگر کا تمام خون دودھ کی طرح اسے پلائیں موقعہ ملتے ہی وہ موذی اپنا تمام زہر ہماری رگوں میں اتار کر فرار ہو جائے گا۔ اس لئے میں پھر کہے دیتا ہوں کہ اس لڑکے پر بالکل اندھا اعتماد کبھی مت کرنا اور لاکھوں تو کیا ہزاروں روپے بھی اس کے بھروسے پر مت چھوڑنا۔'' خان بابا نے لٹو کو اس کی شخصیت کے کچھ اور خاص پہلو کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا۔

''یہ لڑکا بابو! اس قدر خود غرض اور مفاد پرست ہے کہ اپنے فائدے کے لئے وہ اپنے خونی رشتوں کو بھی دھوکا دے سکتا ہے۔ ان کے اعتماد کا بھی خون بہا سکتا ہے۔ بہر حال ہمارے لئے بے ضرر ہے بلکہ ایسی چیونٹی ہے جس نے کبھی بھی ہمیں کاٹنے کی کوشش کی تو ہم اسے اپنی دو انگلی سے پکڑ کر مسل ڈالیں گے۔'' خان بابا نے اپنی دو انگلیوں کو باہم رگڑتے ہوئے کہا۔

''اس کے لئے کوئی اور حکم۔'' لٹو نے دریافت کیا۔ ''ایسا کرو اسے ہفتے میں صرف دو بار جیب خرچ دیا کرو اور کبھی کبھی صرف پانچ سو روپے ہی دے کر اس کا منہ بند کر دیا کرو۔ بلی کے آگے ہر روز بہت سارے چھچھڑے پھینک دینا بھی دانش مندی نہیں۔'' خان بابا نے لٹو کو خاص ہدایت فرمائی۔

خان بابا کے گینگ میں شمولیت پاتے ہی بابو ایک دم سے شرافت کے خول سے باہر آن کودا حالانکہ اسے صرف بھتہ وصولی پر مقرر کیا گیا تھا لیکن اس نے خان بابا کے نام کا فائدہ اٹھا کر دہشت گردی بھی شروع کر دی اور ایک خنجر لے کر لوگوں کو لوٹنے اور ہراساں کرنے لگا۔

اسے بھتہ وصولی کے کام سے ہفتے میں ایک یا دو بار ملنے والے ہزار دو ہزار روپے اپنی روزمرہ کی ضروریات کے لئے ناکافی لگتے تھے حالانکہ وہ اپنی کمائی سے ایک روپیہ تک گھر میں خرچ نہیں کرتا تھا اور نا ہی ماں، بہنوں کے لئے کبھی کوئی چیز خرید کر انہیں پیش کرتا تھا لیکن پھر بھی پورے ہفتے میں ملنے والے ڈھائی تین ہزار سے اس کا گزارہ نہیں ہوتا تھا۔

اس کے تین ہی شوق تھے اچھے اور بڑے ہوٹلوں میں من پسند کھانے کھانا، جدید فیشن کے قیمتی ملبوسات و جوتے پہننا اور تندرست وتوانا رہنے کے لئے روزانہ صبح وشام ایک، ایک گھنٹہ ورزش کرنا یہی وجہ تھی کہ وہ ہر لمحہ چیتے کی مانند چاق وچوبند لگنے اور پھرتیلا رہتا تھا۔

بابو کے اکثر دوست لڑکیوں کے چکروں میں پھنسے خواری کی زندگی گزار رہے تھے۔ بابو کی شخصیت کی نمایاں خوبی ہی یہی تھی کہ بابو نے اپنے آپ کو شراب اور شباب جیسی موذی بیماریوں سے دور ہی رکھا تھا۔

''لڑکیوں سے دور رہنے کی کوئی تو وجہ ہوگی کیا لڑکیاں پسند نہیں ہیں یا کسی سنگ دل حسینہ نے میرے یار کے ساتھ محبت کا ڈرامہ رچا کر بے وفائی کرکے کسی اور کا دل وگھر آباد کرلیا ہے۔'' ایک دن موڈ میں آ کر لٹو نے اس سے دریافت کیا۔

''ایسی کوئی حسینہ اب تک ٹکرائی ہی نہیں جو میرے دل کے تاروں کو چھیڑ جائے۔ باقی شراب اور ہر طرف مکھیوں کی مانند بھنبھناتے شباب سے میں اس لئے دور رہتا ہوں کہ یہ وہ کینسر ہے جو بہت آہستہ آہستہ اور غیر محسوس طور پر رگوں میں پھیل کر مرد کو اس قدر گھلا کر رکھ دیتی ہے کہ مرد گندگی کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے اور ایک دن یہی گندگی اسے نگل لیتی ہے میں اسی لئے ان سے دور رہتا ہوں کہ میں کسی گندگی میں گرنا نہیں چاہتا۔'' بابو نے اپنے دل کی بات پہلی بار کسی کے سامنے بیان کی۔

''کیا مطلب؟ کیا تو اپنی ماں کی پسند سے شادی کرے گا؟'' لٹو نے دریافت کیا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ جب بھی شادی کروں گا کسی بہت حسین لڑکی کو ترجیح دوں گا کیونکہ کالی پیلی رنگت کی لڑکیاں میری نگاہوں کو چبھتی ہے۔'' بابو نے بہت بری صورت بنا کر کہا۔

بابو نے اپنے آپ سے یہ عہد کر رکھا تھا کہ وہ زندگی بھر شباب اور شراب (جو مفت میں ہاتھ لگے) کو ہاتھ نہیں لگائے گا تاکہ لمبی اور خوشحال زندگی کا بھرپور لطف حاصل کر سکے۔

اگر شیطان کو انسان کے کسی پختہ ارادے کا علم ہو جائے اور وہ اسے انسان کے ارادوں کی پختہ دیوار میں دراڑیں ڈالنے کی کوشش نہ کرے تو وہ شیطان ہی نہیں۔ بلکہ اس کے شیطان ہونے پر لعنت ہے یہی وجہ ہے کہ جب شیطان کی سماعتوں نے بابو کے یہ الفاظ سنے تو وہ ایک دم سے چوکنا ہو گیا۔ اس کے بھدے لبوں پر مکروہ مسکراہٹ آن ٹھہری اور اس نے بابو کو پھانسنے کے لئے اپنا جال بننا شروع کر دیا۔

شراب کی حد تک تو بابو اپنے عہد پر قائم رہا لیکن شباب کے معاملے میں بالآخر شیطان نے اس کے عہد کی دیوار پر ضربیں لگا کر دراڑیں ڈال کر ہی رکھ دیں۔ بابو جیسے اڑیل گھوڑے کو قابو میں کرنے کے لئے شیطان نے کوئی عام سا جال نہیں بچھایا بلکہ ایسا سنہرا اور خوبصورت جال پھینکا کہ بابو کسی بے بس پرندے کی مانند اس کے جال میں پھنس کر پھڑ پھڑاتا ہی رہ گیا۔

کوئی عام سی شکل وصورت رکھنے والی حسینہ بابو کا دل نہیں جیت سکتی تھی۔ اس لئے شیطان نے اس کے لئے لاکھوں ہیروں میں سے ایک ایسا ہیرا منتخب کر کے اس کے سامنے پیش کر دیا کہ وہ دم بخود سا رہ گیا۔

معصومہ کوئی عام شکل وصورت کی مالک لڑکی نہیں تھی بلکہ حسن کی جیتی جاگتی مورت تھی۔ صرف اس کا حسن ہی بے مثال نہیں تھا بلکہ جسمانی نشیب وفراز بھی۔ اس قدر قیامت خیز اور دلوں کو گرما کر رکھ دینے والے تھے کہ کسی زاہد کا ایمان بھی ڈگمگا کر رکھ دے۔

حسن کی اسی دیوی معصومہ نے ایک فاتح حکمراں کی طرح اس کے دل کی سلطنت پر ایسا قبضہ کیا کہ اس نے معصومہ کو اپنے سلطنت دل کی ملکہ بنانے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔

اس طرح اس کے عہد کی دیوار خود اس کی اپنی غفلت کے باعث اس پر آن گری۔

☆......☆......☆

''کچھ سنا تو نے بابو؟'' ایک دن بابو اپنے علاقے کے سستے ہوٹل میں بیٹھا کڑک چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ لٹو۔ اس طرح ہانپتے کانپتے اس کے سامنے رکھی ایک خالی کرسی پر آن ٹکا اور گہرے گہرے سانس لے کر اپنے دل کی بکھری دھڑکنوں کو اعتدال بخشنے لگا جیسے وہ میلوں دور سے بھاگتے ہوئے یہاں پہنچا ہو اس کے لبوں سے ادا ہونے والے الفاظ یہ بتا رہے تھے کہ وہ کہیں رونما ہونے والے کسی بہت بڑے حادثے کی خبر لایا ہو۔

''میرے لئے تو جیو نیوز تو ہی ہے۔ تو بتائے گا تو مجھے علم ہوگا نا؟'' بابو نے اپنی شہادت کی انگلی کی مدد سے چائے کے کپ کا کنارا صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اشرف کانے کو جانتے تو ہو نا؟'' لٹو نے سوال کیا بابو نے اقرار میں گردن ہلاتے ہوئے چائے سے بھرا کپ ہاتھ میں لے کر اس کی جانب وضاحت طلب نگاہوں سے دیکھا۔

''اس نے اپنا مکان گزشتہ ہفتے ایک ایسی عورت کو کرائے پر دیا ہے جس کے بارے میں وہاں کے قریبی رہنے والوں کا یہ کہنا ہے کہ وہ اچھے کردار کی مالک نہیں ہے۔ حالانکہ اس عورت سے پہلے وہاں ایک شریف کنبہ رہ رہا تھا اور کئی سالوں سے رہ رہا تھا لیکن سالے کانے کی اولاد نے ان کو زبردستی گھر خالی کروا کر اس عورت کو رہنے کے لئے دے دیا۔'' لٹو نے اسے تفصیل بیان کی۔

''کیا مطلب؟ اچھے کردار کی نہیں ہیں۔'' بابو نے گرم چائے کا سپ لینے کے بعد دریافت کیا۔

''قریبی گھروں میں رہنے والوں کا یہ کہنا ہے کہ اس سے ملنے کے لئے ہر رات نئی چمچماتی گاڑیوں میں کچھ مرد آتے ہیں۔ مرد مخصوص ہوتے ہیں اور ان کی آمد کا سلسلہ اس وقت شروع ہوتا ہے۔ جب محلے کے لوگوں کے سونے کا وقت ہوتا ہے اور پھر ناچ گانوں اور مرد و زن کے قہقہوں کی آوازیں صبح صادق تک سنائی دیتی ہیں۔'' لٹو نے وضاحت فرمائی۔

''اچھا......'' باتوں کے دوران بابو نے چائے کا آخری گھونٹ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے کہا۔

''مجھے میرے مخبر سے یہ بات پتہ چلی ہے کہ اس عورت کے ساتھ اس کا اپنا کوئی مرد نہیں رہتا ہے یعنی نا تو اس عورت کا کوئی باپ ہے۔ نا بھائی نا شوہر اور نا ہی بیٹا۔ وہ عورت صرف اپنی ایک جوان لڑکی کے ساتھ بالکل اکیلی رہتی ہے۔ اس بات کا صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ اس عورت نے نگر مچھوں سے دوستی بنا رکھی ہے تبھی تو بے خوف اور تنہا دریا میں رہ رہی ہے۔ ورنہ ہمارے معاشرے میں۔ یعنی مردوں کے معاشرے میں کوئی اکیلی عورت ایک جوان لڑکی کے ساتھ کسی کرائے کے مکان میں آکر رہ سکتی ہے؟ اور وہ بھی اسی صورت میں کہ اسے اپنے اردگرد رہنے والوں کے کردار کے بارے میں بھی کچھ علم نہ ہو۔'' لٹو کے لہجے کا جوش و خروش بابو کی سمجھ سے باہر تھا۔

''تیری تمام بات میں نے پوری توجہ اور اطمینان سے سنی اب تو مجھے یہ بتا کہ یہ سب تو نے مجھے کیوں آ کر بتایا ہے۔ محلے میں ایک اچھے کردار کی عورت، اوہ معاف کرنا۔ برے کردار کی عورت آن کر رہنے لگی ہے تو میں کیا کروں؟ میں عورتوں سے بھتہ وصول نہیں کر سکتا۔ مانتا ہوں کہ ایسی عورتیں منہ مانگا بھتہ دینے سے بھی پیچھے نہیں ہٹتیں لیکن میں۔'' بابو نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر نفی میں گردن ہلا دی۔

''بعض اوقات تو ایسی بات کر جاتا ہے کہ میں کئی گھنٹوں تک سوچتا رہ جاتا ہوں کہ عقل نام کی کسی چیز سے تیری دعا سلام ہے بھی یا نہیں؟ پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا ہے ہوں کہ تجھے چونکہ کسی مونث وجود سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس لئے ممکن ہے کہ عقل بھی تجھ سے دور دور ہی رہتی ہو۔'' لٹو کے جلے کٹے لہجے پر وہ خوش دلی سے ہنس پڑا لٹو خفا سا ہو کر بیٹھ گیا۔

''اچھا بتا مجھے کیا کرنا ہوگا......؟'' بابو نے اس کی ناراضگی کے خیال سے پوچھا۔

''ہم برے سہی۔ بدمعاش، غنڈے اور لٹیرے سہی لیکن اس علاقے میں ہمارے علاوہ ہزاروں شریف لوگ بھی بستے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے ہم خوشی وغم کے درجنوں مواقع پر اور تہواروں پر منہ مانگا چندہ وصول کرتے ہیں۔ ہم ان سے بھتہ بھی اس لئے بٹورتے ہیں کہ انہیں تحفظ فراہم کر سکیں اور انہیں محفوظ رکھنا ہماری ذمہ داری بنتی ہے وہ ماں، بیٹی سالیاں! ہمارے علاقے میں آن کر گندگی پھیلا رہی ہیں اور تو بولتا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟ میں تجھے صاف بتا دوں کہ وہ کمینی سالیاں غلط ہیں جو رات کی سیاہی پھیلتے ہی اپنے پر کھولنا شروع کر دیتی ہیں۔ اپنے گاہکوں کو آنے کے سگنل دیتی ہیں اور پھر اپنے دام میں پھنس جانے والوں کا اس وقت تک خون چوستی رہتی ہیں جب تک کہ ان کے شکار کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہو۔'' لٹو نے کہا۔

''ایسی عورتوں کا یہی تو کام ہوتا ہے۔ یہ ان کے کمائی کے طریقے ہیں ہم کیوں کسی کی روزی پر لات ماریں؟'' بابو بدستور مطمئن رہا وہ عورتوں کے معاملے میں پڑنے کا قائل نہ تھا اور اپنے طور پر عورتوں کے ہر جھگڑوں اور لفڑوں سے دور ہی رہنا بہتر سمجھتا تھا۔

''روزی کمانی ہے تو بازار حسن میں جا کر بیٹھ جائے شریفوں کے محلے میں کیا لینے آئی ہے؟ ذرا سوچ یار! کل کو ان بری عورتوں کے حسن و اداؤں کے جال میں ہماری ماں، بہنوں کے سہاگ بھی پھنس سکتے ہیں وہ بازاری عورتیں ہمارے بھائیوں، باپ اور خود ہمیں بھی اپنے دام میں پھانس سکتی ہے۔ علاقے کے تمام لوگ ان کے یہاں رہنے پر ناخوش اور خفا ہیں۔'' لٹو نے سب کا ترجمان بن کر کہا۔

''خفا کس سے ہے؟ تجھ سے......'' بابو نے اس چھوٹے سے قد والے کی بڑی سی غیرت کا مذاق بنایا۔

''میں اس وقت کامیڈی کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' لٹو کو اس کی غیر سنجیدگی سے چڑ آنے لگی۔

''یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے جو تو اس قدر سنجیدہ ہو رہا ہے۔ اشرف کانے کو بول کر انہیں وہاں سے چلتا کروا دے بات ختم۔'' بابو نے مسئلے کا آسان حل پیش کیا۔

''سب سے پہلی بات تو یہ کہ اشرف کانے کو دگنا کرایہ اور سال بھر کا کرایہ یکمشت ادا کر کے وہ اس لالچی خبیث کا منہ پہلے ہی بند کر چکی ہے اور دوسری اور اہم بات یہ ہے کہ وہ حرامی گھر پر ملتا ہی نہیں ہے خدا جانے وہ کب گھر آتا ہے اور کب گھر سے نکلتا ہے کچھ علم نہیں ہو پاتا؟ اپنے مخصوص اڈوں پر بھی نہیں مل رہا جانے سالے کو زمین کھا گئی ہے یا آسمان نے نگل لیا ہے ہاتھ آ کے نہیں دے رہا۔ ورنہ سب سے پہلے تو ایسے ہی پکڑ کر اس کی وہ خبر لیتے کہ زندگی بھی یاد رکھتا۔ مسئلہ صرف اپنے علاقے کے معصوم اور بھولے بھالے۔ مردوں کو ان ایڈز کی بیماریوں سے دور رکھنے کا نہیں ہے بلکہ علاقے میں رہنے والی اپنی شریف گھرانے کی بہن، بیٹیوں کی عزتوں کو بھی محفوظ رکھنے کا ہے۔ ایسی عورتیں شریف اور بھولی بھالی لڑکیوں کو

پھانسنے کی بھی اپنی سی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں۔ اور ایسی خبیث عورتوں سے دنیا کی نگاہوں سے بچ بچا کر جو شریف زادے ملنے آتے ہیں وہ باقی عورتوں کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ایسی عورتیں بہت شاطر ہوتی ہیں۔ بڑی خوبصورتی اور عیاری سے اپنا جال پھینک کر اس طرح شکار کو پھانستی ہیں کہ آخری وقت تک شکار کو علم نہیں ہو پاتا کہ وہ کس جال میں پھنس رہا ہے؟" لٹو کی اس بات پر بابو کئی لمحات تک اس کی صورت تکتا رہ گیا چھوٹے قد کا یہ کم عمر نوجوان اپنے اطراف بڑی کڑی نگاہ رکھتا تھا۔

"تیری باتیں سن کر ایسا لگتا ہے جیسے تو بھی کسی ایسی ہی زہریلی ناگن کا ڈسا ہوا ہے؟ کیونکہ اتنا خوف زدہ تو وہی انسان ہوتا ہے جس نے ایسی کسی خون چوسنے والی چڑیل کو دیکھا ہو۔ یا خود اس کا شکار بنا ہو؟ ہے نا یہی بات؟" بابو نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دریافت کیا۔

"ہاں! لیکن اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اس نے مجھے اس کیچڑ میں گرنے سے قبل بچا لیا اسی دن سے میں نے یہ قسم اٹھائی تھی کہ ایسی کسی گندگی کو میں اپنے علاقے میں برداشت نہیں کروں گا اور نا ہی اس دلدل میں کسی شریف گھرانے کی عزت کو گرنے دوں گا اور اس کام میں تجھے میرا پورا ساتھ دینا ہوگا۔" لٹو نے قدرے سنجیدگی سے کہا اس نے آنکھوں پر پلکیں جھکا کر اور اقرار میں گردن ہلاتے ہوئے اپنے ساتھ کا یقین دلایا۔

"مگر تجھے میری اس عادت کا بھی علم ہے کہ میں کسی کی باتوں میں آ کر۔ یا۔ سنی سنائی پر ایک دم سے جذبات میں آ کر کارروائی نہیں کیا کرتا۔" بابو نے غیر واضح بات کر کے لٹو کو حیران ہونے پر مجبور کر دیا۔

"پہلے میں ذاتی طور پر تیری باتوں کے سچ یا جھوٹ! ہونے کی تحقیقات کروں گا پھر کوئی مثبت قدم اٹھانے پر غور کروں گا۔ دھندہ کرنے والی عورتوں سے مجھے بھی شدید نفرت ہے لیکن پھر بھی بنا کسی ثبوت کہ ہم کسی پر۔ خاص طور پر کسی عورت ذات پر ایک دم سے ہاتھ نہیں ڈال سکتے ایسی عورتیں بھی قانون کو اپنے پرس میں رکھ کر نکلتی ہیں۔" بابو نے اسے سمجھایا۔

"ہاں یہ بات تو تیری دماغ کو لگتی ہے۔" لٹو نے کہا۔ "خان بابا کے علم میں یہ بات ہے؟" بابو نے اپنے دل کی تسلی کے لئے دریافت کیا وہ خان بابا کو خوش کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا وہ ہر حال میں خان بابا کا اعتماد حاصل کر کے اس کے بھروسے کا آدمی بننے کا خواہش مند تھا کیونکہ خان بابا ہی اسے وہ سیڑھیاں دکھائی دیتا تھا جس پر قدم رکھنے کے بعد وہ دولت کے آسمان کو چھو سکتا تھا۔

"توبہ کر یار! خان بابا سے تو غلطی سے بھی ان عورتوں کا ذکر نہیں کرنا۔ اگر خان بابا کو ذرا سی بھی ان عورتوں کے بارے میں کوئی سن گن مل گئی پھر تو سمجھو گئے کام سے۔" لٹو کی اس بات نے بابو کو خان بابا کی شخصیت کی ایک اور خوبی جاننے کا سنہرا موقعہ فراہم کیا۔

کیا مطلب؟ کیا خان بابا بھی؟" بابو نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ہاں! اپنا بگ باس بھی عورتوں کا بڑا رسیا ہے۔ اپنے استاد محترم نے گھاٹ گھاٹ کا پانی چکھا ہے گنے کو اس وقت تک چبائے جاتا ہے جب تک کہ اس میں رس کا ایک قطرہ بھی موجود ہو۔ مطلب یہ ہے کہ گنا اچھی طرح نچوڑ کر۔ مکمل طور پر چوس کر پھر پھینکتا ہے میری بات کا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟" لٹو نے شوخی سے اپنی ایک آنکھ دبا کر کہا بابو کو جانے کیوں مایوسی نے آن گھیرا۔

"اس لئے میرے بھائی! میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ کسی اور کے سامنے بھی ہمارے درمیان ہوئی ان باتوں کا ذکر مت کرنا۔ خان بابا کی

خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کوئی بھی خان بابا کو ان عورتوں کے بارے میں جا کر بتا دے گا۔ پھر وہ بندہ تو خان بابا سے پانچ، دس ہزار روپے کا انعام لے کر خوشی خوشی عیش کرتا پھرے گا۔ خان بابا ان عورتوں کی دہلیز پر دھرنا ڈال کر بیٹھ جائے گا اور جب تک ان عورتوں سے اس کا دل نہیں بھر جاتا وہ ان عورتوں کی جانب کسی اور کو دیکھنے تک کی اجازت نہیں دے گا۔" لٹو نے مزید وضاحت فرمائی۔

پانچ یا دس ہزار روپے بابو کی منزل نہیں تھے۔ اس لئے اس نے لٹو کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اتنا تو اسے بھی علم تھا کہ لٹو خان بابا کے بھروسے کا آدمی تھا اور پھر بابو نے چند راتیں اپنی پیاری نیند کی قربانی دے کر چوری چھپے تحقیقات کیں تو اسے لٹو کی باتوں کی صداقت پر یقین آ گیا۔

شب کے ایک بجتے ہی جب علاقے کے تمام تھکے ہارے مکین اپنے دن بھر کی تھکن اتارنے کے لئے اپنے، اپنے بستروں سے جا لپٹتے اور ان کے گھروں کی روشنیاں ایک، ایک کر کے بند ہونے لگتیں تو شریفوں کے گھروں کی روشنیاں بند ہوتے ہی اشرف کانا کے کرائے داروں کے مکان میں دن کا اجالا اتر آتا جہاں بقول لٹو کے جانم نامی ایک عورت اپنی جوان بیٹی کے ساتھ ان کی رہائش پذیر ہوئی تھی۔

اور پھر رات ڈیڑھ بجے کے بعد جب ہر گھر کے دروازے گھروں کے اندر سے بند کر دیئے جاتے۔ جانم اپنے مکان کا دروازہ کھول کر بے خوفی سے اندر جا بیٹھتی مکان کا دروازہ کھلنے کے آدھ گھنٹے بعد ہی نئی ماڈل کی چمچماتی ایک گاڑی اس کے دروازے پر آن کر رک جاتی۔ گاڑی کا دروازہ کھلتا اور ایک خوش لباس اور خوشحال شخص گاڑی سے برآمد ہوتا اور اپنے اطراف سے بے نیاز اور دیکھے جانے کے خوف سے قطعی عاری ایک شان سے گاڑی کا دروازہ لاک کر کے اس طرح بے دھڑک اور بنا اجازت کے مکان میں داخل ہو جاتا ہے جیسے اسے اچھی طرح اس بات کا علم ہو کہ مکان کا دروازہ اسی کے لئے بطور خاص کھلا چھوڑ دیا گیا ہو۔ مرد مکان میں داخل ہوتے ہی اپنے دست مبارک سے مکان کا دروازہ بند کرنے کا نیک فریضہ انجام دیتا ہوا مکان کے اندر کسی کمرے میں پہنچ کر غائب ہو کر یا بابو کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر رہ جاتا۔ پھر جانے کون کھڑکیوں پر پردے بھی گرا دیتا؟ پردہ گرتے ہی کھیل شروع ہو جاتا۔

پہلے کئی لمحات تک مرد و زن کی باتوں اور ہنسی قہقہوں کی آوازیں سنائی دیتی پھر طبلے اور دیگر ساز بجنے لگتے اور انہی سازوں کے درمیان گھنگرو کی چھن چھنا چھن اور نسوانی آواز میں گانے کی آوازیں گونجنے لگتیں۔ ناچ اور گانے کی سریلی نسوانی آواز کے درمیان ایک مرد کی بھاری بھرکم آواز میں " ستائش بھری۔" واہ واہ۔" بھی وقفے وقفے سے سنائی دیتی رہتی۔

پورے ہفتے کی تحقیقات کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ اشرف کانے کی یہ نئے کرایہ دار جو صرف دو خواتین تھیں قطعی کوئی شریف زادیاں نہیں تھیں اور ان سے ملنے، ان کا گانا سننے اور ان کے رقص سے اپنا دل بہلانے کے لئے تین دولت مند ہستیاں اپنی قیمتی گاڑیوں میں بیٹھ کر جانے کہاں سے تشریف فرما ہوتی تھیں؟ تینوں دولت مند ہستیاں کبھی اکٹھے وارد نہیں ہوتی تھیں۔ ہر دو دن کے وقفے سے ایک ہستی کی آمد ہوا کرتی۔ رقص و موسیقی کے یہ دلدادہ حضرت صبح صادق تک مکان میں بند رہتے اور صبح اس حالت میں برآمد ہوتے کہ انہیں اپنے پیروں پر ٹک کر کھڑے رہنا بھی مشکل لگتا۔ نشے میں دھت، لڑکھڑاتے ہوئے وہ بمشکل تمام اپنی گاڑی کا لاک کھول کر گاڑی چلاتے ہوئے اپنے گھروں کی راہ ہو لیتے۔

یہ سب دیکھ کر غصے وغضب کی شدت سے بابو کا پورا وجود کانپ کر رہ گیا۔ اس کا خون جیسے کھول اٹھا اس کی راتوں کی نیند اور دن کا آرام

جیسے ایک خواب بن کر رہ گیا۔ یہ سوچ سوچ کر اس کا دماغ جلتا رہا کہ شراب اور شباب کے ساتھ ساتھ بے حیائی اور بے شرمی نے اس کے علاقے کا رخ کر لیا تھا اور یہ سب اس کی ناک کے نیچے انجام پا رہا تھا۔ اس نے بہت سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر اس نے برائی کے ان بیجوں کو پھوٹنے اور اپنا قد بڑھانے سے پہلے زمین سے نوچ کر نہیں پھینکا تو برائی کی یہ آکاس بیل پھیلتے پھیلتے اس قدر پھیل کر رہ جائے گی کہ ہر گھر اس کی لپیٹ میں آ کر تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا۔ یہاں کسی شریف گھر کی عزت محفوظ نہ رہے گی۔

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں ان بیماریوں کو اپنے علاقے میں اب ایک دن بھی مزید رہنے نہیں دوں گا۔ سب سے پہلے ان کے شکاروں پر اپنے ہاتھ صاف کریں گے۔ پھر میں خود ان حرافاؤں سے جا کر بات کروں گا۔'' بابو نے اپنے فیصلے سے لٹو کو آگاہ کیا۔

''شکاروں پر ہاتھ صاف کرنے کو گولی مار۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی اونچی ہستی نکل آئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے اور اگر خان بابا تک بات پہنچ گئی تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ اصل برائی کی جڑ وہ عورتیں ہیں ہمیں بس برائی کی ان جڑوں کو اکھاڑ کر پھینکنا ہے۔ جڑوں کو پانی دینے والے اپنا آپ راستہ بدل لیں گے۔'' لٹو نے اسے سمجھایا اس کی یہ بات بابو کے دل پر لگی اور اس نے صرف ان عورتوں سے بات کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ وہ پہلے ان عورتوں کو محض زبانی کلامی سمجھائے گا اور انہیں یہ محلہ چھوڑ کر جانے کے لئے کہے گا اگر وہ پیار کی زبان سمجھ جاتی ہیں تو ٹھیک ہے بصورت دیگر اسے انگلی ٹیڑھی کرنا بھی آتا تھا۔

ایک دن صبح ہی صبح وہ جانم کے مکان کے بند دروازے پر جا کھڑا ہوا چند لمحوں تک بند دروازے کو وہ اس طرح نفرت سے گھورتا رہا جیسے اس کے سامنے جانم کھڑی ہو اگلے ہی لمحے اس نے اپنے پورے جسم کی طاقت اپنے سیدھے ہاتھ کے مکے میں منتقل کی اور مکان کے بند دروازے پر ہتھوڑے کی مانند برسانا شروع کر دیا۔ اس نے ایک یا دو مکے برسانے پر قناعت نہ فرمائی بلکہ ایک تسلسل سے مکے برساتا ہی رہا۔ لکڑی کا بنا مضبوط دروازہ بھی اس کے فولادی مکے اپنے سینے پر روکنے کی کوشش میں اپنے پورے وجود کے ساتھ اس طرح ہل کر رہ جاتا تھا جیسے چوکھٹ سمیت اندر کی جانب گر پڑے گا۔

بابو جانتا تھا کہ پوری رات کیف و سرور کے مزے لوٹ کر سونے والی یہ عورتیں دن چڑھے تک ایسی گہری نیند کے سمندر میں غرق رہتیں ہیں جیسے ان کے سروں پر موت کی دیوی بیٹھی انہیں تھپک تھپک کر موت کی سی نیند سونے پر مجبور کیے دے رہی ہو اور اسی غفلت کی نیند میں ڈوبی اس قسم کی عورتوں کو جلا تا مردوں کو جگانے کی کوشش کرنے برابر ایک ناممکن سی بات تھی لیکن بابو ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھا اس نے اس وقت تک اپنی کوشش جاری رکھی جب تک کہ اس کی سماعتوں سے ایک مترنم سی لیکن جھنجھناتی ہوئی نسوانی آواز نہیں آن ٹکرائی۔

''کون ہے بھئی؟'' نیند کے خمار میں ڈوبی ہوئی ایک بے حد دلکش آواز! جسے سنتے ہی بابو کے ہاتھ از خود ٹھہر کر رہ گئے۔

''دروازہ کھول۔'' بابو سانپ کی مانند پھنکارا اگلے ہی لمحے اندر سے دروازے کی کنڈی کھلنے کی آواز ابھری اور دروازہ ایک دم سے کھول دیا گیا۔

دروازے کا کھلنا غضب ہو گیا دروازے کی خلا میں کھڑی ہستی کے بے مثال حسن کی چکا چوند نے بابو کی آنکھیں خیرہ کر کے رکھ دیں وہ

گوشت پوست کا مجسمہ بنا اس طرح بنا پلک جھپکے اس حسن کی دیوی کو دیکھتا رہ گیا جیسے کسی ساحر نے اسے اپنے کسی سحر سے پتھر کے مجسمے میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہو اور وہ ساحرہ کوئی اور نہیں سامنے کھڑی حسینہ عالم تھی اور اس کا بے مثال حسن ہی ایسا سحر تھا جس نے بابو کا سارا غصہ اور نفرت فضا میں کہیں تحلیل سا کر کے رکھ دیا تھا۔

آج سے پہلے ایسا بے مثال حسن اس نے کب دیکھا تھا؟ اس کے خرمن حیات پر بجلیاں سی گر پڑیں بلکہ اس حسینہ کا بے مثال حسن ہی ایسی بجلی کی مانند تھا جسے چھو کر دیکھنا تو درکنار نگاہوں سے بھی اگر جی بھر کر دیکھ لیا جائے تو بندہ جل کر خاکستر ہو جائے اور اس کے ایک ہی جلوے نے بابو کو سر تا پا جلا کر راکھ بنا دیا تھا بے مثال حسن کی وہ مورت آنکھوں کے راستے سیدھا اس کے دل کے مندر میں گھستی چلی گئی اور ایک دیوی کی مانند اس کے دل کے برسوں سے خالی سنگھاسن پر ایک شان بے نیازی سے جا کر براجمان ہو گئی۔

بابو کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس نے بچپن میں اپنی ماں کی زبانی جس بے مثال حسن کی مالک ایک شہزادی کی ڈھیروں کہانیاں سن رکھی تھی اور جسے ایک نظر دیکھنے اور پانے کی تمنا بابو نے اپنے دل کے کسی کونے میں نہاں رکھی ہوئی تھی۔ اس لمحے اس کی نگاہیں اسی حسین شہزادی کو اپنے سامنے دیکھ رہی ہو۔ وہ صرف حسین ہی نہیں حسن کی پوری کائنات تھی وہ حسن کا ایک مکمل اور جامع تعارف تھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے مصور کائنات نے دنیا کی ہر خوبصورت چیز سے تھوڑی تھوڑی خوبصورتی مستعار لے کر اس حسن کی مورت کو تخلیق فرمایا تھا۔

شفاف و بے داغ رنگت میں گلاب کا گلابی پن اور دودھ کی سفیدی کو باہم اس خوبصورتی سے گھولا گیا تھا کہ وہ کسی جنت کی حور کا تصور دکھائی دیتی تھی اسی لئے تو وہ قطعی بے حس و حرکت کھڑا اپنی غیر متحرک نگاہوں سے ایسے بنا پلکیں جھپکائے اسے گھورتا ہی رہ گیا اس کے دل کی دھڑکنیں پیار کے مدھر سروں کا راگ الاپ رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے اور بہت میٹھے سروں میں

دیکھے کئی چہرے جہاں میں مگر

اک تیرے ہی چہرے پر پیار آیا

''کون ہے؟'' لڑکی کے عقب سے ایک اور نسوانی وجود نمودار ہوا۔ اس دوسرے نسوانی وجود کی بھی آواز بے حد سریلی اور شہد آگیں تھیں لیکن پھر بھی اس نسوانی آواز نے بابو کی محویت کو توڑ کر رکھ دیا۔

''معلوم نہیں کون ہے؟ پچاس بار پوچھ چکی ہوں کہ کیا کام ہے؟ کس سے ملنا ہے؟ کون ہے؟ لیکن کوئی جواب نہیں! بس بت سا بنا کھڑا ہے اور دیدے پھاڑے گھورے چلا جا رہا ہے۔ خدا جانے گونگا بہرہ ہے یا؟''

لڑکی نے بیزاری سے اپنے عقب میں کھڑی خاتون کو جواب دیا۔

خاتون لڑکی کے عقب سے نکل کر اس کے اور بابو کے درمیان آن کھڑی ہوئی اور سر تا پاؤں بابو کا جائزہ لیا۔ پیروں میں قیمتی جوتے، بدن پر جدید انداز کا قیمتی اور خوبصورت شلوار قمیض، لباس سے اٹھتی ایک قیمتی پرفیوم کی مہک، مضبوط تن و توش کا مالک ایک پرکشش جوان۔

''تم اندر جاؤ میں بات کرتی ہوں۔'' عورت نے حسن کی دیوی کو مخاطب کر کے کہا حسن کی دیوی نے بھی جانے سے قبل بابو کے پورے

وجود کا جائزہ لیا اور لبوں پر دلکش تبسم سجائے جانے کے ارادے سے پلٹ گئی اس کی حسین جھیل جیسی نیلی اور گہری آنکھوں میں بابو کی ہستی کے لئے پسندیدگی کے سائے لہرا رہے تھے اس حسن کی دیوی کے مکان کے اندرونی حصے میں غائب ہوتے ہی بابو کے اندر عجیب سی بے چینی گردش کر گئی جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکا۔

''کون ہو تم بیٹا؟ اور تمہیں کس سے ملنا ہے؟'' عورت نے دلکش تبسم لبوں پر سجا کر اس قدر محبت اور اپنائیت سے دریافت کیا کہ بابو اپنی دروازہ پیٹنے والی بدتمیزی یاد کر کے شرمندہ سا ہو کر رہ گیا۔

بابو کا یہ خیال تھا کہ جس بے ادبی و بدتمیزی سے اس نے ان کے مکان کا دروازہ پیٹ کر ان کی گہری نیند میں خلل پیدا کیا تھا اس بات کو لے کر کسی بھی بندے کی ہٹ سکتی تھی اور وہ اس بدتمیزی پر بابو کو ٹھیک ٹھاک ذلیل بھی کر سکتا تھا لیکن اس کے باوجود بابو نے نا تو اس عورت کی شفاف پیشانی پر ناگواری و بے زاری کی سلوٹیں ابھرتی ہوئی دیکھیں اور نا ہی اس کے بولنے کے انداز میں ایسی کوئی بات تھی اس کے برعکس وہ اس قدر محبت و اپنائیت بھرے لہجے میں سوال کر رہی تھی جیسے اس نے بابو کی بدتمیزی کو کوئی اہمیت ہی نہ دی ہو۔

بابو نے اپنے سامنے کھڑی با اخلاق عورت کا سرتا پاؤں بغور جائزہ لیا۔

وہ چالیس، بیالیس سال کی ایک بے حد پرکشش خاتون تھی اس کے حسین چہرے پر دوڑتی تازگی اور سرخی اسے اپنی عمر سے دس، بارہ سال کم ظاہر کر رہی تھی۔ اس عمر میں بھی اس کا جسم چارپائی کی رسیوں کی مانند کسا ہوا اور شباب سے بھرپور تھا۔ خصوصاً اس کے جسم کے نشیب و فراز تو گویا بولتے ہوئے محسوس ہوتے تھے اور جوان کی آواز سن لے، ان کی زبان سے آشنا ہو جائے اس کے وجود میں ایک آگ سی بھڑک اٹھتی تھی۔ سونے پر سہاگہ! اس خاتون نے شب خوابی کا ایسا بارک لباس زیبِ تن کر رکھا تھا جس نے اس کے شباب کو ایک قیامت بنا کر رکھ دیا تھا بابو کو اس عورت کے حسین چہرے میں اسی بے مثال حسن کی مالک لڑکی کی شباہت محسوس ہو رہی تھی جس کے ایک ہی دیدار نے بابو کے دل کو بے قراریاں سی سونپ دی تھی۔

''سنا ہے تو۔ تو یہاں دھندہ کرتی ہے؟'' بابو نے اپنے دل و دماغ کو ان کے رعب حسن سے آزاد کرتے ہوئے اپنے لہجے کو مضبوط کر کے دریافت کیا لیکن اپنے لہجے کا کھوکھلا پن وہ خود بھی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ حسین عورت کے لبوں پر سجی دلفریب مسکراہٹ میں مزید گہرائی آن سمائی اس نے بابو کے پرکشش چہرے پر اپنی نگاہوں کی دوربین فٹ سی کر دی۔

''یہ۔ یہ شریفوں کا محلّہ ہے۔ یہاں سب بہن، بیٹیوں والے شریف رہتے ہیں۔ یہاں یہ سب نہیں چلے گا۔ تجھے اگر اس محلے میں رہنا ہے تو اپنا یہ دھندہ چھوڑنا ہوگا۔ دوسری صورت میں تجھے دو دن کے اندر اپنا بستر بوریا باندھ کر اس علاقے سے جانا ہوگا۔ یہ سارا بابو کا علاقہ ہے اور بابو اپنے علاقے میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا ہے۔'' یہ بابو نے اپنے دل پر صرف پتھر ہی نہیں بھاری بھرکم سل رکھ کر یہ الفاظ ادا کیے حالانکہ اس حسن کی دیوی کا دیدار کرنے کے بعد دل تو اب بابو کا بھی یہی چاہ رہا تھا کہ حسن کی یہ مورتی اب اس کے علاقے کو چھوڑ کر کہیں نہ جائے اور تاعمر اس کی نظروں کے سامنے رہے تاکہ وہ اپنی پیاسی نگاہوں کی پیاس بجھاتا رہے کتنے برسوں بعد اس کی نگاہوں کو کوئی چہرہ بھایا تھا۔

''تو تمہارا نام بابو ہے؟'' عورت نے مسکرا کر سوال کیا بابو نے اسے گھورتے ہوئے اقرار میں گردن ہلا کر اس کی بات کا جواب دیا۔

''باہر کھڑے کھڑے ہی ساری باتیں کرلو گے کیا اندر نہیں آ ؤ گے بابو؟'' عورت نے کچھ اس محبت واپنائیت سے اس کا نام لیا کہ بابو کو خود اپنا نام بہت نیا نیا اور اچھا لگنے لگا۔

''نہیں! میں نے جو کہا ہے اس پر غور کرنا اگر دو دن کے اندر تو نے یہ سب بند نہیں کیا تو؟'' بابو نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

''تو؟'' عورت کی حسین آنکھوں سے شوخی کے رنگ چھلکنے لگے بابو بنا کچھ کہے جانے کے لئے پلٹ گیا۔

''میں نے انہیں خبردار کر دیا ہے۔ دیکھو؟'' بابو نے لٹو کو مطمئن کیا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ اس حسین عورت نے اس کی باتوں یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ اس کی دھمکیوں کا کوئی اثر نہیں لیا۔ اسی رات بابو نے ان کے مکان کے دروازے کے سامنے پھر ایک مخصوص گاڑی کو موجود پایا اور دوسری رات بھی یہی تماشہ حسب معمول دہرایا گیا تو بابو کا دماغ کھول اٹھا اور وہ ایک بار پھر صبح ہی صبح ان کے مکان کی جانب بڑھا یہ دیکھ کر اسے بے حد حیرت سی ہوئی کہ مکان کا دروازہ اسے خوش آمدید کہنے کے لئے پہلے ہی سے کھلا پڑا تھا تاہم وہ بے دھڑک مکان میں داخل نہیں ہو گیا اور مکان سے باہر کھڑے رہ کر قدرے بہتر انداز سے دروازہ بجایا۔

''دروازہ تمہارے کے لئے ہی کھلا چھوڑا گیا ہے۔ اندر تشریف لے آ ؤ بابو۔'' اسی حسین عورت کی آواز سنائی دی بابو لمحے بھر کے لئے ٹھٹک کر رہ گیا لیکن اگلے ہی لمحے اس کا سیدھا پاؤں اٹھا اور دروازے کے چوکھٹ پر سے گزرتا ہوا مکان کے اندر داخل ہو گیا۔

حالانکہ وہ مکان کے اندر جا کر بات کرنے کے حق میں نہیں تھا لیکن اس عورت کی پکار اور میٹھی آواز میں جانے کیا خاص بات تھی کہ وہ ذرا سی ہچکچاہٹ کے بعد دروازے کی چوکھٹ عبور کرتا اندر داخل ہو گیا بظاہر اس کے قدموں نے ان حسین عورتوں کے مکان کی دہلیز عبور کی تھی لیکن درحقیقت اس نے شیطان کے بچھائے گئے سنہرے جال میں پھنسنے کے لئے اپنے قدم بڑھا کر اپنی بدنصیبی کے دروازے پر دستک دی تھی۔

مکان میں داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ بڑے صحن کے وسط میں گول قالین بچھا ہوا تھا قالین کے اردگرد گاؤ تکیوں پر نفاست سے سجے موسیقی کے بڑے بڑے آلات رکھے گئے تھے۔ دائرے کے اطراف رقص وموسیقی کے شائقین کے بیٹھنے کا انتظام بھی قیمتی قالین بچھا کر اور گاؤ تکیے رکھ کر کیا گیا تھا ہر طرف گلاب وموتیا کی بکھری ہوئی پتیاں بتا رہی تھیں کہ گزشتہ رات یہاں کیا ہوتا رہا ہے؟

''کمرے میں آ جاؤ۔'' ایک بار پھر نسوانی آواز ابھری۔ بابو نے دیکھا کہ صحن دائیں بائیں سمتوں میں دو کمرے واقع تھے۔ ایک کمرے کا دروازہ بند تھا اور دوسرے کمرے کے دروازے کی خلا پر ایک پردہ تنا ہوا تھا اس نے پردے والے کمرے کی جانب قدم بڑھا لئے اور لمحے بھر سوچنے کے بعد پردہ اٹھا کر بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی اس کی پہلی نظر صوفے پر ایک شان سے براجمان اسی حسن کی دیوی پر جا ٹھہری جس نے بابو کے دل کی دنیا میں کہرام سا برپا کر ڈالا تھا جس کے ایک دیدار نے وہ کارنامہ سرانجام دے ڈالا تھا جو آج تک کوئی حسینہ اپنی ہر ممکن کوشش کے باوجود انجام نہ دے سکی تھی یعنی بابو جیسے پتھر دل کو محبت کے جذبے سے آشنا کرنے کا کارنامہ۔

''بیٹھ جاؤ۔ گھبرانے یا شرمانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔'' عورت کی آواز نے اس کی توجہ منقسم فرما کر اسے لڑکی کی نگاہوں کے سامنے

بیٹھی عورت کی جانب دیکھنے پر مجبور کیا۔ وہ ایک خالی صوفے پر جا بیٹھا۔ دل تو اس کا یہی چاہ رہا تھا کہ وہ اس حسن کی دیوی گھورتا رہے اور اپنی پیاسی نگاہوں کی پیاس بجھاتا رہے لیکن اس نے ایک بار پھر اپنے دل پر جبر کیا اور دانستہ لڑکی کی جانب دیکھنے سے گریز کرنے لگا۔

''میں نے کہا تھا کہ مجھے اپنے علاقے میں......''

اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کر پاتا ایک دم سے عورت درمیان میں بول پڑی۔

''مجھے لگتا ہے کہ تم ناشتہ بھی کر کے نہیں آئے ہو ایک منٹ میں ابھی آئی۔'' یہ کہتی ہوئی وہ عورت ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی اور تیر کی مانند سنساتی ہوئی کمرے سے نکل گئی یہ سب کچھ اس قدر برق رفتاری سے ہوا کہ بابو کو اسے روکنے کا موقعہ ہی نہ مل سکا بلکہ وہ اپنے لبوں کو متحرک تک کر نہیں پایا۔

حسین عورت کے جاتے ہی کمرے میں بابو اور وہ حسن کی مورت بالکل اکیلے رہ گئے بابو کا دل ایک دم سے پوری شدت سے دھڑکنے لگا اور کمرے میں اے سی آن ہونے کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ اس کا حلق خشک ہو کر رہ گیا اس نے دھڑکتے دل سے جھکی ہوئی گردن اٹھا کر حسن کی دیوی کی جانب دیکھا اور یہ دیکھ کر اسے جانے کیوں مایوسی سی ہوئی کہ وہ حسن کی دیوی اس کے جذبات سے قطعی انجان بنی بیٹھی ایک سالے کی ورق گردانی میں مصروف تھی اور اس سے پہلے کہ تنہائی کا فائدہ اٹھا کر بابو اسے مخاطب کرنے کی ہمت اپنے اندر پیدا کر پاتا اس نے بے زاری سے رسالہ بند کر کے قریبی میز پر پٹخنے والے انداز سے رکھا اور اٹھکر ہوا کے خوشگوار جھونکے کی مانند اسے سرور سا بخشتی اس کے قریب سے گزر کر کمرے سے نکل گئی۔

بابو ایک دم سے جیسے بجھ کر رہ گیا اور اس سے پہلے کہ بابو کچھ کرنے یا اٹھ کر جانے کے بارے میں غور فرماتا پردہ ہٹاتی وہی حسین عورت دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی لیکن وہ خالی ہاتھ نہیں تھی بلکہ پرتکلف ناشتے کے لوازمات سے سجی ہوئی ٹرالی دھکیلتی اس کے سامنے والے صوفے پر آن بیٹھی۔

''پہلے ناشتہ کر لو۔ پیٹ میں اناج جانے سے بات سمجھنے اور سمجھانے میں آسانی رہتی ہے تم نے یہ بات تو سن رکھی ہوگی کہ خالی پیٹ میں شیطان بولتا ہے اور شیطان کبھی اچھی بات نہیں کرتا۔''

باتوں کے دوران اس نے ٹرالی سے ناشتے کے لوازمات اٹھا کر میز پر سجا دیے اور میز سرکا کر بابو کے قریب کر دی۔

''بسم اللہ کرو۔'' اس عورت کے محبت بھرے لہجے اور ممتا جیسی اپنائیت نے بابو کی ساری غنڈہ گردی لمحوں میں بھلا کر رکھ دی۔

''مم مجھے بھوک نہیں ہے۔'' اس نے اپنے آپ کو ایک بار پھر مضبوط کرنے کی کوشش کی خدا جانے کیا بات تھی کہ وہ اپنے آپ کو اس عورت کے سامنے ٹوٹتا ہوا بہت کمزور ہوتا محسوس کر رہا تھا اور ایسی عورتوں کے سامنے وہ کمزور پڑنے کے حق میں نہیں تھا۔

''جھوٹ! میں جانتی ہوں کہ تمہیں بہت بھوک ستا رہی ہے اور ویسے بھی سامنے رکھے رزق کو ٹھکرانا کفران نعمت ہے۔ اب میں انکار قطعی نہیں سنوں گی۔'' بالآخر حسین عورت کے بے حد اصرار اور محبت کے سامنے وہ ہتھیار پھینکنے پر مجبور ہو گیا اور مزید کسی تعرض کے ناشتے پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔

حسین عورت کے حسین لبوں پر فاتحانہ تبسم رقص کرنے لگا وہ حسین نگاہیں بابو کے چہرے پر مرکوز کئے کچھ سوچتی رہی۔ بابو بظاہر اس کی ہستی کو نظر انداز کئے ناشتے پر ہاتھ صاف کرنے میں مگن رہا لیکن درحقیقت وہ اس حسین عورت کی آنچ دیتی نظروں کی تپش اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔

''میرا نام جانم ہے۔تم اگر چاہو تو مجھے آنٹی بھی کہہ سکتے ہو۔ ویسے ہر عمر کے لوگ مجھے میرے نام ہی سے بلاتے ہیں اور مجھے قطعی یہ بات بری نہیں لگتی کہ مجھ سے چھوٹی عمر کے لوگ مجھے جانم کیوں کہتے ہیں؟'' جانم نے اسے ناشتے سے فارغ ہوتے دیکھ کر گفتگو کا آغاز کیا بابو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''ہاں! اب اطمینان سے کہو جو کہنے آئے تھے۔'' جانم کے لہجے میں بدستور محبت کی مٹھاس ٹپک رہی تھی۔

''مجھے اطلاع ملی ہے کہ آپ ایک دھندہ کرنے والی عورت ہیں؟'' بابو نے نئے سرے سے اس طرح بات کا آغاز کیا جیسے اپنی اطلاع کی تصدیق چاہ رہا ہو اس کے لب و لہجے اور لفظوں میں بھی ادب و آداب کا عنصر از خود شامل ہو کر رہ گیا۔

''ہاں! تمہیں جو اطلاع پہنچائی گئی ہے وہ بالکل درست ہے۔'' جانم نے قدرے پرسکون لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا وہ لمحے بھر کے لئے سٹپٹا کر رہ گیا۔

''میں واقعی ایک دھندہ کرنے والی عورت ہوں ناچنا اور گانا میرا پیشہ بھی ہے اور میری روزی روٹی بھی۔'' جانم نے مزید وضاحت فرمائی۔

جانم کا پرسکون لب و لہجہ اور بے خوفی سے اپنے ذلیل پیشے کا اعتراف بابو کو حیرت کے سمندر میں ڈبکیاں لگانے پر مجبور کر گیا اس کا خیال تھا کہ جانم اس کی بات کو جھٹلا دے گی یا جھوٹ کا پلندہ قرار دے کر مگر مچھ کے آنسو بہاتے ہوئے اپنے نیک و پارسا ہونے کا ثبوت پیش کرے گی لیکن بابو کے خیال کو اس وقت مات ہوئی جب جانم نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا اور نا ہی کیا بلکہ اس نے یہ جاننے کے باوجود کے بابو ایک غنڈہ ہے اور اس کا دھندہ بند کروانے میں دلچسپی رکھتا ہے اس نے قطعی جھوٹ کا سہارا نہیں لیا اور بلا جھجک یہ تسلیم کر لیا کہ وہ ایک دھندہ کرنے والی عورت ہے۔

''یہ۔شریفوں کا محلہ ہے اور یہاں رہنے والے یہ چاہتے ہیں کہ؟'' اس سے پہلے کہ بابو اپنی بات مکمل کر پاتا ایک بار پھر جانم درمیان میں بول پڑی۔

''جانتی ہوں کہ یہاں رہنے والے کیا چاہتے ہیں لیکن کیا تم میری اس بات پر یقین کرو گے کہ کئی برس گزر چکے ہیں میں جسم فروشی کا دھندہ ترک کر چکی ہوں کلاسیکل رقص میں مہارت اور اچھی آواز ہونے کی وجہ سے ناچ گانے کا دامن اب تک تھام رکھا ہے۔رقص و آواز کے کچھ سچے اور پرانے قدردان آج بھی کھینچے چلے آتے ہیں ان کا دل توڑنا اچھا نہیں لگتا۔اس لئے رات میں دو چار گھنٹوں کے لئے رقص و نغمے کی محفل سجا کر چند روپے کما لیتی ہوں تو کیا برا کرتی ہوں؟'' جانم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''لیکن رات ہی کے وقت کیوں؟ اگر آپ کے دل میں کوئی کھوٹ نہیں ہے تو آپ دن کے وقت بھی اپنا یہ کام انجام دے سکتی ہیں؟'' بابو نے کہا۔

''تم خود سوچو جب یہاں رہنے والے تنگ دل و تنگ نظر لوگ رات کی خاموشی میں مجھے یہ کام کرتے دیکھ کر برداشت نہیں کر پا رہے تو دن

کے اجالے میں میرے مکان کے اندر سے اٹھتی ناچ گانوں کی آوازسن کر خاموش رہ لیں گے؟ نہیں! میرے مکان پر پتھروں کی بارش شروع ہوجائے گی اور دیواروں پر میری شان میں نازیبا کلمات تحریر کردیے جائیں گے۔ عورتیں اور بوڑھے مجھے گالیوں سے نوازیں گے اور میرا گھر سے باہر نکلنا دوبھر کر کے رکھ دیں گے۔" جانم نے ایک ادا سے اپنے دونوں کانوں کو اس طرح چھوتے ہوئے کہا جیسے شریفوں کو ان کی ہستی سے نہیں بلکہ انہیں شریفوں کی شرافت سے خطرہ لاحق ہو۔

اور بابو کے خیال میں اس کا یہ ڈر وخوف اپنی جگہ بالکل درست تھا کیونکہ وہ اکیلی عورت کس کس کے سامنے اپنی پارسائی کا ثبوت پیش کرتی؟ دوچار کے علاوہ کون اس کی باتوں کا یقین کرتا؟ اس ضمن میں لٹو کی مثال سامنے تھی۔ لٹو بھی انہیں اچھی عورتیں نہیں سمجھتا تھا اور ان کے وجود سے علاقے کو پاک کرنے کا شدید خواہش مند تھا۔

"حالانکہ اسی خوف کی وجہ سے ہم نے یہاں کسی سے سلام دعا بھی نہیں رکھی ہے۔ پھر بھی لوگ ہمیں جینے نہیں دیتے۔" جانم نے دکھ سے کہا۔

"دراصل کسی کو کیا معلوم کہ آپ کے مکان کے اندر کیا ہورہا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ صرف ناچ گانا ہی ہوتا ہے یا؟ کیونکہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس مکان سے نکلنے والے مردوں کو نشے میں دھت اور لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا ہے۔ جو منظر میں نے دیکھا کیا اور لوگوں نے نہیں دیکھا ہوگا؟" بابو نے بھرپور لہجے میں جراح کی۔

"شراب پینا ان کا ذاتی فعل ہے۔ میرا گانا کوئی منہ میں پان رکھ کر سنے یا سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے یا پھر شراب پیتے ہوئے اس میں میرا کیا قصور؟ یہ تو گانے کا لطف دوبالا کرنے کا ان کا اپنا انداز ہے میں نا تو انہیں ٹوک سکتی ہوں اور نا ہی روکنے پر قادر ہوں۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں جسم فروشی کا دھندہ نہیں کرتی۔ یہ کام میں چھوڑ چکی ہوں۔ اسے بھی وہ زندگی میری مجبوری تھی۔ جب سے معصومہ نے جوانی کے پہلے زینے کی جانب قدم بڑھایا ہے اسی دن سے میں نے جسم فروشی جیسے گندے کام سے توبہ کرلی بلکہ ہمیشہ کے لئے اس کام کو اللہ حافظ کہہ دیا۔" جانم نے فخر سے کہا۔

"معصومہ؟ غالباً آپ کی چھوٹی بہن کا نام ہے؟" بابو نے اس خالی صوفے کی جانب آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا جس پر چند لمحے قبل اس کے دل کا قرار وہ حسن کی دیوی براجمان تھی۔

"معصومہ میری بیٹی کا نام ہے۔" جانم نے دل فریب مسکراہٹ سجا کر کہا۔

"آپ کی سگی بیٹی؟" بابو نے غیر یقینی سے دریافت کیا کیونکہ اتنا علم تو اسے بھی تھا کہ جسم فروشی کے پیشے سے وابستہ ایسی عورتوں کی سگی بیٹیاں ذرا کم ہی اس دلدل میں اترتی ہیں عموماً ایسی عورتیں پرائی بہن بیٹیوں سے ہی ظلم وتشدد کے ذریعے ایسا گھناؤنا کام لیتی ہیں۔

"معصومہ میری سگی اولاد ہی نہیں بلکہ میری جائز اولاد بھی ہے میری بیٹی کسی عیاش مرد کے گناہ کا بیج نہیں ہے بلکہ چل گوٹھ کا وڈیرا۔ وڈیرا سلطان اعظم اس کا سگا باپ ہے۔" جانم نے گویا ایک طرح کا انکشاف کیا۔

"پھر یہاں؟ اس حالت میں؟ ایک کرائے کے مکان میں آن کر رہنا کچھ سمجھ نہیں آیا۔" بابو کو علم بھی نہ ہوسکا اور وہ اس کی باتوں کے جال میں الجھ کر اپنی آمد کا اصل مقصد ہی فراموش کر بیٹھا۔

''اسے بھی میری مجبوری سمجھ لو۔'' جانم کے لہجے میں دکھ سا گھل کر رہ گیا۔

''کیسی مجبوری؟'' بے اختیار بابو کے لبوں سے یہ سوال ادا ہو کر رہ گیا تو اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے جانم نے بتایا کہ۔

''وڈیرا سلطان اعظم اپنے ایک دوست کے ساتھ ایک دن میرا رقص دیکھنے اور گانا سننے کے لئے پہلی بار ستارا بائی کے کوٹھے پر تشریف لائے۔ ان دنوں میں ستارا بائی سے رقص و نغمے کی تربیت حاصل کر رہی تھی اور میں نے باقاعدہ اپنے کام کا آغاز نہیں کیا تھا وڈیرا سلطان اعظم اس سے پہلے کبھی رقص و نغمے سے دل بہلانے کسی کوٹھے پر نہیں گئے تھے۔ ان کی اسی سادگی کو دیکھتے ہوئے ستارا بائی نے کسی پرانی رقاصہ کی بجائے مجھ سے التماس کی کہ میں اپنے لفریب رقص اور مسحور کن آواز سے ان کا دل بہلاؤں میں اپنی پالن ہار کا حکم کیسے ٹال سکتی تھی؟ ستارا بائی کے کہنے پر میں نے پہلی بار کسی تماش بین کے سامنے اپنی مدھر آواز کا جادو جگایا اور اپنا دلفریب رقص پیش کیا۔ سلطان اعظم دم بخود سے بیٹھے میرا رقص دیکھتے رہ گئے ان کی وہ نگاہیں آج تک مجھے نہیں بھولتی۔ کیسے ہیروں کی مانند چمک رہی تھی۔ ان کے ایسی والہانہ انداز نے میرا دل لے لیا اور میں پہلی نظر میں ہی ان کی محبت کے جال میں پھنس کر رہ گئی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ محبت کی یہ آگ یکطرفہ نہیں تھی بلکہ وہ بھی پہلی ملاقات میں میری محبت میں گرفتار ہو چکے تھے۔ قصہ مختصر یہ کہ انہوں نے ستارا بائی سے اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ وہ مجھ سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ ستارا بائی روایتی بائیوں کی طرح سخت اور ظالم و جابر عورت نہیں تھی اگر ان کے کوٹھے پر ناچنے والی کسی لڑکی کا ہاتھ کوئی شریف آدمی طلب کر لیتا تو وہ بنا کسی تعرض کے لڑکی کو اس کے نکاح میں دے دیتیں۔ صرف لڑکی پر کئے گئے اخراجات کے علاوہ وہ اور کچھ طلب نہیں کرتیں۔

چار گواہوں کی موجودگی میں، میں وڈیرا، سلطان اعظم کی منکوحہ ہو گئی۔ انہوں نے مجھے کوٹھے کے بند ماحول سے باہر نکال کر آزاد فضاؤں کی سیر کروائی ہم نے اپنے ملک کی ہر خوبصورت جگہیں دیکھ ڈالیں وہ تقریباً چھ مہینے میرے ساتھ رہے۔ ان چھ مہینوں کا ایک، ایک لمحہ ہم نے بے شمار خوشیوں کے پھولوں سے اپنا دامن بھرتے ہوئے گزارا۔ اسی دوران معصومہ نے میرے وجود میں پرورش پانا شروع کر دیا۔

''ابا جان نے فون کر کے بتایا ہے کہ اماں کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی ہے میرا فوری طور پر جانا بہت ضروری ہے میں جلد از جلد لوٹ کر آنے کی کوشش کروں گا۔''

اور پھر وہ چلے گئے۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے رہے لیکن وہ نہیں آئے خرچے کے لئے جتنی رقم وہ دے کر گئے تھے وہ بھی لاکھ احتیاط سے خرچ کرنے کے باوجود تیزی سے اختتام پذیر ہو رہی تھی اور ایک دن معصومہ کی پیدائش بھی ہو گئی بس اسی دن سے میری مجبوری کی کہانی کا آغاز ہوا۔

جمع پونجی معصومہ کی پیدائش پر خرچ ہو گئی فلیٹ کرائے کا تھا سال بھر کا کرایہ سلطان اعظم ایک مشت ادا کر چکے تھے۔ لہٰذا سال پورا ہوتے ہی فلیٹ بھی چھوٹ کر رہ گیا نا چاہتے ہوئے بھی ستارا بائی کے کوٹھے کا رخ کیا وہاں پہنچ کر یہ بری خبر سننے کو ملی کہ رحم دل و ہمدرد ستارا بائی اب اس دنیا میں نہیں رہی ان کی جگہ آنے والی چندہ بائی بہت سخت دل اور بے رحم تھیں اس نے پہلے ہی دن مجھے صاف لفظوں میں یہ کہہ دیا کہ......

''اپنا اور اپنی بیٹی کا پیٹ تجھے خود پالنا ہوگا۔'' ادھر سلطان اعظم کو ماں، باپ کی دھمکیوں نے اس قدر ہراساں کر کے رکھ دیا کہ انہوں نے

دولت وجائیداد کے علاوہ خاندان سے بے دخل کردیے جانے کے خوف سے مجھے طلاق نامہ بھیج دیا۔'' جانم نے اتنا کہہ کر چپ اختیار کرلی۔ بابو نے دیکھا کہ اس کی حسین آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

''میں معافی چاہتا ہوں...... میں نے آپ کے زخم ہرے کردیئے۔'' بابو شرمندگی سی محسوس کرنے لگا۔

''نہیں! کوئی میرے زخم کیا ہرے گا؟ یہ زخم تو کبھی بھرے ہی نہیں؟'' جانم نے ایک کرب سے کہا پھر ایک دم سے اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے مسکرا کر بابو کی طرف دیکھا۔

''میں بھی کیسی بے وقوف عورت ہوں۔ میرے غریب خانے کو عزت بخشنے ایک پیارا سا مہمان آیا ہے اور میں اس سے کیا باتیں کر رہی ہوں۔ بھلا کسی کو میری دکھ بھری کہانی سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟'' جانم نے اپنے آپ کو سنبھالا اس سے پہلے کہ بابو یہ کہنے کے لئے اپنے لبوں کو متحرک کرپاتا کہ ''مجھے آپ کا ماضی جاننے سے دلچسپی ہے۔'' عین اسی لمحے پردہ ہٹا اور معصومہ کمرے میں وارد ہوئی۔

''امی کیا میں ناشتے کے برتن لے جاسکتی ہوں؟''

مترنم سی آواز پر بابو نے ایک جھٹکے سے گردن گھما کر دروازے کے سمت دیکھا اور بے اختیار اس کی نگاہیں حسین وجمیل معصومہ پر جم کر رہ گئیں وہ نہا کر آئی تھی اور بالکل گلاب کے تازہ پھول کی طرح کھلی کھلی، نکھری نکھری اور معطر دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنے پرکشش سراپے کو کالے رنگ کے لباس کے اندر چھپالیا تھا اور اس کی کھلتی رنگت پر کالے رنگ کا لباس اس قدر غضب ڈھا رہا تھا کہ اس کا حسن آگ سا بنا ایسی آنچ دے رہا تھا جس کی لپیٹیں بابو کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ آگ کی مانند دیکھتے ہوئے اس حسن سے بابو کو اپنا آپ بچائے رکھنا مشکل ہی نہیں ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک نادیدہ آگ کے درمیان بری طرح جھلستا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ وہ قطعی یہ نہیں جان سکا کہ وہ کسی آگ تھی جو اسے اپنی گرفت میں لینے کے بعد چند لمحوں کے اندر اس کی ہستی کو جلا کر راکھ کرچکی تھی۔

''ان سے ملو معصومہ یہ بابو ہیں۔'' جانم نے حسن کی دیوی کو مخاطب کرکے کہا حسن کی ملکہ نے اپنے چہرے کا رخ بابو کی جانب کیا اس کے حسین آنکھیں بابو کی پیاسی نگاہوں سے کیا ٹکرائی بابو کے دل کی دھڑکنیں بکھر کر رہ گئیں۔ اس کے یاقوتی لبوں پر چین وقرار لوٹ لینے والا تبسم ابھرا اور اس نے اپنا سیدھا ہاتھ ماتھے تک لے جاکر، صراحی دار گردن کو ذرا سا خم دے کر ایک ادائے قاتلانہ سے اسے۔ ''آداب۔'' پیش کیا۔

بابو کا حلق ایک دم سے جیسے خشک ہو کر رہ گیا اس نے تھوک نگلتے ہوئے اپنے سر کو ذرا سا خم دے کر حسینہ کے آداب کا جواب دیا۔

''ہاں۔ تم یہ برتن لے جاؤ اور بابو کے لئے فریش جوس بنا کر لے آؤ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے بابو کی پیاس بھڑک اٹھی ہے۔'' جانم کے معنی خیز لفظوں پر بابو نے قطعی توجہ نہیں کی بلکہ اس کی پوری توجہ حسن کی چلتی پھرتی قیامت پر مرتکز تھی۔ جب تک معصومہ برتن سمیٹتی رہی بابو اسے دیکھتا رہا اس لمحے اس نے جانم کے وجود کو بھی قطعی نظر انداز کردیا اسی لئے اس کی نگاہیں یہ نہ دیکھ سکیں کہ جانم لبوں پر فاتحانہ تبسم سجائے بابو کو ہی گھورے جا رہی تھی۔

اسے اپنی معصومہ پر بھی ٹوٹ کر پیار آرہا تھا اس کے بڑھاپے کا سہارا اس کی یہی خوبصورت بیٹی معصومہ ہی تو تھی۔

جب معصومہ خالی برتنوں کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تو بابو اس طرح اپنے حواسوں میں لوٹ آیا جیسے معصومہ کی موجودگی

میں اسے اردگرد کی بھی چیز کا وجود دکھائی نہ دیتا ہو۔ ہر چیز اس کے حسن کی چکا چوند کے سامنے ماند پڑنے کے بعد اپنا وجود کھو دیتی ہو۔ اور حقیقت بھی یہی تھی۔ کم از کم بابو کو تو ایسا ہی محسوس ہوتا تھا۔

''آ۔ آپ اپنے بارے میں کچھ بتا رہی تھیں؟'' اب بابو کا وہاں سے جانے کو قطعی دل نہیں چاہ رہا تھا اس نے دانستہ طور جانم کو اپنی ماضی کی بند کتاب زندگی کھولنے پر مجبور کیا تا کہ جانم اپنی کہانی سناتی رہی وقت گزرتا رہے۔ باتوں کے دوران بار بار معصومہ کی آمد بھی جاری رہے اور وہ اس حسن کے بکھرے ہوئے سمندر سے اپنے وجود کی آگ بھی ٹھنڈی کرتا رہے۔ جس کے حسن نے اس پر ایسا جادو کر ڈالا تا کہ وہ جیسے پاگل ہوا اٹھا تھا۔

''معصومہ کو پالنے پوسنے کے لئے بڑی رقم کی ضرورت تھی میں نے مجبوراً اپنا جسم بیچنا شروع کر دیا میں چاہتی تھی کہ میرے پاس اتنی رقم جمع ہو جائے کہ میں اپنی معصومہ کو اس گندے ماحول سے نکال کر کسی اچھے ماحول میں لے جا کر اس کی پرورش کر سکوں لیکن میں یہ نہیں جانتی تھی کہ چندہ بائی کی نگاہیں میری معصومہ کے معصوم حسن کو تول کر یہ اندازہ لگا چکی تھیں کہ مستقبل میں میری معصومہ کا قاتل حسن کوٹھے کی رونق میں چار چاند لگا دے گا۔ اس کے حسن و کم عمری کے اس قدر شیدائی پیدا ہو جائیں گے کہ کوٹھے پر تل دھرنے کی جگہ نہیں رہے گی۔ جس دن مجھے اس کمینی چندہ بائی کے اپنی بیٹی کے بارے میں ایسی گندی سوچ کا علم ہوا ایک رات میں اپنی معصومہ کو لئے وہاں سے فرار ہوگئی۔ میری پوری کوشش یہی تھی کہ میں اس غلاظت بھری زندگی کی جانب لوٹ کر نہیں جاؤں اس لئے میں اپنی بیٹی کو لئے یہاں وہاں چھپتی چھپاتی زندگی کی دن گزارتی رہی لیکن ذلیل چندہ بائی کے پالتو غنڈے یا کتے کہہ لو میری بو سونگھتے ہوئے ہر اس جگہ پہنچ جاتے جہاں میں رہائش اختیار کرتی۔ میری بدقسمتی سے وہ گزشتہ شب مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں بھی تشریف لا چکے ہیں۔'' جانم نے کہا۔ بابو نے دیکھا کہ ایک انجانہ سا خوف اس کے چہرے کو اپنے حصار میں لے چکا تھا۔ حسین آنکھوں میں بھی خوف کی کالی پرچھائیاں تھرک رہی تھیں۔

''وہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ کیوں وہ آپ کو پریشان کر رہے ہیں؟'' بابو نے دریافت کیا۔

''شاید تم نے میری بات توجہ سے نہیں سنی۔ وہ چندہ بائی کے پالتو آدمی ہیں اور چاہتے ہیں کہ میری معصومہ بھی جسم بیچنے کا دھندہ شروع کر دے۔ وہ ذلیل عورت میری معصومہ۔ میری معصوم پری کو بھی گندگی کے اس کیچڑ میں دھکیلنے کے خواہش مند ہے اور اپنی زندگی میں، میں یہ ہرگز ہونے نہیں دوں گی۔ اس کیچڑ میں جو ایک بار گر جائے اس کا پورا وجود اس قدر گندا اور بدبودار ہو جاتا ہے کہ سات سمندروں کا پانی بھی مل کر اس کے جسم سے وہ گندگی اور بدبو دور نہیں کر سکتا جو گندے جسموں کے ملاپ سے اس کے وجود سے لپٹ جاتا ہے بلکہ اس کے جسم کے رواں رواں میں اس طرح بس کر رہ جاتی ہے کہ صرف اس کا جسم ہی نہیں روح بھی میلی ہو کر رہ جاتی ہے۔ بے حد گندی اور میلی۔'' جانم کے لہجے میں نامعلوم سا کرب چلا کر بول رہا تھا جس کی صدا بابو کو بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔

''تم نے میری معصومہ کو دیکھا ہے نا؟'' جانم نے ایک دم سے اس سے یہ سوال کیا وہ صرف اقرار میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

''کیا تمہارا دل یہ نہیں کہتا ہے کہ ایسا نایاب پھول گھر کے گل دان میں تو سجایا جا سکتا ہے دیدار کے لئے شاہراہ عام پر نہیں رکھا جا سکتا۔ جہاں گندے ہاتھوں کا لمس اسے میلا کرتا رہے۔ ہر آنے جانے والا اسے سونگھ کر اس کی خوشبو سے اپنے آپ کو تو معطر کرتا ہے لیکن اپنی بدبودار بیمار

سانسوں سے پھول کی تازگی کو مرجھا کر رکھ دے۔ اس کی کوملتا اور نزاکت کا خاتمہ کر ڈالے۔ بتاؤ بابو؟ کیا تمہارا دل ایسا کہتا ہے؟'' جانم نے ایک بھرپور امید سے اس کی جانب دیکھا۔

''مم میرا دل؟'' وہ بری طرح سٹپٹا کر رہ گیا اب وہ اپنے دل کی کیا بتاتا؟ معصومہ کو دیکھنے کے بعد اس کا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ وہ اسے نادر و نایاب اور بیش قیمت ہیرے کو ہمیشہ کے لئے اپنے دل کی تجوری میں بند کر کے رکھ دے تاکہ کسی اور جوہری کی نگاہیں اس پر کبھی نہ پڑ سکے اور کوئی اسے بابو سے چھین نہ سکے۔

اس سے پہلے کہ مناسب الفاظ جوڑ کر وہ اپنے دل کی بات بیان کرنے کی ہمت کر پاتا ایک بار پھر معصومہ کمرے میں آن وارد ہوئی اس کے خوبصورت ہاتھوں میں ایک ٹرے تھی جس پر تازہ مینگو جوس کے دو گلاس سجے ہوئے تھے۔ معصومہ نے سب سے پہلے ایک گلاس جانم کی خدمت میں پیش کیا اور پھر بابو کی جانب قدم بڑھانے شروع کئے وہ حسب عادت اپنی بے قرار نگاہیں اس کے حسین چہرے پر جمائے اسے اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھتا رہا۔

''جوس۔'' اس نے قدرے جھک کر بابو کے حضور جوس پیش کیا۔ کھلے گریبان سے جھانکتا ہوا اس کا بھرپور شباب بابو کو بجلی کے جھٹکے سے مشابہہ ایسا جھٹکا لگا گیا کہ بابو کے پورے وجود میں سنسناہٹ سی گردش کر گئی لمحوں کے اندر وہ سر تا پاؤں پسینے میں بھیگ کر رہ گیا۔ وجود پر تو لرزا طاری ہی تھا دل کی دھڑکنیں بھی قابو سے باہر ہونے لگیں۔ اس نے بمشکل تمام اپنی نگاہوں کا زاویہ بدل کر مینگو جوس پر مرکوز کیا اور ہاتھ بڑھا کر گلاس تھام لیا لیکن اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ اسے بھی محسوس ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس نے ایک ہی سانس میں گلاس میں موجود تمام جوس حلق کے راستے اپنے معدے تک منتقل کیا اور گلاس ٹرے پر رکھ کر رومال سے اپنے ہونٹ صاف کرنے لگا وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی یہ حالت کیوں ہو رہی تھی؟ ہاں اتنا ضرور جانتا تھا کہ اس کی غیر ہوتی اس حالت کی ذمہ دار صرف حسین و جمیل معصومہ تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کے حسن و شباب کا اتنے قریب سے نظارہ نہیں کیا تھا۔ ذرا سے اس نظارے نے بابو کے دل و دماغ کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔

''میں چلتا ہوں۔'' بابو ایک دم سے بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا اب اس کے لئے اپنی حالت پر قابو پانا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ ٹھنڈا جوس پینے کے باوجود اس کے حلق کی خشکی برقرار رہی تھی۔

''شاید تم یقین نہ کرو۔ لیکن آج تم سے اپنے دل کی بات کر کے جانے کیوں میرے دل کو بہت سکون حاصل ہوا ہے۔ وہ خوشی ملی ہے جو بیان سے باہر ہے ایسا لگ رہا ہے جیسے تم میرے اپنے ہو۔ مجھے بہت خوشی ہوگی اگر تم میرے اس غریب خانے کو رونق بخشنے یونہی آتے رہو گے۔'' جانم کے لفظوں اور لہجے سے چھلکتی اپنائیت نے اس کا دل جیت لیا۔

''امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ آج برسوں بعد میں نے امی کو اتنا خوش دیکھا ہے۔ آپ کی آمد سے اور آپ سے اپنے دل کی باتیں کر کے امی برسوں بعد اپنی اداسی کے خول سے باہر آئی ہیں۔ میری آپ سے التجا ہے کہ آپ آتے رہیے گا مجھے اپنی ماں کی خوشیاں بہت عزیز ہیں۔'' معصومہ نے اس قدر معصومیت اور اپنائیت سے یہ بات کہی کہ بابو خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

''میں۔میں ضرور آؤں گا۔'' بابو نے وعدہ کیا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

اس دن بابو وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر آیا تو وہ یکسر مختلف بابو تھا۔ معصومہ کی معصومیت اسے بری طرح گھائل کر چکی تھی۔ اس کا بے مثال حسن اس کے دل کی دنیا میں ایسا انقلاب برپا کر گیا تھا کہ معصومہ کی محبت کے سمندر میں غرق ہو کر رہ گیا وہ اپنے وجود کی سب سے قیمتی چیز اپنا ''دل'' وہاں چھوڑ آیا تھا۔

وہ دل! جس میں ارمانوں اور خواہشات کی دنیا آباد ہوتی ہے۔ وہ دل! جس میں انسان کا چین وقرار پوشیدہ ہوتا ہے۔ وہ دل! جو سکون و اطمینان کا گھیر ہوتا ہے۔ وہ دل! جس میں نازک جذبے پرورش پاتے ہیں اور حساس جذبات جہاں تاحیات مفید رہتے ہیں۔ جی ہاں! وہی قیمتی دل۔ بابو کا دل معصومہ کے در پر انکارہ گیا تھا اسی لئے تو وہ بہت بے چین و بے قرار بے سکون و بے اطمینان اور بہت خالی خالی محسوس کر رہا تھا۔

جب اسے گھر میں چین وقرار میسر نہ آیا تو وہ اپنے دوست لٹو کے پاس چلا آیا۔

''کیا وہ عورت اشرف کانے کا گھر اور اپنا علاقہ چھوڑ کر جانے پر راضی ہوئی۔'' چند لمحوں تک ادھر ادھر کی ہانکنے کے بعد لٹو نے ایک دم سے دریافت کیا۔

''وہ عورت اب یہیں رہے گی۔'' بابو کے اٹل لہجے نے لٹو کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔

''کیا مطلب؟'' لٹو نے اپنی حیرت کو زبان بخشی۔ ''کس بات کا مطلب؟ میں نے کوئی فارسی میں تو نہیں کہا ہے کہ تجھے مطلب بھی بتاؤں۔'' بابو کے بے زارانداز نے لٹو کے دماغ میں گھنٹیاں سے بجانی شروع کر دیں۔

''لیکن وہ عورت یہاں کیوں رہے گی؟ علاقے کے لوگ اس کے یہاں رہنے پر قطعی خوش نہیں ہیں۔'' لٹو نے کہا۔

''کوئی ہم سے خوش ہے؟ پھر بھی ہم یہاں رہ رہے ہے نا۔ اسی طرح جانم اور اس کی بیٹی بھی اب اسی جگہ رہیں گی اور یہاں سے کہیں نہیں جائیں گی۔ اگر کسی کو ان کے یہاں رہنے پر اعتراض ہے تو وہ بندہ اپنا ٹھکانہ کہیں اور کر لے۔'' بابو نے دوٹوک بات کی۔

''ان کے حق میں بولنے کی کوئی خاص وجہ؟'' لٹو تولتی ہوئی نگاہوں سے اس کے چہرے کو تکتا رہ گیا۔

''جیسا ہم سب سوچ رہے تھے وہ عورت بالکل ویسی نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر بابو نے اسے جانم سے پہلی اور پھر دوسری ملاقات کی تمام باتیں من وعن بیان کر دی۔ خصوصاً جانم کی اپنائیت اور محبت اور معصومہ کے بے مثال حسن نے جس طرح اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ کر اسے محبت کے لطیف جذبے سے آشنا کیا وہ سب اس نے بے خوف و بے دھڑک لٹو کے گوش گزار کر دیا جو حیرت سے اس کی جانب تکتے ہوئے اس کے لبوں سے ادا ہونے والے الفاظ سنتا رہا۔

''آنٹی نے اس حسن کی دیوی کا نام معصومہ بالکل درست رکھا ہے۔ ایسی بے مثال معصومیت میری نگاہوں سے آج سے پہلے کبھی نہیں گزری۔'' وہ تصور میں معصومہ کے سراپے کو بسا کر بولا۔

''تیرا کھویا کھویا انداز بتا رہا ہے کہ تو اس عورت کی بیٹی کی محبت میں غرق ہو چکا ہے۔ بچ کر رہنا میرے بھائی! میرا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ یہ

کہتا ہے کہ ایسی معصوم صورت لڑکیاں بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔ دراصل خوبصورتی اور معصومیت ہی ایسی لڑکیوں کے ہتھیار ہوتے ہیں۔ کب اور کہاں معصومیت کے رنگ دکھانے ہیں اور کس وقت خوبصورتی کا استعمال کرنا ہے انہیں بہت اچھی طرح علم ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ مرد کی کمزوری بھانپ کر پھر یہ موقعہ ومحل کے مناسبت سے اپنے ہتھیاروں کا استعمال کرتی ہیں۔ کتنی حیران کن بات ہے کہ عورت خالی ہاتھ ہونے کے باوجود ہتھیاروں سے لیس ہوتی ہے اور اس کا ہر ہتھیار مرد کو بے بس کر دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔'' لٹو نے ناصحانہ انداز اپنایا لٹو کی ہر بات بابو کو سخت گراں گزر رہی تھی وہ اب کسی قیمت پر اور کسی حال میں معصومہ کی شان میں گستاخی یا گستاخانہ کلمات برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

''دیکھ لٹو! اگر تو چاہتا ہے کہ ہماری دوستی برقرار رہے اور اس دوستی پر کوئی آنچ نہ آئے تو آئندہ جانم آنٹی اور معصومہ کے بارے میں کوئی غلط بات اپنی زبان سے ادامت کرنا۔ کم از کم میرے سامنے تو بالکل نہیں۔ ورنہ؟ صاف کہے دیتا ہوں میں تیرا منہ توڑ کر رکھ دوں گا۔'' بابو کو ایک دم سے ناراض ہوتے دیکھ کر لٹو کی حیرت دوچند ہوگئی۔

''ارے واہ! وہ سالی ماں بیٹی تو جادوگرنیاں نکلیں ایک ہی ملاقات میں انہوں نے تیرا دماغ ہی بدل کر رکھ دیا۔ سالا تیرا میٹر ہی گھما ڈالا ہے۔'' لٹو کو اس کا لب ولہجہ اور الفاظ پسند نہیں آئے۔

''لٹو۔'' اس نے تنبیہہ انداز اپنایا۔

''کیا نام ہے تیری ''آنٹی'' کا......؟ ہاں! یاد آیا ''جانم'' دیکھ نا دیکھ کیسا چن کر رکھا ہے؟ جانم! سالی کو نا اس کا باپ نام لے کر بلا سکے اور ناہی بھائی یا بیٹا خیر ایسی عورتوں کے باپ، بھائی یا بیٹے کہاں ہوتے ہیں؟ اسی لئے تو یہ صرف مردوں کی جانم......'' لٹو اپنی بات مکمل نہیں کرسکا بابو کے بھرپور تھپڑ نے، نا صرف اس کی بولتی بند کر کے رکھ دی بلکہ اس کے گال پر انگلیوں کے نشانات بھی چسپاں کر ڈالے۔ لٹو کا گال جیسے سنسنا اٹھا۔ اس نے ایک ہاتھ کی مدد سے اپنے متاثرہ گال کو سہلاتے ہوئے حیرت سے بابو کی جانب دیکھا جو اپنی قہر برساتی نگاہوں سے اسے اس طرح گھورے جا رہا تھا جیسے لٹو کو سالم نگلنے کا ارادہ ہو۔

''بس! اب ایک لفظ اور ان کے بارے میں کچھ غلط بولا تو جان سے مار ڈالوں گا۔'' بابو چوٹ کھاتے ناگ کی مانند پھنکارا تھا۔ لٹو چند لمحوں تک اس کی قہر برساتی نگاہوں میں اپنی نگاہیں پیوست کیے اسے گھورتا رہا اس کا غصہ قطعی حقیقی اور بے اختیار تھا اور غصے کی شدت کے باعث اس کا چہرہ آگ کی مانند تپ رہا تھا۔ لٹو کے لبوں پر پہلے مسکراہٹ ابھری اور پھر وہ مسکراہٹ پھیلتے پھیلتے ہنسی کا روپ دھار گئی اور چند لمحوں کے اندر لٹو کی دبی دبی ہنسی کو لبوں کے دروازے سے باہر دھکیلتا ہوا ایک جاندار قہقہہ فضا میں بکھر کر رہ گیا۔ ایک نہ دو کئی لمحات تک لٹو ایک تسلسل سے ہنستا چلا گیا۔ یہاں تک ہنس ہنس کر اس کی چہرے کی سانولی رنگت میں خون کی سی سرخی شامل ہو کر رہ گئی۔ بابو کے نگاہوں میں دہکتی غصے کی آگ لٹو کی ہنسی کا تسلسل دیکھ کر دھیرے دھیرے ٹھنڈی پڑنے لگی اور اس کی جگہ اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیرنے لگی۔ اسے یہی الجھن تھی کہ آخر اس قدر شدید تھپڑ سہنے کے باوجود لٹو ہنس کیوں رہا تھا؟

''ابے تو، تو گیا کام سے۔ سچ کہتا ہوں تیرا اللہ ہی حافظ ہے۔ گہری کھائی میں گرنے جا رہا ہے۔''

لٹو نے بدستور ہنستے ہوئے کہا۔

بابو نے ایک غصے بھری نگاہ اس پر ڈالی اور اٹھ کر وہاں سے بھی چل دیا۔ شام تک وہ بے مقصد سڑکوں کی خاک چھانتا رہا۔ معصومہ کے تصور اور خیال سے ایک لمحے کے لئے بھی اس کی جان آزانہ ہو سکی۔ وہ کسی حسین سوچ کی مانند اس کے دماغ پر قابض ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا قیامت خیز سراپا اور معصوم حسن بابو کی آنکھوں میں کچھ اس طرح بس کر رہ گیا تھا کہ قریب سے گزرتی ہر لڑکی اسے معصومہ دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بابو جو کبھی لڑکیوں کو نگاہ اٹھا کر دیکھنا پسند نہیں فرماتا تھا اب ہر لڑکی کو معصومہ کے دھوکے وفریب میں اس طرح دیدے پھاڑ پھاڑ کر گھورے جا رہا تھا جیسے کسی بھی لمحے ان سے لپٹ پڑے گا یا انہیں اپنی بانہوں میں بھر لے گا۔

رات کو جب وہ گھر میں داخل ہوا تو گاؤں سے اس کے چچا کی بیٹی ثریا آئی ہوئی تھی۔

گاؤں کی یہ سانولی سلونی اور متناسب جسم کی مالک حسینہ ثریا جو بابو کی منگیتر بھی تھی پہلے ہی اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ معصومہ کو دیکھنے اور اس کی محبت میں گرفتار ہونے کے بعد وہ نگاہوں کی زد میں آئی ثریا کو اپنے گھر میں پا کر ایک دم سے اس قدر بری صورت بنا کر رہ گیا جیسے کونین کی کڑوی گولی چبا ڈالی ہو۔ سارے حلق میں جیسے کڑواہٹ گھل کر رہ گئی۔

''ماں۔'' اس نے صحن کے وسط میں کھڑے ہو کر حلق پھاڑ کر چلاتے ہوئے زلفاں بیگم کو آواز دی۔

اس کی آواز پر صحن کے ایک کونے میں میلے برتن دھونے میں مصروف بیٹھی ثریا نے بھی ایک دم سے مڑ کر دیکھا اس کی کالی آنکھوں میں زندگی سی رقص کرنے لگی۔ سانولے رنگ کے چہرے کو شرم وحیا کی سرخی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دلکش تبسم نے لبوں کی نزاکت کو ایک منفرد خوبصورتی بخش دی۔ صرف ایک نظر اپنے محبوب کا دیدار کرنے کے بعد ثریا پھر سے میلے برتنوں کی جانب متوجہ ہو گئی جبکہ اس کی پکار پر صرف زلفاں بیگم ہی نہیں بلکہ اس کی ایک بہن بھی صحن میں دوڑی چلی آئی۔

''یہ کیا تماشہ لگا رکھا ہے تم لوگوں نے؟'' ماں کو دیکھتے ہی بابو کے لہجے میں غصہ عود کر آیا۔

''کیسا تماشہ......؟'' زلفاں بیگم نے حیرت سے دریافت کیا۔ ثریا بھی اس کے غصے کا سبب جاننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گئی بظاہر وہ برتن دھونے میں مصروف رہی۔

''جب بھی تم اور ابا گاؤں جاتے ہو۔ واپسی پر اس کالی کلوٹی کو ساتھ لے آتے ہو۔ یہ تماشہ نہیں تو اور کیا ہے؟ کیوں کرتے ہو تم لوگ یہ تماشہ؟'' اس نے ماں کو گھورتے ہوئے دریافت کیا۔

''تو ہمیشہ اسے کالی کلوٹی کیوں کہتا ہے رے؟ اس کا نام ثریا ہے۔ ثریا اور یہ کوئی ایسا مشکل نام نہیں ہے جو تیری زبان سے ادا نہیں ہو پاتا؟''

''اس کی بڑی بہن نے بھی جواباً غصے سے کہا زلفاں بیگم نے بیٹی کو ڈانٹ کر چپ کروا دیا۔

''تو اندر جا۔ میں خود اس سے بات کرتی ہوں۔'' ماں کے حکم پر بڑی بہن بابو کو غصے سے گھورتی ہوئی کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

''آج میری ایک بات تو کان کھول کر سن لے ماں! چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے میں اس کالی کلوٹی سے کسی قیمت پر شادی نہیں کروں

گا۔" اس نے نفرت سے ثریا کی پشت گھورتے ہوئے کہا۔

"اس لڑکی سے شادی سے انکار کرنے کا مطلب تجھے پتہ ہے؟" زلفاں بیگم نے دکھ سے کہا۔

"سب معلوم ہے مجھے لیکن میں اپنی ایک بہن کا گھر بسانے کے لئے اپنی زندگی قطعی برباد نہیں کر سکتا۔"

اس نے دوٹوک لہجے میں کہہ کر ایک نفرت سے بھرپور نگاہ ثریا پر ڈالی اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

زلفاں بیگم تو اس کا دوٹوک فیصلہ سن کر پتھر کے مجسمے کی مانند ساکت و جامد کھڑی کی کھڑی رہ گئی جبکہ ثریا کی حسین کجرالی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے۔

☆......☆......☆

عبداللہ اور سعد اللہ دو بھائی تھے۔ دونوں بھائیوں میں اس قدر محبت تھی کہ دونوں بھائی ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ پھر دونوں بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں۔ عبداللہ کو گاؤں کی زندگی پسند نہ تھی۔ اس لئے وہ روشنیوں کے شہر کی جانب چل پڑا اور شہر کے ایک پسماندہ لیکن گنجان آبادی والے علاقے میں چار کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گھر خرید کر رہنے لگا جبکہ سعد اللہ نے گاؤں میں ہی رہنے کو اہمیت دی۔

عبداللہ نے چونکہ اپنے حصے کی جائیداد فروخت کر کے شہر میں رہائش کے لئے ایک گھر خرید لیا تھا اس لئے زندگی کی گاڑی کو چلائے رکھنے کے لئے اس نے ایک فیکٹری کی ملازمت اختیار کر لی۔

دونوں بھائیوں کی زندگی کی گاڑی مناسب رفتار سے چلتی رہی۔ دونوں بھائیوں نے دکھ سکھ میں ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑا اور خوشی غمی کے علاوہ تہواروں میں بھی اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر ایک دوسرے سے ملنے جاتے رہتے۔

لیکن خدا جانے کیا بات تھی؟ دونوں بھائیوں میں جتنی محبت تھی ان دونوں کے بیٹے اتنے ہی ایک دوسرے کے دشمن تھے اگرچہ ان کی دشمنی کسی پر واضح نہ تھی لیکن بابو اور رمضان جب بھی کہیں ملتے ایک دوسرے کی مخالفت میں بولنا اور ایک دوسرے کے کاموں میں سو عیب نکالنا ہی ان کا پسندیدہ کام ہوتا۔ دونوں ایک دوسرے کو ذلیل کرنے کا کوئی موقعہ بھی اپنے ہاتھوں سے جانے نہیں دیتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ جب سعد اللہ کے بیٹے رمضان نے بابو کی سب سے بڑی بہن مدیحہ سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار فرمایا تو جہاں رمضان کی اس خواہش نے دونوں گھرانوں میں خوشی کی لہر دوڑا کر رکھ دی وہیں بابو کو یہ بات سخت مشتعل کر گئی۔

''ہماری مدیحہ شکل و صورت، عقل و سمجھ اور زندگی کے ہر معاملے میں رمضان سے کہیں بہتر ہے۔ اس کے لئے کوئی اسی کی ٹکر کا بندہ ہونا چاہئے۔ رمضان میں کیا خوبی ہے جو سب لوگ اس کے رشتے سے اتنا خوش ہو رہے ہیں؟'' بابو نے نقطہ اعتراض بلند کیا لیکن کسی نے اس کی رائے کو کوئی اہمیت نہ دی اور رمضان کا رشتہ قبول کر لیا گیا۔

''مجھے جہیز کے نام پر ایک سوئی تک نہیں چاہے لیکن مدیحہ سے شادی کرنے کی میری صرف ایک شرط ہے۔'' رمضان کی جانب سے آنے والے ان الفاظ نے زلفاں بیگم کو پریشان سا کر کے رکھ دیا عبداللہ بھی کچھ بجھ کر رہ گیا۔ دونوں میاں، بیوی یہ سوچ کر پریشان ہوا ٹھے تھے کہ خدا جانے رمضان کی وہ شرط کیا تھی؟ وہ اس کی شرط پوری کر سکیں گے یا نہیں؟

''کیسی شرط بیٹا؟'' زلفاں نے دھڑکتے دل سے دریافت کیا۔

''شرط سن کر آپ لوگوں کو خوشی ہی ہو گی اور یہ صرف میری شرط ہی نہیں میرے اماں، ابا اور سچ پوچھو تو ثریا کی بھی دلی خواہش ہے۔''

رمضان کے ان الفاظوں سے زلفاں بیگم کو قدرے حوصلہ میسر آیا۔ عبداللہ کے چہرے پر بھی اطمینان رقص کرنے لگا۔

''میری چھوٹی بہن ثریا کو آپ لوگ اپنی بہو بنا لیجئے۔ یعنی بابو کو میری بہن ثریا سے شادی کرنا ہو گی۔'' رمضان کی بات سن کر زلفاں بیگم کے چہرے کی رنگت لوٹ آئی انہوں نے سکون کا سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ہاں کیوں نہیں...... ہمیں تیری یہ شرط دل و جان سے منظور ہے۔ بس یوں سمجھ لے ثریا آج سے میرے بابو کی امانت ہے۔'' زلفاں

بیگم نے بڑے مان سے کہا عبداللہ خاموشی کی مہر ثبت کیے بیٹھا رہا وہ بابو کی رائے جانے بغیر کیسے زبان دے دیتا؟ جبکہ زلفاں بیگم کے اقرار نے رمضان کے لبوں پر فاتحانہ تبسم بکھیر دیا۔

''اری نیک بخت! ایسے ہی ہاں کردی ایک بار بابو سے تو پوچھ لیتی۔'' تنہائی میسر آتے ہی عبداللہ نے اپنی کم عقل بیوی کو سمجھایا۔

''بہن کا گھر بسانے کی خاطر اسے ہماری بات ماننی پڑے گی اور پھر اس میں برائی ہی کیا ہے۔ ثریا ہر لحاظ سے ایک اچھی لڑکی ہے۔'' زلفاں بیگم نے یہ جواب دے کر عبداللہ کو خاموش کر دیا۔

جب مدیحہ کی سماعتوں تک رمضان کی شرط اور اماں کا اقرار پہنچا تو وہ ڈر سی گئی۔ ''اماں! تم نے بابو سے پوچھے بغیر اسے کیسے ہاں کردی؟ اسے تو رمضان کے رشتے پر اعتراض تھا کیا ثریا کو وہ قبول کرلے گا؟'' مدیحہ کو وٹے سٹے کی یہ شرط ہی پسند نہ آئی لیکن وہ رمضان کے رشتے سے انکار کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ اسے رمضان سے اور رمضان کو اس سے شدید محبت تھی البتہ اسے اس بات کا دکھ ضرور تھا کہ رمضان نے ایسی شرط رکھ کر اپنی محبت ہی کو خطرے میں جھونکنے کی حماقت کی تھی۔

''اس میں بابو سے پوچھنے کی کیا بات ہے؟ کیا وہ اپنے خاندان کی رسم ورواجوں سے واقف نہیں ہے۔ پرکھوں سے اپنے خاندان میں اسی طرح وٹے سٹے کی شادیاں ہوتی آئی ہیں اور اللہ کے فضل وکرم سے کامیاب بھی رہی ہیں۔ وٹے سٹے کی شادیوں کا بڑا فائدہ ہے۔ اس طرح کیسا بھی اڑیل مرد ہو ایک جگہ بندھ جاتا ہے۔ اپنی بہن کی خاطر سہی اپنی بیوی سے لازمی محبت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔'' زلفاں بیگم نے بڑے فخر سے کہا یوں جیسے اگر وٹے سٹے کی شادیوں کو بین الاقوامی پذیرائی حاصل ہو جائے تو دنیا کے تمام اڑیل مرد سدھر کر رہ جائیں گے گویا دنیا کا نقشہ ہی بدل کر رہ جائے گا۔

''ایسا وہ بھائی کرتے ہیں جنہیں بہنوں سے محبت ہوتی ہے بہنوں کی خوشیاں عزیز ہوتی ہیں۔ بابو! بابو جیسا بھائی کسی بہن کے لئے کیا قربانی دے گا؟ جسے ہمارا وجود ہی بری طرح کھٹکتا ہے۔'' مدیحہ کی آنکھوں کے کنارے نمکین پانی سے بھر آئے۔

''یہ تیری سوچ ہے۔ میرا بابو بالکل ایسا نہیں ہے۔'' زلفاں بیگم نے مدیحہ کو تسلی دی لیکن مدیحہ اپنے دل کا کیا کرتی جو بدستور ڈرا سا رہا۔ اس کے دل کی سرزمین سے ابھرتے ہوئے وسوسے کے زہریلے بچھو برابر اسے ڈنک مارتے رہے۔

زلفاں بیگم کو اپنے بیٹے پر بڑا مان تھا کہ وہ ان کا حکم ٹالنے یا ان کے فیصلے کے خلاف جانے کی گستاخی کبھی نہیں فرمائے گا اور آنکھیں بند کر کے ثریا کو جی جان سے قبول کر لے گا بقول زلفاں بیگم کہ؟

آخر ثریا میں کس چیز کی کمی تھی؟ اچھی شکل وصورت کے علاوہ بے عیب پرکشش سراپے کی مالک تھی۔ سلیقہ شعاری اور سگھڑ پن اس کی خاص خوبیاں تھیں اور نصیب کے کیا کہنے جب سے پیدا ہوئی تھی۔ باپ کی جھولی بھر دی تھی۔ غریب باپ کو معمولی کسان سے زمین دار بنا کر رکھ دیا تھا۔

لیکن ہوا وہی جس کے ہونے کا یقین زلفاں بیگم کے علاوہ سب کے دلوں کو خوفزدہ کیے ہوئے تھا۔ جب بابو کو اس بات کا علم ہوا کہ اس کی بات گاؤں کی لڑکی ثریا سے طے کر دی گئی ہے تو وہ ایک دم سے جیسے ہتھے سے اکھڑ کر رہ گیا۔

''کس سے پوچھ کر تو نے ایسا غلط فیصلہ کیا ماں؟ میں اس کالی کلوٹی سے شادی کروں گا؟ یہ تو نے سوچ بھی کیسے لیا؟'' بابو کا پورا وجود غصے کی

زیادتی سے لرز اٹھا۔

"وہ مجھے زہر لگتی ہے آئی سمجھ......؟" بابو نے ماں کو آنکھیں دکھائیں۔

"رمضان بھی تو ہے اپنی مدیحہ سے بنا کوئی جہیز لئے شادی کر رہا ہے پھر تجھے ثریا سے شادی کرنے پر کیا اعتراض ہے؟" زلفاں بیگم کی زبان سے رمضان کا نام سن کر اس کے غصے کی آگ مزید بھڑک کر رہ گئی۔

"وہ کالا کوا اگر مدیحہ سے شادی کر رہا ہے تو وہ مدیحہ سے محبت کرتا ہے اور یہ اس کی خوش نصیبی ہے کہ مدیحہ بھی اس کوے سے محبت کرتی ہے۔ لیکن میں اس کوے کی کالی کلوٹی بہن سے محبت نہیں کرتا ہوں۔ محبت تو دور کی بات میں اسے پسند تک نہیں کرتا پھر میں کس خوشی میں قربانی کا بکرا بنوں؟" بابو نے جواب دیا۔

"یہ رمضان ہی کی شرط ہے۔" زلفاں بیگم کے لبوں سے ادا ہونے والے ان الفاظ نے بابو کو حیرت کے دریا میں چھلانگ لگانے پر مجبور کر دیا۔

"کیا کہا ہے رمضان نے؟" اس نے غصے سے دریافت کیا اور جب زلفاں بیگم نے اسے رمضان کی شرط سے آگاہ کیا تو وہ جیسے سرتا پاؤں سلگ کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں کوئلے سے دہکنے لگے۔

"رمضان سے کہہ دینا بابو کو تیری شرط قطعی منظور نہیں ہے۔ اب تیری مرضی ہے تو مدیحہ سے شادی کر۔ یا۔ نہ کر۔ میں تیری بہن سے کسی قیمت پر شادی نہیں کروں گا۔" بابو اپنے فیصلہ سنا کر چلا گیا۔ زلفاں بیگم پریشان سی ہو کر رہ گئی۔

پھر ماں نے اسے پیار و محبت سے سمجھایا، نرمی برتی، سختی بھی کی، غصے کا اظہار بھی کیا اور ناراض بھی ہوئی یہاں تک اپنی زندگی ختم کر دینے کی دھمکیاں بھی دیں لیکن بابو کے انکار کو اقرار میں نہیں بدل سکی۔

زلفاں بیگم کو ساری فکر مدیحہ کی لاحق تھی جس کا عنقریب رمضان سے نکاح ہونے والا تھا۔ دونوں جانب سے نکاح کی تمام تر تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں صرف نکاح کے دن کا ہی انتظار تھا۔

"شاید میں نکاح میں شریک نہ ہو سکوں۔" ایک دن بابو نے بنا کسی وضاحت کے یہ دھماکہ خیز اعلان کیا۔ اس کے اس اعلان کا کسی پر اثر ہوا ہو یا نہیں عبداللہ اور زلفاں بیگم کے حواسوں پر تو بجلی سی گر پڑی اور انہیں جلا کر خاکستر کر گئی اور وہ کیونکر مطمئن رہ سکتے تھے؟ نکاح سے تین دن پہلے رمضان نے اچانک سے ایک نئی شرط پیش کر دی تھی۔

"جس دن میرا اور مدیحہ کا نکاح ہوگا۔ اسی دن ہمارے نکاح سے پہلے بابو اور ثریا کی منگنی کی رسم ادا کی جائے۔ ادھر بابو ثریا کی انگلی میں اپنے نام کی انگوٹھی پہنائے گا ادھر نکاح ہوتے ہی رخصتی عمل میں آ جائے گی۔ بصورت دیگر رخصتی عمل میں نہیں آئے گی اس وقت تک؟ جب تک کے بابو اور ثریا کی منگنی کی کوئی تاریخ نہیں دے دی جاتی۔"

جب زلفاں بیگم نے بابو کو رمضان کی خواہش سے آگاہ کیا تو ایسا لگا جیسے کسی نے اسے ہنٹر دے مارا ہو جس کی اذیت سے وہ پیا سے اونٹ

کی مانند بلبلا اٹھا۔

''ابھی تو شادی بھی نہیں ہوئی ہے اور وہ خبیث نئی نئی باتیں کئے جا رہا ہے۔ شادی کے بعد تو وہ ہماری بہن مدیحہ کا جینا دوبھر کر کے رکھ دے گا۔ اب بھی وقت ہے اس کے رشتے سے انکار کر دو، اس کی ساری اکڑ نکل کر رہ جائے گی۔ خود کو کہیں کا راج کمار سمجھ رہا ہے۔ ہماری مدیحہ بھی بے وقوف ہے جو اس کالے بھوت کے چکر میں جا پھنسی ہے۔'' وہ صرف تلملا کر رہ گیا۔

''میری ایک بات مان لے بیٹا۔ بہن کا گھر بسانے کے لئے یہ منگنی کر لے۔ ثریا اچھی لڑکی ہے۔ وہ تیری زندگی میں اجالا بکھیر کر رکھ دے گی۔'' زلفاں بیگم اسے ثریا کی خوبیاں گنواتی رہیں۔

''اونہہ! وہ کیا اجالا بکھیرے گی وہ تو خود ایک کالی سیاہ رات ہے۔'' اس نے چڑ کر جواب دیا اسے سانولی رنگت کی لڑکیاں قطعی پسند نہ تھیں۔

''مدیحہ کی خاطر کیا تو ثریا کو صرف اپنے نام کی انگوٹھی بھی پہنا نہیں سکتا ہے۔'' زلفاں بیگم نے روتے ہوئے کہا اور بے اختیار بابو کے قدموں میں جھک کر رہ گئیں۔

''یہ؟ یہ کیا کر رہی ہے ماں؟'' بابو ایک دم سے پیچھے ہٹ کر رہ گیا۔ اس نے کاندھے سے پکڑ کر زلفاں بیگم کو اپنے قدموں میں گرنے سے قبل تھام لیا اور یہ دیکھ کر اسے بے تحاشہ دکھ نے آن گھیرا کہ اس کی ماں کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ اس طرح بابو کے آگے جوڑ رکھے تھے جیسے خاموشی کی زبان میں بھی اس سے یہی کہہ رہی ہوں۔

''ثریا سے منگنی کر لے بیٹا۔ مدیحہ کا گھر بسانے کی خاطر۔'' اور آخر کار ماں کے آنسوؤں نے اس پتھر دل میں سوراخ کر ہی دیا۔

اور اس نے مجبوراً ایک سادہ سی تقریب میں کالی کلوٹی ثریا کو اپنے نام کی انگوٹھی پہنا کر اپنے نام سے اسے منسوب کر لیا۔ ظاہر ہے بابو اس زور زبردستی کے رشتے سے دل سے خوش نہیں تھا لیکن ثریا کی تو دیرینہ مراد بھر آئی تھیں۔

''ماں! منگنی تو میں نے کر لی ہے۔ لیکن پھر ثریا سے شادی کرنے پر مجبور مت کرنا کیونکہ میں ثریا سے شادی کسی قیمت پر نہیں کروں گا۔'' منگنی کے بعد اس نے زلفاں بیگم کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔

مدیحہ رخصت ہو کر اپنے گھر چلی گئی لیکن مدیحہ کے رخصت ہوتے ہی خوف کے زہریلے سانپ نے زلفاں بیگم کو اپنے گھیرے میں لے لئے اور اپنے زہریلے پن سے لحہ لحہ انہیں ڈس کر موت کی سی اذیت سے ہمکنار کرتے رہے، انہیں یہی خوف دامن گیر تھا کہ ''اگر بابو نے ثریا سے شادی نہیں کی تو ان کی مدیحہ کا کیا ہوگا؟ کیا رمضان بھی مدیحہ کو چھوڑ دے گا؟ کیا مدیحہ کی ہنستی بستی زندگی اجڑ کر رہ جائے گی؟ کیا بے قصور مدیحہ دو ضدی مردوں کی ضد کی بھینٹ چڑھ جائے گی؟'' ان سوالوں نے زلفاں بیگم کو اس قدر بوکھلا کر رکھ دیا کہ انہوں نے اپنے ترکش کا آخری تیر بھی چلانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ ہر مہینے یا پندرہ دن کے وقفے سے اپنی بیٹی مدیحہ سے ملنے گاؤں جاتیں تو واپسی پر چڑیا کو بھی اپنے ساتھ ہی لے آتیں۔

''مرد اس قسم کے نخرے کیا ہی کرتے ہیں لیکن عورت کو ہمت نہیں ہارنی چاہئے۔ بابو تیرا ہونے والا شوہر ہے اگر تو اس کی توجہ اپنی جانب کھینچنے میں کامیاب رہی تو سمجھ لے اپنی زندگی سنوار لی۔ میں اسی لئے تجھے شہر لے جا رہی ہوں تا کہ تو اس کے سامنے رہے گی تو آہستہ آہستہ اس کا دل

بھی تیری طرف مائل ہو جائے گا۔ تھوڑی بہت کوشش تو بھی کرتی رہنا، اس کے غصے وصے کی زیادہ پرواہ نہ کرنا۔" زلفاں بیگم نے پہلی بار اسے شہر لے کر آنے سے قبل دوران سفر پورے راستے ثریا کو یہی سمجھاتی رہیں۔ گاؤں کی وہ گوری، زلفاں بیگم کی ہر بات پر اقرار میں سر ہلاتی رہی۔

جانے کیوں زلفاں بیگم کے دل میں یہ امید سی تھی کہ ثریا کی قربت ایک نہ ایک دن بابو جیسے پتھر کو ضرور موم کرنے میں کامیاب رہے گی۔ بس ثریا کی رنگت ہی ذرا سانولی تھی، چہرے کے نقوش تو تیکھے تھے۔ آنکھیں بھی خوب صورت تھیں اور جسمانی لحاظ سے تو ایک طرح سے قیامت ڈھاتی تھی۔ آخر بابو بھی ایک جوان مرد تھا اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ثریا کی جوانی اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب نہ ہو سکے؟ نادان وناسمجھ بچہ آگ کی جانب بڑھنے کی کوشش تو کیا ہی کرتا ہے اگر کوئی نادان بچے کو روکنے یا پکڑنے کی کوشش نہ کرے تو وہ آگ کی جانب ہاتھ بڑھا ہی لیتا ہے ایسے میں اسے اپنے ہاتھ جل جانے یا وجود کے جھلس جانے کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔ زلفاں بیگم بھی اس بات سے اچھی طرح واقف تھیں کہ ان کا بابو ایک ویسا ہی نادان وناسمجھ بچہ تھا لیکن گھر میں آگ کا وجود نہ تھا اور اپنی دانست میں وہ "آگ" اپنے ہمراہ لئے جا رہی تھیں۔ وہ ایک ماں ہونے کے باوجود اس بات کی خواہش مند تھیں کہ ان کا بیٹا اس آگ کی جانب بڑھے اور نا صرف بڑھے جبکہ آگ کو چھو کر بھی دیکھے اور ایسا وہ اس لئے کرنے پر مجبور ہوگئیں تھیں کہ انہیں اپنی بیٹی کو اپنے گھر میں بستے ہوئے دیکھنے کی خواہش تھی۔

"اماں! وٹے سٹے کی شادیوں کے فائدے کا تو مجھے کچھ علم نہیں لیکن اس قسم کی شادیوں کا سب سے بڑا نقصان کسی ایک عورت کی ہستی کو تو پہنچتا ہی ہے۔" شادی کے بعد پہلی بار مدیحہ نے دکھ سے یہ بات اپنی ماں کے سامنے بیان کی۔

"کیا مطلب ہے تیرا؟" ماں کا دل دھڑک اٹھا۔

"مطلب یہ ہے اماں کہ وٹے سٹے کی شادی میں اگر ایک عورت کا گھر بس نہ سکے تو دوسری عورت کا بسا بسایا گھر اجڑ کر رہ جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اماں! ہر معاملے میں عورت کی ہستی ہی کیوں نشانہ بنتی ہے؟"

مدیحہ یہ کہہ کر ماں کے گلے سے لگ کر رونے لگی۔

بس یہی وہ لمحہ تھا جب بیٹی کے آنسو دیکھ کر زلفاں بیگم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ بابو کا دل جیتنے کے لئے ثریا کو اپنے ساتھ شہر لے جائیں گی۔

"چاہے وہ کیسی ہی بے زاری کا اظہار کرے۔ غصہ کرے یا تجھے باتیں سنائے تو پیچھے مت ہٹنا اور اس کا ہر کام بڑھ بڑھ کر کرنا۔ اب وہ اتنا بھی سخت دل نہیں ہے کہ تیری طرف بالکل توجہ ہی نہ دے اتنا سمجھ لے بیٹی کہ دو گھرانوں کی خوشیاں اب تیرے ہاتھ میں ہیں۔" زلفاں بیگم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ثریا کو دلہن کی طرح سجا کر بابو کے کمرے میں بند کرنے جیسا قدم بھی اٹھا لیتیں۔ انہوں نے گھٹاٹوپ اندھیرے میں تیر چلانے کی کوشش کی تھی۔

اور یہ بھی ممکن تھا کہ زلفاں بیگم کا اندھیرے میں چھوڑا ہوا تیر نشانے پر جا لگتا۔ کیونکہ ثریا نے بھی زلفاں بیگم کی ہدایات پر عمل پیرا ہو کر بابو کا دل جیتنے کی اپنی سی ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی اور اس سے پہلے کہ بابو کا دل واقعی ثریا کی جانب مائل ہو پاتا کہ ایک دم سے معصومہ کی ہستی درمیان میں آن کودی گویا زلفاں بیگم کو ایک نئے محاذ کا سامنہ درپیش آ گیا۔

معصومہ کے قیامت خیز حسن کا دیدار کرنے کے بعد بابو کے دل کے کسی کونے میں اگر ثریا کے لئے کبھی کوئی نرم گوشہ پیدا بھی ہوا تھا تو معصومہ کے قاتل حسن کے ایک ہی دیدار نے اس گوشہ زمین میں محبت کا بیج پھوٹنے سے قبل ہی اس بیج کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ بابو کی محبت کے ترازو کے پلڑوں میں ایک جانب ثریا کا وجود تھا تو دوسری جانب معصومہ آن بیٹھی تھی۔ معصومہ کا حسن بازی جیت گیا۔ ثریا کا وجود زمین بوس ہو کر رہ گیا اور معصومہ کا وجود زمین سے بلند ہو گیا۔

معصومہ کے حسن سے گھائل ہونے کے بعد بابو نے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے رہ کر اپنا سرتاپاؤں جائزہ لیا۔

کالے گھنگھریالے بال، روشن وکشادہ پیشانی، سرخی وسفیدی کا حسین امتزاج لئے پرکشش رنگت، ذہانت سے بھرپور بڑی بڑی براؤن رنگ کی آنکھیں، کھڑی ناک، خمیدہ لب، چیتے کی مانند چاق وچوبند پھرتیلا جسم اور چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد! اللہ تعالیٰ نے بابو کو بھی مردانہ حسن وجمال ایسے بھی بڑی فراخ دلی سے عطا کیے تھے وہ ہر لحاظ سے جنس مخالف کو گھائل کر دینے کی صلاحیتوں سے مالا مال تھا، یہ الگ بات ہے کہ اس نے اپنی حسن ووجاہت کا کبھی ناجائز فائدے اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ حسن ووجاہت کے علاوہ اس کا شاہانہ انداز اور قیمتی ملبوسات اسے کوئی امیر وکبیر ہستی ظاہر کرتے تھے اور اسی دھوکے میں کئی چالباز لڑکیوں نے اسے اپنے حسن واداؤں کے جال میں پھانسنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن کوئی بھی بڑی مچھلی اسے اپنی خوراک بنانے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔

صرف محلے میں رہنے والی لڑکیوں پر کیا منحصر؟ غیر محلے کی لڑکیاں بھی اس پر دل وجان سے فدا تھیں اور اس کے ایک اشارہ ابرو پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے پر بالکل تیار بیٹھی تھیں لیکن اس نے اپنے آپ کو شراب وشباب سے دور رہنے کا جو عہد کر رکھا تھا وہ عہد کئی حسین لڑکیوں کی پرکشش ''آفر'' کے باوجود اس کے ارادوں کی پختہ دیوار میں معمولی سی دراڑ بھی ڈالنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے عہد کی مضبوط زنجیروں میں اپنے پورے وجود کو اس بری طرح جکڑ رکھا تھا کہ کسی نازک ہاتھوں میں وہ جادو نہ تھا کہ اسے اس کے عہد کی ان مضبوط زنجیروں سے آزاد کر پاتے، یہی وجہ تھی کہ جب لڑکیوں نے یہ جان لیا کہ بابو جیسے مضبوط ارادے کے مالک مرد کو توڑنا یا جھکانا آسان کام نہیں ہے تو ہر لڑکی اپنی تمام کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد ہمت ہار کر پیچھے ہٹ گئی۔

''عورت کے معاملے میں اتنا سخت دل تو وہی مرد ہوتا ہے جو در اصل مرد ہی نہیں ہوتا۔''

کئی دل جلی حسیناؤں کی اپنے بارے میں یہ رائے سن کر اسے بجائے طیش آنے کے ہنسی آتی تھی۔

خود بابو کو بھی اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ اس کا دل! جس پر اسے بڑا غرور اور بہت مان تھا معصومہ کا ایک دیدار ہی اسے اس قدر پاگل کر ڈالے گا کہ وہ بابو کو دغا دے کر اس حسن کی دیوی کے قدموں میں جا گرے گا اور ماہئی بے آب کی مانند حسن کی ملکہ کے قدموں میں تڑپتا رہے گا۔ لیکن اس میں بابو کے دل کا کیا قصور؟ معصومہ کا معصوم حسن ہی گھائل کر کے رکھ دینے والا تھا۔

اس نے اپنے دماغ میں اپنی شریک حیات کی جو تصویر بنا کر اپنی نگاہوں کو سونپ دی تھی۔ معصومہ کو دیکھ کر اس کی نگاہیں اسی لئے ساکت وجامد ہو کر رہ گئیں۔ کہ معصومہ بابو کے خیالی پیکر کا جیتا جاگتا عکس تھی۔ اسی لئے بابو کے دماغ میں محبت کی گھنٹیاں بج اٹھیں اور دل بابو کے سینے سے نکل

کر معصومہ کے قدموں میں بچھ کر رہ گیا۔

حالانکہ بابو اچھی طرح جانتا تھا اور اسے اس بات کا احساس بھی تھا کہ معصومہ کو حاصل کرنا اس کے لئے اس قدر آسان نہ تھا بلکہ معصومہ کو پانا ایک مشکل ترین مرحلہ تھا، جسے بابو کو اپنی تمام تر ذہانت بروئے کار لا کر طے کرنا تھا اور خاص طور پر ایسی نازک صورت حال میں جبکہ مدیحہ کا گھر بسانے کے لئے اس کے ماں، باپ جبری اسے ثریا سے منسوب کر چکے تھے اور سب سے اہم بات! جس نے بابو کو سولی پر لٹکا رکھا تھا وہ یہ تھی کہ اسے معصومہ کے دلی جذبات کا کچھ علم نہ تھا یہ ضروری نہیں ہے جس طرح معصومہ کے معصوم و قاتل حسن نے بابو کے دل کو پہلی ہی نظر میں اپنی مٹھی میں کر لیا۔ معصومہ بھی اس کے لئے اتنی ہی بے چین و بے قرار ہو؟ اور اگر ایک لمحہ کے لئے یہ فرض کر لیا جائے کہ معصوم کے دل میں بھی اس کے لئے محبت کا جذبہ بیدار ہو چکا ہے یا اس کے دل میں اپنے لئے جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا تب بھی ایک اہم ترین نقطہ اس کے راستے کی بھاری رکاوٹ بن سکتا تھا اور وہ نقطہ! جانم کا پیشہ تھا۔

جانم کو یہ معاشرہ ایک جسم فروش عورت کے نام سے جانتا اور پہچانتا تھا۔ ایسی عورتوں کو ہمارے معاشرے میں کئی ایسے قابل اعتراض اور برے ناموں سے پکارا جاتا ہے جسے عام فہم زبان میں گندی گالیوں سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہی گندی گالیاں ایسی عورتوں کے نام ہوتے ہیں اور یہی نام ان کی پہچان ہوتے ہیں۔ ایسی عورتوں کو بیٹیوں کی شرافت اور پاکیزگی بھی لوگوں کی نگاہوں میں ہمیشہ مشکوک رہتی ہے، اسی وجہ سے کوئی بھی بینائی رکھنے والا انسان آنکھوں دیکھی مکھی نگل لینے کا حوصلہ اپنے اندر نہیں پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی عورتوں کی بیٹیاں پاکیزگی و شرافت کے لباس میں ڈھکی چھپی ہونے کے باوجود بھی شریف گھرانوں کی عزت نہیں بن پاتیں اور اگر بحالت مجبوری کوئی ایک بن بھی جاتی ہے تو اسے وہ عزت نہیں حاصل ہو پاتی جو اس کا حق ہوتا ہے۔

اگرچہ تاوقت بابو کی ہستی یکطرفہ محبت کی آگ میں بری طرح جھلس رہی تھی اور اسے تڑپائے دے رہی تھی لیکن جانے کیوں اسے یقین سا تھا کہ اس کی سلگتی ہوئی سچی محبت کے جذبات کی آنچ ایک دن معصومہ کے دل تک بھی ضرور پہنچے گی۔ ایک دن اس کی محبت کا بھی سورج طلوع ہو کر اس کے دل کی سرزمین پر اپنی روشنی اور حرارت بکھیر کر معصومہ کو بھی اس کی ہستی کی جانب کھینچ کر رہے گا اور بابو کو اسی دن کا شدت سے انتظار تھا۔

گزر جانے والا ایک ہفتہ کے شب و روز اور ان دنوں اور راتوں کا ایک، ایک لمحہ اس نے کس طرح بسر کیا بلکہ "کاٹا" یہ صرف اس کا دل ہی جانتا ہے۔

جب وہ معصومہ کے تصور سے کسی طور رہائی نہ پا سکا معصومہ کا خیال، اس کی قاتل ادائیں، معصوم صورت اور بے مثال حسین کسی آسیب کی مانند ہر لمحہ اس کے دل و دماغ سے چمٹا رہا تو وہ اپنی نگاہوں کی پیاس بجھانے دوبارہ جانم کے مکان کی چوکھٹ پار کرنے پر بے بس و مجبور ہو گیا۔

لیکن اس بار وہ خالی ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اگر وہ جانم کے لئے موتیوں کے پھولوں سے بنے کان کے بندے اور کلائیوں کے کڑے لایا تھا تو اپنی دل کی ملکہ! ملکہ حسن معصومہ کے لئے سونے کی ایک ایسی چین بطور خاص بنوا کر لایا تھا جس میں لاکٹ کی جگہ انگریزی حروف تہجی میں اس کے نام کے حروف کچھ اس انداز سے کندہ تھے کہ ایک نظر دیکھنے والا کبھی نہیں جان سکتا تھا کہ معصومہ کے گلے میں کسی کے نام کی زنجیر لٹک رہی ہے۔ بابو نے

سونے کی اپنے نام کی یہ زنجیر اس لئے بنوائی تھی کہ وہ معصومہ کے سینے پر صرف اپنا نام چمکتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا اور اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے اس نے اپنے ہفتہ بھر کی کمائی اس سونے کی زنجیر بنوانے پر صرف کر دی تھی۔

''میں جانتی تھی تم ضرور آ ؤ گے کیونکہ تمہارا انتظار میں نہیں معصومہ کر رہی تھی۔'' جانم کے لبوں سے ادا ہونے والے ان الفاظ نے بابو کو خوشیوں کا خزانہ سونپ دیا، اس نے موتیوں کے پھولوں سے بنے کانوں کے بندے اور کلائیوں کے کڑے جانم کو پیش کر دیئے جو اس نے ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ قبول کر لئے اس سے پہلے کہ بابو کی زبان متحرک ہو کر معصومہ کے بارے میں دریافت کر پاتی؟

''دیر لگی آنے میں تم کو، شکر ہے پھر بھی آئے تو
آس نے دل کا ساتھ نہ چھوڑا ویسے ہم گھبرائے تو''

یہ شعر پڑھتی ہوئی معصومہ کمرے میں داخل ہوئی، اس کی مترنم آواز سن کر بابو پھرکی کی مانند پیچھے کی سمت گھوم پڑا۔ گھومتے ہی اس نے دیکھا کہ معصومہ اپنے سڈول اور مخملیں شانے سے ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتی ہوئی اپنی مخصوص شان اور تمکنت سے اس کے سامنے کھڑی اسے اپنی حسین آنکھوں سے گھور رہی تھی، اس کے یاقوتی لبوں پر دلکش تبسم رقصاں تھا۔ بابو کو لگا جیسے اس کی نگاہوں کے سامنے کوئی کوندا سا لپکا ہو، وہ اپنی پیاسی نگاہوں کی پیاس بجھانے میں غرق سا ہو کر رہ گیا۔

''اتنے دن کہاں رہے؟ کیا لمحہ بھر کے لئے بھی ہماری یاد نہیں آئی؟'' معصومہ نے انتہائی معصومیت بھرے لہجے میں یہ سوال کر کے بابو کو خوشی سے دیوانہ کر کے رکھ دیا اور اس کی دیوانگی کی وجہ یہی تھی کہ معصومہ نے اس کی غیر حاضری کو شدت سے محسوس کیا تھا، نا صرف محسوس کیا تھا بلکہ اس کے دوبارہ آنے کی منتظر بھی پائی گئی۔ بابو کا دل چاہا کہ وہ کہہ دے کہ اس نے بھی ایک، ایک لمحہ جس کرب و اذیت میں کاٹا، وہ کرب الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس نے ایک لفظ بھی زبان سے ادا نہیں کیا اور اپنے لرزتے ہاتھوں سے سونے کی وہ چین جو اس نے اپنے اصل نام کے حروف کی بنوائی تھی معصومہ کی جانب بڑھا دی۔

''یہ۔ یہ کیا ہے؟'' معصومہ نے ڈبے کی جانب دیکھ کر حیرت سے دریافت کیا۔

''میری۔ میری طرف سے ایک چھوٹا سا تحفہ۔'' خدا جانے کیا بات تھی کہ معصومہ کے سامنے زبان لڑکھڑا کر رہ جاتی تھی سارا اعتماد غارت ہو کر رہ جاتا۔

''واہ! کتنی خوب صورت ہے یہ سونے کی زنجیر اور یہ نام؟'' معصومہ نے اپنی حسین آنکھوں میں سوال بھر کر بابو کے چہرے کی جانب دیکھا۔

''ارباب۔ میرا ہی نام ہے۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا حالانکہ اس سلسلے میں وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، معصومہ کو اپنے دل کی خواہش سے آگاہ کرنا چاہتا تھا لیکن زبان کی وہی لڑکھڑاہٹ اس کے اعتماد کو گہرے سمندر میں ڈبو گئی۔

''دیکھئے تو امی، بابو میرے لئے کس قدر خوب صورت سونے کی زنجیر بنوا کر لائے ہیں، اس زنجیر پر ان کا نام بھی سونے کے حروف ہی سے کندہ ہے۔'' معصومہ نے بچوں کی سی خوشی سے کہا اور جانم کو بابو کا دیا ہوا تحفہ دکھانے لگی۔ اس کے حسن بے مثال کی کرشمہ سازیاں بابو کو ایک ایسے

پرندے کا روپ دے گئی جو آسمان کی بلندیوں پر اڑے چلا جا رہا تھا۔

اس نے اپنی زندگی میں بے شمار حسین اور بے انتہا پرشباب لڑکیاں دیکھی تھیں لیکن کسی بھی لڑکی یا عورت کے حسن و شباب نے بابو کو ایسا متاثر کبھی نہیں کیا تھا جس طرح معصومہ کے حسن و شباب نے اس کے دل و دماغ پر اپنی گرفت جمائی تھی۔ اس کے حسن کے اچھوتے پن ہی نے بابو کے دل میں جذبہ محبت کو بیدار کیا تھا۔ معصومہ کے حسن و شباب کو دیکھنے کے بعد ہی اس کے دل نے یہ اعتراف کیا تھا کہ دنیا کا خالق واقعی ایک عظیم مصور ہے۔ جس نے اسے ایسے ہیرے تراش کر روئے زمین پر ہر سو بکھیر دیے تھے کہ جو بھی نظر ان تراشیدہ ہیروں کو دیکھتی بس دیکھتی ہی رہ جاتی۔ بلکہ دیکھنے والی آنکھوں کا پورا وجود مسحور ہو کر رہ جاتا۔ کچھ ایسا ہی سحر معصومہ کے حسن و شباب میں تھا کہ جو سیدھا بابو کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں جا کر پناہ گزیں ہو جاتا۔ وہ واقعی ایک جادوگرنی تھی۔ کالا یا سفلی عمل کرنے والی جادوگرنی نہیں بلکہ اپنے حسن سے سحر زدہ کر دینے والی حسن کی جادوگرنی۔

بابو کو تو اپنا کوئی ہوش تھا اور نہ ہی اپنے اردگرد کی کوئی خبر! وہ بت سا بنا، معصومہ کو تکتا رہ گیا۔

''اس کی کیا ضرورت تھی۔'' جانم نے اخلاقاً کہا جبکہ درحقیقت سونے کا تحفہ دیکھ کر وہ دل ہی دل میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی بلکہ اس نے غیر محسوس طور پر سونے کی چین کو ہتھیلی پر رکھ کر چین کی قیمت کا اندازہ بھی کر لیا تھا اور جانم کے اندازے کے مطابق چین کسی بھی طرح بیس ہزار روپے سے کم کی ہرگز نہ تھی۔

''بس یونہی لے آیا۔ دل نے کہا کہ کوئی تحفہ لے جانا چاہیے اسی لئے دل کی بات مان کر یہ معمولی سا تحفہ لے آیا۔'' بابو نے اٹک اٹک کر جواب دیا۔ بیس ہزار کی مالیت سے بنی اس سونے کی چین کو معمولی کہتے وقت اس کا دل جیسے ڈوب کر رہ گیا کیونکہ صرف وہی جانتا تھا کہ اس نے یہ بیس ہزار کی رقم اپنی کتنی ضرورتوں کا خون کر کے جمع کیے تھے لیکن معصومہ کے چہرے کی خوشی اور حسین آنکھوں میں پسندیدگی کے جذبات دیکھ کر اسے اپنی ضرورتوں کو مارنے کا جو تھوڑا بہت دکھ تھا وہ بھی ایک دم سے مٹ کر رہ گیا۔

جانم نے اس کی ظاہری شان و شوکت کو دیکھتے ہوئے پہلی ہی نظر میں بابو کو ایک صاحب حیثیت و دولت مند انسان کے طور پر پرکھ لیا تھا اور آج بابو نے بنا اپنی کسی ذاتی غرض یا فطری خواہش کے معصومہ کو ایک بیش قیمت تحفہ دے کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ جانم کا انتخاب قطعی غلط نہ تھا۔ بابو جیسے نوجوان جو اس کی معصومہ کے ایک ہی دیدار سے گھائل ہو کر رہ جاتے ہیں، جانم کو بے حد پسند تھے ایسے لڑکوں کی جیب سے نوٹوں کی گڈیاں نکلوانا جانم کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔

''کیا آج کھڑے کھڑے ہی ساری باتیں کرنے کا ارادہ ہے؟ بیٹھو گے نہیں۔'' جانم نے محبت کی چاشنی سے بھرپور لہجے میں کہا اور خالی صوفے کی جانب اشارہ کیا۔

''جی۔ جی ہاں۔'' اور اس سے پہلے کہ وہ خالی صوفے پر تشریف رکھ پاتا عین اسی لمحے اس کی شرٹ کی جیب میں رکھے موبائل کی سریلی بیل بج اٹھی۔ اس نے فوراً ہی جیب سے موبائل نکال کر موبائل کی اسکرین پر نگاہ دوڑائی۔ ''لٹو کالنگ'' کے الفاظ دیکھ کر اس نے او کے کا بٹن دبا کر موبائل اپنے کان سے لگا لیا۔

''ہاں بول۔'' اس نے دونوں ہستیوں سے نظریں چراتے ہوئے دھیمے لہجے میں دریافت کیا۔

''خان بابا نے ایمرجنسی میٹنگ کال کی ہے، تو جہاں کہیں بھی ہے فوراً پہنچ۔ میں اپنے آفس میں تیرا انتظار کر رہا ہوں۔ ذرا جلدی آنا۔''

لٹو کی بات سن کر وہ بری صورت بنا کر رہ گیا۔ اس نے موبائل آف کر کے دوبارہ جیب میں رکھا اور مسکراتے ہوئے جانم کی طرف دیکھا۔

''میں چلتا ہوں۔ پھر آؤں گا'' اس نے دل میں لٹو اور خان کو بیک وقت کوستے ہوئے بظاہر عام سے لب و لہجے میں کہا۔

''ارے ابھی تو تم آئے ہو۔ ابھی جانے کی بات کر رہے ہو؟ یہ کیا بات ہوئی؟'' جانم نے حیرت سے کہا۔

''ایک بے حد ضروری کام آن پڑا ہے میں پھر آ جاؤں گا۔'' بابو نے ایک نظر خاموش کھڑی معصومہ کی جانب دیکھا جو خفگی بھری نگاہوں سے اسے تکے جا رہی تھی۔

''پھر نہیں۔ آج رات کو۔ میں آپ کا انتظار کروں گی۔'' معصومہ نے ایک دم سے اپنی خواہش کا اظہار کر ڈالا۔ معصومہ کے لبوں سے یہ الفاظ سن کر اس نے مسکرا کر اقرار میں گردن ہلائی اور معصومہ کی حسین صورت کو نگاہوں میں جذب کرتے ہوئے جانے کے ارادے سے پلٹ گیا۔

خان بابا نے جو ایمرجنسی میٹنگ کال کی تھی اس میٹنگ کی خاص بات صرف ان نئے لڑکوں کو خبردار کرنا تھا جنہوں نے خان کے دہشت اور نام کا فائدہ اٹھا کر کچھ اپنے ذاتی مقاصد کے کام بھی نکلوائے تھے۔ خصوصاً اس نے بابو کو مخاطب کر کے یہ الفاظ ادا کیے تھے۔

''نہتوں، کمزوروں اور شریفوں کو خنجر دکھا کر گن پوائنٹ پر لوٹنا خان کی تربیت کا حصہ نہیں رہا ہے۔ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اگر آئندہ کسی نے ایسی کوئی اوچھی حرکت کی تو میں اپنا ہاتھ اس کے سر پر سے کھینچ لوں گا اور پولیس کو یہ خبر پہنچا دی جائے گی کہ فلاں بندہ اب ہمارا کارکن نہیں رہا۔ اس لئے اسے پکڑ کر پولیس جو سلوک کرنا چاہے کر سکتی ہے اور پولیس کی مہمان نوازی کے طریقے سے ہر شخص واقف ہے۔''

''خان بابا کے آخری الفاظ بابو کے دل کی دھڑکنوں کو منتشر کر گئے کیونکہ گزشتہ دس دنوں سے وہ بلا ناغہ رات کے وقت غریب اور نہتے راہگیروں کو خنجر دکھا کر انہیں لوٹنے کا فریضہ انجام دے رہا تھا اور وہ ایسا اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کر رہا تھا۔ اس کے دل نے ہی اسے معصومہ کو اپنے نام کی سونے کی زنجیر کا تحفہ دینے کے لئے اکسایا تھا۔ بیس ہزار کی رقم وہ کہاں سے لاتا اس لئے اس نے خنجر دکھا کر راہگیروں کو لوٹنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس نے تو اپنے طور پر بہت احتیاط سے کام لیا تھا۔ اس قدر احتیاط راز داری سے کہ اپنے جگری دوست لٹو کو بھی اپنی اس حرکت کی بھنک تک نہ پڑنے دی لیکن خدا جانے خان بابا کے علم میں یہ بات کیسے آ گئی؟ تاہم اس نے اسی لمحہ یہ سوچ لیا کہ اب وہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا جس کی وجہ سے اسے خان کے دست شفقت سے محروم ہونا پڑے۔

رات گیارہ بجے اس کے قدم ایک بار پھر از خود جانم کے مکان کی جانب بڑھنا شروع ہو گئے۔

''زہے نصیب کہ تم سا ملا ہے دوست ہمیں
ورنہ انتظار کی لذت سے بے خبر رہتے''

مکان سے اندر قدم رکھتے ہی معصومہ کی ترنم خیز آواز نے اس کا استقبال کیا۔ بابو نے دیکھا کہ صحن میں سجے ہوئے تمام موسیقی کے آلات

سازندوں کے ہاتھ میں تھے اور ناچ گانے کی محفل کا آغاز کیا جارہا تھا لیکن بابو کو کہیں بھی ان سازندوں کے لئے ان کے فن کا کوئی قدردان دکھائی نہ دے رہا تھا۔

''آج کی اس محفل کے مہمان خصوصی تم ہو۔'' جانم نے اس کے دل کی بات لبوں تک آنے سے قبل جواب دے کر اس کی الجھن دور کر ڈالی۔

وہ معصومہ کے چہرے، سراپے اور جسمانی نشیب و فراز کو تکتا ہوا ایک جگہ جا کر براجمان ہو گیا۔

''شروع کیجئے۔'' جانم نے سازندوں کو مخاطب ہی کیا تھا کہ تمام سازندے جواب تک بت سے بنے بیٹھے تھے اس طرح متحرک ہو گئے جیسے جانم کی آواز میں کوئی ایسا سحر پوشیدہ ہو جس نے ان پتلوں میں روح پھونک کر انہیں زندہ ہونے کا احساس دلایا ہو۔ تمام سازندوں کے ہاتھوں میں گردش جاگی اور وہ اپنے ساز بجانے لگے۔

جانم نے اپنی جادو کی آواز کا سر بکھیرا اور معصومہ نے اپنے خوب صورت اور نرم و نازک ہاتھوں کو رقص کے سے انداز میں حرکت دیتے ہوئے کلاسیکل رقص کا آغاز کیا۔ اس کے نازک بدن میں عجیب سی لچک تھی۔ وہ زاویے بدل کر اپنے شاخ گل بدن کو بل دیتی رہی۔ بابو دل تھام کر اسے اور اس کے دلکش رقص کو بنا پلک جھپکے اس طرح گھورے جا رہا تھا جیسے اس نے لمحہ بھر کے لئے بھی پلکوں کی چلمن گرانے کی حماقت کر ڈالی تو نگاہوں کے سامنے کا حسین منظر بدل کر رہ جائے گا۔ اس کی پسلیوں میں مقید ایک عدد دل معصومہ کے رقص سے اس طرح مچل اور تڑپ رہا تھا جیسے پسلیوں کی دیوار توڑتا ہوا باہر آن پڑے گا۔ اس کی سانسوں میں زیر و بم کی سی کیفیت بیدار ہو کر رہ گئی۔ معصومہ کا معصوم حسن، دلکش راپا، حسین آنکھوں میں بسی شوخی، یاقوتی لبوں پر سجا تبسم اور اس کے دل کا چین و قرار لوٹ لینے والی ادائیں بابو کے پورے وجود میں بے نام سی ایک ایسی آگ بھڑکا گئیں کہ اس کا شدت سے یہ دل چاہنے لگا کہ وہ اس قیامت کو اپنی باہنوں میں بھر لے جس کے دلکش رقص نے اس پر گویا جادو سا کر ڈالا تھا۔ سونے پر سہاگہ! جانم کی دلکش آواز نے کیا اگر موسیقی سات سروں کے سنگم کا نام ہے تو بلاشبہ جانم کی آواز میں سات سر بیک وقت اپنا رنگ دکھا رہے تھے۔ اس کی آواز کی دلفریبی ناقابل بیان تھی۔

اگر معصومہ کا رقص ایک جادو تھا تو جانم کی آواز بھی جادو ہی تھی اور رقص و آواز کے ان دونوں جادوؤں نے مل کر ایک ناقابل بیان وحشت اور بے نام سا اضطراب اس کی نس نس میں اتار کر رکھ دیا اور وہ مرغ بسمل کی مثال بن کر رہ گیا، اس کے دل پر بجلی سی گر پڑی، وہ جتنی دیر وہاں بیٹھا رہا ایک سرور آور سنسنی اس کے وجود کا طواف کرتی رہی۔

جانم نے ایک دم سے اپنا گیت تمام کر دیا۔ تمام ساز بھی رک سے گئے۔ جونہی بابو کو اپنے اطراف پھیلی خاموشی اور سناٹے کا احساس ہوا، وہ ایک دم سے ہوش میں آ گیا۔ ہوش میں آتے ہی بابو نے دیکھا کہ معصومہ اور جانم داد طلب نظروں سے اس کی جانب جانے کب سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ بری طرح ٹپٹا کر رہ گیا۔

''کیا میرا رقص پسند نہیں آیا؟'' معصومہ کے لہجے میں دکھ سا گھل کر رہ گیا۔

''نن نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ رقص بھی اچھا تھا اور آنٹے کا گایا ہوا گیت بھی۔'' بابو کہنا کچھ اور چاہتا تھا لیکن اس کے لبوں سے یہ

الفاظ ادا ہو کر رہ گئے۔

اس کے پیاس بجائے بجھنے کے مزید بھڑک اٹھی تھی وہ اگر ساری رات بھی اس بت ناز کے دلکش رقص اور جانم کے دلفریب گیت سے محظوظ ہوتا رہتا تب بھی اس کے ماہئی بے آب کی مانند تڑپتے دل کو سکون میسر نہ آیا۔ حالانکہ وہ رقص و نغمے کا کبھی شوقین نہیں رہا تھا لیکن معصومہ کا رقص اور جانم کے سریلے گیت نے اسے اس بری طرح گھائل کر کے رکھ دیا تھا کہ بابو کا وہاں سے اٹھ کر جانے کو دل راضی ہو کے نہیں دے رہا تھا۔

آج معصومہ نے مکمل طور پر اسے فتح کر لیا تھا اسی لئے وہ ایک فاتح حکمران کی سی شان سے فاتحانہ تبسم لبوں پر سجائے اسے گھورے جا رہی تھی۔

اور پھر بابو کو جیسے اپنے دل پر قابو تو پہلے بھی نہ تھا معصومہ کے جادوئی رقص نے جیسے مکمل طور پر بے بس کر کے رکھ دیا اور اب وہ لاکھ چاہنے کے باوجود اپنے قدموں کو جانم کے مکان کی سمت بڑھنے سے روک نہیں پاتا۔ اسے شدت سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی نادیدہ قوت کشاں کشاں اس کے وجود کو جانم کے مکان کی سمت کھینچے جا رہی ہو اور بابو جانتا تھا کہ وہ کشش معصومہ کے معصوم حسن کے علاوہ کوئی دوسری نہیں تھی۔ اس کے بے مثال حسن نے بابو کے دل میں ایسی آگ بھڑکا کر رکھ دی تھی جو ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی چلی جا رہی تھی اور بابو کے وجود کو جلا کر راکھ کیے دے رہی تھی۔

جانم نے اپنی ممتا کے پھول اس پر نچھاور کرنے شروع کر دیئے۔ اس نے بابو کو کچھ اس طرح اپنی محبت کے سنہرے جال میں پھانس لیا کہ خود بابو کو اپنے پھنسنے کا احساس تک نہیں ہونے پایا۔ وہ غیر محسوس طور پر جانم سے قریب اور اپنی سگی ماں زلفاں بیگم سے دور ہوتا چلا گیا۔

وہ جانم کی ذرا سی پریشانی پر تڑپ اٹھتا لیکن زلفاں بیگم کی کوئی تکلیف اسے دکھائی نہ دیتی تھی۔ اگر جانم کے سر میں معمولی سا درد بھی ہوتا تو وہ اس وقت تک ڈاکٹر کو جانم کے سرہانے سے اٹھ کر جانے نہیں دیتا جب تک کہ جانم کو سر کے درد سے نجات حاصل نہ ہو جاتی۔ اس کے برعکس زلفاں بیگم کا وجود اگر تیز بخار میں بھی جل رہا ہو تو دو گھڑی ماں کے سرہانے بیٹھ کر اس کی مزاج پرسی کرنا بابو کو گراں گزرتا، وہ ایک لمحہ بھی معصومہ کو دیکھے بغیر گزار دینے کے حق میں نہ تھا۔ زلفاں بیگم گزشتہ کئی دنوں سے اس سے نظر کی عینک لا کر دینے کا تقاضہ کیے جا رہی تھی۔ کیونکہ اس غریب کی پرانی عینک گر کر ٹوٹ چکی تھی اور بغیر عینک اسے صاف دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن بابو کے پاس نا تو اتنا فالتو وقت تھا کہ وہ ماں کے لئے نظر کی عینک لا سکتا اور نا ہی پیسے کہ وہ ماں کی ہتھیلی پر رکھ کر یہ کہہ سکے۔

''اماں! یہ پیسے رکھ لو اور اپنے لئے ابا کے ساتھ جا کر نئی عینک خرید لانا۔''

کیونکہ اگر وہ ماں کی ایک ضرورت پوری کرنے کی غلطی کر بیٹھتا تو ماں ہر روز ایک نئی ضرورت اس کے حضور پیش کرنے لگ جاتی اور صرف ماں کی ضرورتیں پوری کرنے میں اس کے ہزاروں روپے خرچ ہو جاتے اور وہ بے فضول ضرورتوں پر اپنی کمائی لٹانے کے حق میں نہ تھا۔

اس کے نزدیک معصومہ کو بیش قیمت تحائف اور ملبوسات دینا اس کی کمائی کا بہترین مصرف تھا۔ جانم کی چھوٹی بڑی ضرورتیں پوری کرنا بھی اس نے اپنی ذات پر فرض کر لیا تھا۔ گویا معصومہ اور جانم کی ضرورتوں میں الجھ کر وہ اپنی ماں اور بہنوں کی ضرورتوں اور خواہشوں سے منہ موڑتا چلا گیا۔

''مرغا چھری کی دھار تلے آ چکا ہے اب اسے صرف ذبح کرنا باقی ہے۔ لیکن یہ بات ہمارے اصول کے خلاف ہے کہ ہم ذبح کرنے سے

قبل مرنے والے کو تڑپائے بغیر مار ڈالیں۔ اب بابو کا جنون، اس کی تڑپ اس کا عشق یا اس کی دیوانگی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہ تمہیں دیکھے اور تم سے ملے بغیر رہ نہیں سکتا اور ہمیں اس کی اسی تڑپ کا فائدہ اٹھانا ہے۔ اب تم بابو کے سامنے بہت کم آیا کرو گی۔ بہت کم بلکہ انتہائی ضرورت محسوس کرو تو اس سے کلام کرنا۔ خاموشی اور آنسوؤں کو اپنا ہتھیار بنا لو پھر دیکھنا یہ لڑکا ہمارے لئے کیا گزرتا ہے۔"

جانم کی ہر بات نہایت توجہ اور انہماک سے سن کر معصومہ نے اپنے پلو سے باندھ لیا۔

بابو نے یہ بات شدت سے محسوس کی کہ معصومہ اب اس کے سامنے بہت کم آیا کرتی اور جب تک بابو اسے مخاطب نہ کرتا وہ خود سے مخاطب نہ کرتی اور بابو کے مخاطب کرنے پر بھی "ہوں ہاں" سے زیادہ بات نہیں کرتی۔ اس کی یہ بے رخی بابو کے دل کو تڑپا کر رکھ دیتی۔ اس کے دل پر گویا قیامت سی ٹوٹ پڑتی، اس نے کئی بار سوچا کہ وہ جانم سے دریافت کرے لیکن وہ لاکھ چاہنے کے باوجود جانم سے معصومہ کی بے رخی کے متعلق کوئی سوال ادا نہ کر سکا۔

ایک دن جب معصومہ نے جوس کا گلاس پیش کرتے ہوئے اپنی حسین اور لانبی پلکیں اٹھا کر نظر بھر کر بابو کی جانب دیکھا تو اس کی پرکشش آنکھوں کے کناروں پر ٹھہرا ہوا نمکین پانی دیکھ کر بابو اس طرح تڑپ اٹھا جیسے کسی نے اس کے دل میں نشتر پیوست کر ڈالا ہو۔ معصومہ کے ٹھہرے ہوئے آنسو نشتر ہی تو تھے۔ خدا جانے یہ اس کا وہم تھا یا حقیقت؟ اسے معصومہ کی سمندر جیسی گہری آنکھوں میں اداسی کی لہریں ٹھاٹھیں مارتی ہوئی دکھائی دیں۔ کتابی چہرہ نامعلوم غم کی منہ بولتی تصویر بنا ہوا تھا جس کی وجہ سے بابو کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔

"کیا ہوا معصومہ؟ تم اتنی چپ چپ اور اداس کیوں رہنے لگی؟" تنہائی پا کر بابو نے دریافت کیا لیکن وہ "کچھ بھی نہیں۔" کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

بابو کے لئے معصومہ کی ایک جھلک ہی بہت تھی وہ باقی لمحات اس کی اسی ایک جھلک کے تصور میں گم رہ کر گزار دیتا۔

جانم دانستہ بابو سے معصومہ ہی کی باتیں کئے جاتی کہ معصومہ کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند؟ معصومہ کی آئیڈیل شخصیت اس کا آئیڈیل گھر، لباس اور زیورات میں اس کی اولین پسند، یہاں تک کہ معصومہ کو کھانے اور مشروبات کس قسم کے پسند ہیں وہ مکمل طور پر بابو کو معصومہ کی پسند و ناپسند سے آگاہ کرتی۔

وہ نہایت توجہ اور انہماک سے جانم کے لبوں سے ادا ہونے والی معصومہ کے متعلق دلچسپ باتیں سنا کرتا۔ اسے معصومہ سے متعلق باتیں سننا اور کرنا بے حد پسند تھا، اس کے دل کی بھی یہی طلب تھی کہ جانم ہر وقت اس سے معصومہ ہی کی باتیں کرتی رہے اور اس کے لبوں پر بھی صرف معصومہ کا ذکر ہو کہ اب اس ذکر کے علاوہ اسے کسی دوسرے ذکر میں کوئی لطف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ بقول شاعر۔

"یا تیرا تذکرہ کرے ہر شخص
یا کوئی ہم سے گفتگو نہ کرے"

☆......☆......☆

بابو کسی سے چھپ کر یا نظریں بچا کر، چوری چوری یا رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر جانم کے گھر نہیں جاتا تھا، وہ تو ڈنکے کی چوٹ پر اور دن دہاڑے جانم کے مکان میں داخل ہوا کرتا۔ دسوں آنکھیں روزانہ اسے جانم کے مکان کی دہلیز کے اندر قدم رکھتے اور باہر نکلتے دیکھا کرتی تھیں۔ اسے کسی کا خوف نہیں تھا اور نا ہی وہ کسی سے ڈرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی اسے کسی نے سمجھانے کی کوشش کی اس نے سمجھانے والی ہستی کو تلخ جواب دے کر خاموش کر دیا۔

بابو کی صحبت بری سہی اس کے کام برے سہی لیکن وہ عبداللہ جیسے نیک آدمی کا بیٹا تھا اور عبداللہ کے دوست یار یہ قطعی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے دوست کا اکلوتا بیٹا جو کبھی عورتوں کے سائے سے بھی دور بھاگا کرتا تھا اب جانم جیسی تیز طرار اور زمانے کی عورت کے چنگل میں جا پھنسے۔ اس لئے جب بابو کو روکنے کی اس کی ہر کوشش ناکامی کی گود میں جا سوئی تو انہوں نے تھک ہار کر بابو کے باپ عبداللہ کو آگاہ کر دیا۔

''بہت خطرناک عورتیں ہیں۔ بابو جیسے کئی نوجوان لڑکوں کو پھانس رکھا ہے۔ اپنے بیٹے کو سمجھاؤ اور اس کے دم روکنے کی کوشش کرو ایسی عورتوں کے چکر میں آنے والے گھن چکر بن کر رہ جاتے ہیں۔ اللہ نے تمہیں صرف ایک ہی بیٹا دیا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی تمہارے ہاتھوں سے نکل جائے اور تم صرف کف افسوس ملتے رہ جاؤ۔'' اپنے دوستوں اور ہمدردوں کی زبانی یہ باتیں سن کر عبداللہ حیرت زدہ ہو کر رہ گیا۔ اسے کسی طور اس بات پر یقین آ کے نہیں دے رہا تھا کہ اس کا بابو کسی عورت کے چکر میں بھی آ سکتا ہے۔ اس معاملے میں تو اس کا دامن قطعی صاف تھا پھر اچانک سے اس کے دامن پر یہ بدبودار کیچڑ کیسے آن لگا؟ وہ ایسی گندگی کے قریب سے تو کیا دور سے بھی نہیں گزرا کرتا تھا پھر کب اور کیسے وہ اس گندگی میں گر پڑا!؟

جب اس سلسلے میں عبداللہ نے بابو سے دریافت کیا تو اس نے نہایت دیدہ دلیری، بے خوفی اور بے شرمی سے باپ کے سامنے اقرار کر لیا۔

''ہاں! میں معصومہ سے محبت کرتا ہوں۔'' بابو کا جواب عبداللہ کو دکھ کی گہری کھائی میں دھکیل گیا۔

''شاباش بیٹے شاباش! محبت بھی کی تو ایک طوائف زادی سے۔ ایک ناچنے گانے اور اپنا جسم بیچنے والی عورت کی بیٹی سے؟'' عبداللہ غصے سے کانپ کر رہ گیا۔

''معصومہ خود ایسی نہیں ہے۔ آنٹی بھی وہ برائی چھوڑ چکی ہیں۔'' بابو نے بھرپور لہجے میں ان کا دفاع کیا۔

''بہت خوب! اگر وہ عورتیں کوئی برا کام نہیں کرتیں تو آدھی رات کو بڑی بڑی کاروں میں جو رئیس زادے ان کے مکان کو رونق بخشنے آتے ہیں تو کیا تمہاری آنٹی اور اس کی بیٹی انہیں نماز و روزے کا درس دیا کرتی ہیں؟'' عبداللہ کا طنز بابو کو اس قدر گراں گزرا کہ وہ غصے سے بھرپور نگاہوں سے باپ کو گھور کر رہ گیا۔

''ناگن کبھی سیدھی نہیں رینگتی ہمیشہ بل کھاتی ہوئی چلتی ہے اور یہی خوبی ناگن کی بیٹی میں بھی پائی جاتی ہے۔ آئی سمجھ؟'' عبداللہ نے کہا۔

''آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ صاف صاف اور دو ٹوک بات کرو ابا۔ یہ اشاروں کی زبان میری سمجھ میں نہیں آتی۔'' بابو نے ناگواری سے بھرپور لہجے میں کہا۔

''دیکھ بابو! آج تک میں نے تیرے کسی معاملے میں کبھی اپنی ٹانگ نہیں اڑائی۔ تو نے بدنام زمانہ اسمگلر اور دہشت گرد خان کے ساتھ کام شروع کیا میں چپ رہا۔ تو نے اپنے ہی علاقے میں غنڈہ گردی اور لوٹ مار شروع کی میں نے اپنی زبان بند رکھی۔ تو نے غریب دکانداروں اور پھل فروشوں کا جینا حرام کر کے رکھ دیا میں نے پھر بھی لبوں پر چپ کی مہر لگائے رکھی لیکن تو کسی طوائف زادی کے چکر میں جا پھنسے اور اپنی زندگی برباد کر کے رکھ دے یہاں میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ آنکھوں دیکھی مکھی نگلنا کوئی آسان کام نہیں اور نا ہی میں ایسا کر سکتا ہوں۔'' عبداللہ لمحے بھر کے لئے رکا، بابو اس کی صورت تکتا رہا، جانم اور خاص طور پر معصومہ کی برائی اس کے صبر وضبط کا امتحان بنی ہوئی تھی۔ بابو یہ سوچ سوچ کر تلملا تا رہ گیا کہ اگر معصومہ کی شان میں گستاخی کرنے والی ہستی اس کے باپ کے علاوہ کسی اور کی ہوتی تو وہ اب تک اس کے چہرے کا تمام جغرافیہ بگاڑ چکا ہوتا۔

''آج تو میری ایک بات کان کھول کر سن لے تیری شادی صرف اور صرف ثریا سے ہوگی۔ اگر تو نے ہمارے اس فیصلے کے خلاف جانے کی کوشش کی تو؟ تجھے اس گھر سے اور ہماری زندگی سے ہر تعلق و ناطہ توڑ کر ہمیشہ کے لئے نکل جانا ہوگا۔'' عبداللہ نے اسے اپنے دوٹوک فیصلے سے آگاہ کیا اور کمرے سے نکل گیا۔ عبداللہ کے اس فیصلے پر وہ بے غیرتی سے مسکرا کر رہ گیا۔

اس نے کب کسی کی سنی تھی جو عبداللہ کی سنتا؟ اس نے نہایت سہولت سے عبداللہ کی ہر بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان کے راستے باہر دھکیل دی۔ وہ بدستور جانم کے گھر جاتا رہا، وہ اپنے قدم روکنے سے قاصر تھا کیونکہ معصومہ کے حسن کا جادو اس کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ معصومہ کے حسن و شباب کے فسوں نے اسے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔ وہ اس کے گہرے سمندر جیسی آنکھوں کی گہرائی میں اس طرح سرتا پاؤں ڈوب کر رہ گیا تھا کہ اس کے لئے سطح آب پر آنا آسان نہیں رہا تھا۔ اس کے رخساروں پر کھلتے گلاب نے بابو کو پاگل کر ڈالا تھا وہ چاہنے کے باوجود بھی اس کے حسن کے جال سے رہائی نہیں پا سکتا تھا۔ وہ معصومہ کے عشق کے سمندر میں ڈوبا غوطے پر غوطے کھائے جا رہا تھا اسے قطعی اس بات کی پرواہ نہ تھی کہ پانی کتنا گہرا ہے؟ یا پانی میں اٹھتی جذبات کی لہریں اس کے وجود کو غرق بھی کر سکتی ہیں؟ یا پھر اس کی حیات ناؤ کو کسی گمنام جزیرے میں پھینک بھی سکتی ہیں؟ وہ ہر غم اور ہر فکر سے بے خبر، مستقبل کے اندیشوں سے آزاد اپنے حال میں مسرور و شاداں نامعلوم منزل کی جانب بڑھے چلا جا رہا تھا۔

''کچھ معلوم ہے تمہیں؟ تمہارا بیٹا کیا گل کھلا رہا ہے؟'' ایک دن عبداللہ نے زلفاں بیگم کو مخاطب کر کے کہا۔ ''اب کیا کیا ہے۔ میرے بیٹے نے؟ تم تو ہر وقت اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر بلکہ نہا دھو کر پڑے رہتے ہو؟'' زلفاں بیگم کو اپنے شوہر سے بس یہی ایک شکایت تھی کہ وہ ہمیشہ بابو کے ہر کام کو اعتراض کی نگاہ سے دیکھا کرتے اور اس کے ہر کام میں سو عیب نکال کر اس کا دل توڑنے کا فریضہ ایک تسلسل سے انجام دیئے جا رہے تھے۔

''اری نیک بخت! اس کا یہ کارنامہ تم سنو گی تو اپنا سر دیواروں سے ٹکرانا شروع کر دو گی؟''

''اب اس طرح کہہ کر میرا دل تو نہ ہلاؤ۔ بتا دو کیا بات ہے؟'' زلفاں بیگم پریشان ہو اٹھی۔

اور جب عبداللہ نے اسے طوائف زادی معصومہ اور بابو کے درمیان چلنے والے محبت کے چکر سے آگاہ کیا تو وہ غریب عورت اپنی چھاتی پیٹ کر رہ گئی۔

''میرا بابو ایسا نہیں ہے۔ اس نے کبھی کسی شریف لڑکی کی طرف دیکھا تک نہیں۔ تو وہ بری عورت کی بیٹی کے عشق میں کیسے مبتلا ہو سکتا ہے؟

یقیناً ان چالباز عورتوں نے میرے بابو پر کوئی جادو وغیرہ کیا ہوگا ورنہ میرا بابو کیسے کسی اندھے کنویں میں چھلانگ لگا سکتا ہے؟'' زلفاں بیگم کا دل اپنے بابو کو قصوروار ماننے کو کسی طور تیار ہو کے نہ دیتا تھا۔

''اری کم عقل عورت! چاہے جادو کے زور پر سہی انہوں نے تمہارے بابو کو اپنے دام میں پھانس لیا ہے اب سوچنا یہ ہے کہ اب بابو کو ان بری عورتوں کے چنگل سے کیسے رہائی دلا سکتے ہیں؟ یہاں مسئلہ صرف بابو کی زندگی بچانے کا نہیں مدیحہ کی خوشیاں بھی بکھرنے سے بچانے کا ہے۔''

عداللہ کی اس بات نے زلفاں بیگم کو دکھوں کی سلگتی ہوئی بھٹی میں جھونک دیا۔اس کے تصور میں اجڑی ہوئی اور روتی بلکتی مدیحہ کا سراپا گھوم کر رہ گیا اور اس کا دل بری طرح کانپ کر رہ گیا۔

''یا اللہ میری مدیحہ کی خوشیاں قائم رکھنا، میری بچی کی زندگی میں کبھی کوئی دکھ نہ آئے۔'' وہ دل کی گہرائیوں سے کہہ اٹھی۔

جب دیوار گیر گھڑی نے شب کے دو بجنے کا اعلان کیا تو چند منٹوں بعد بابو نے گھر میں قدم رکھا۔اس کے ارادہ اپنے آرام دہ پلنگ پر گرتے ہی لمبی تان کے سونے کا تھا لیکن اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی زلفاں بیگم کو اپنے کمرے میں بے چینی سے اپنا منتظر پا کر وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔اس سے پہلے وہ ماں سے اتنی رات گئے تک جاگنے کی وجہ سے دریافت کر پاتا اسے سامنے پا کر زلفاں بیگم تیر کی مانند سنسناتی ہوئی اس کی جانب بڑھی۔بابو کے قریب پہنچ کر زلفاں بیگم نے بھیگی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا۔بے اختیار اس نے اپنے دونوں ہاتھ بابو کے آگے جوڑ دیئے اور ایک دم سے ان کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے۔

''کیا ہوا اماں؟ کیا بات ہے؟ تو رو کیوں رہی ہے؟ اور اور یہ تو نے میرے آگے ہاتھ کیوں جوڑ رکھے ہیں؟ آخر بات کیا ہے؟'' بابو نے حیرت و استعجاب سے دریافت کیا۔

''مدیحہ کی ہنستی بستی زندگی کی خوشیاں اب تیرے ہاتھ میں ہے۔یاد رکھ! اگر تو نے ثریا سے شادی نہیں کی تو تیری بہن کا ہنستا بستا گھر بھی اجڑ کر رہ جائے گا۔'' زلفاں بیگم کے لبوں سے وہی پرانی بات سن کر وہ گہرا سانس خارج کر کے رہ گیا اسے یہ بات سمجھنے میں قطعی دیر نہ لگی کہ اس کی ماں کے علم میں معصومہ اور اس کی محبت کی کہانی آ چکی ہے اسے یہ سوچ کر گہرے دکھ نے آن گھیرا کہ اس کی ماں کو بیٹی کی خوشیاں کس قدر عزیز تھیں کہ بیٹی کی خوشیوں کی خاطر وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی خوشیوں کا گلا دبانے کے لئے تیار بیٹھی تھی اور مسلسل بیٹے کو قربانی کا بکرا بننے پر مجبور کیے جا رہی تھی لیکن بابو نے بھی اپنے دل میں یہ پختہ ارادہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنی زندگی اپنی مرضی سے جئے گا اور کسی کی خاطر اپنی زندگی کی خوشیاں قربان نہیں کرے گا کیونکہ زندگی اور جوانی بار بار حاصل نہیں ہوا کرتی۔

''اماں! مجھے بہت نیند آ رہی ہے صبح بات کریں گے۔'' اس نے بے زاری سے کہا اور ماں کے قریب سے گزرتا ہوا اپنے پلنگ پر جا کر لیٹ گیا اس نے یہ تک دیکھنے کی زحمت گوارہ نہ کی کہ زلفاں بیگم کھڑی ہیں یا جا چکی ہیں؟ ماں کو تسلی بھرے دو لفظ کہنا تو دور کی بات رہی۔

زلفاں بیگم کے آنسو اور التجاؤں نے اس پتھر پر کوئی اثر نہیں ڈالا اس لمحے وہ قطعی خود غرض بن کر سوچ رہا تھا اس نے اپنی آنکھوں پر خود غرضی کی گہری سیاہ پٹی باندھ لی تھی اسی لئے اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا اور نا ہی کچھ سنائی دے رہا تھا۔ ناماں کی آنسو بھری التجائیں اس پر اثر

انداز ہو رہی تھیں اور نا ہی، بہن کی بر باد زندگی دکھائی دے رہی تھی اور ثریا کے دل کا درد تو محسوس کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نے اپنی زندگی کا نصب العین صرف معصومہ کا حصول بنا رکھا تھا وہ ہر حال میں اور کسی بھی قیمت پر صرف اس حسن کی جیتی جاگتی مورت کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا خواہش مند تھا۔

''آج سے تیری غنڈہ گردی بند! میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ تجھے خان کی نوکری۔ جو نوکری کم اور دہشت گردی زیادہ ہے چھوڑنی پڑے گی اور کسی اچھی جگہ نوکری کرنی پڑے گی۔'' عبداللہ نے اس کی بڑھتی ہوئی بے باکی دیکھ کر ایک سخت گیر باپ کا روپ اختیار کر لیا۔ ایسا کرنا اس لئے بھی ضروری تھا کہ وہ بابو کے اندر سے ایک قطعی خود غرض انسان کو بیدار ہوتے یا باہر آتے دیکھ رہا تھا۔

''مثلاً کون سی اچھی جگہ؟'' بابو نے سپاٹ چہرے کے ساتھ یونہی پوچھ لیا۔

''میرا ایک دوست رحیم ہے۔ اس کی ایک بہت بڑی دکان ہے۔ ہر قسم کے چاولوں کا بہت بڑا بیوپاری ہے۔ اسے اپنی دکان سنبھالنے کے لئے ایک پڑھے لکھے لڑکے کی ضرورت ہے۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ میرا بیٹا آ جایا کرے گا۔ فی الحال صرف چار ہزار روپے ماہوار کی بات ہوئی ہے۔ لیکن اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ بعد میں۔ یہی کوئی چھ مہینے سال بعد تنخواہ میں اضافہ کر دیگا۔ کل صبح نو بجے تو اس کے پاس چلے جانا باقی باتیں اور کام وہ خود تمہیں سمجھا دے گا۔'' عبداللہ نے اسے حکم سنا دیا۔

بابو نے باپ کو ٹالنے کے لئے بنا کچھ کہے اقرار میں گردن ہلا کر اپنی دانست میں ایک بڑی مصیبت ٹال دی لیکن وہ یہ بات نہیں جانتا کہ عبداللہ کا شمار آسانی سے ٹل جانے والی ہستی میں نہیں ہوتا تھا۔

نصف شب جانم کے ہاں گزار کر جب وہ نیند سے بوجھل وجود لئے اپنے بستر پر آن کر گرا اور گرتے ہی گہری نیند کی آغوش میں جا سویا تو صرف چند ہی گھنٹوں بعد عبداللہ کسی جن کی طرح اس کے سر پر آن کھڑا ہوا اور اسے اس بری طرح جھنجھوڑ کر بیدار کرنے لگا جیسے وہ سویا ہوا نہیں بلکہ مرا پڑا ہو ویسے اس پر نیند کی گرفت دیکھ کر ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ مردوں سے شرط لگا کر سویا ہو کہ دیکھیں پہلے کون بیدار ہوتا ہے؟ اور عین ممکن ہے کہ مردے شرط ہار جاتے اگر عبداللہ پانی سے بھرا جگ لا کر جگ کا تمام پانی اس کے چہرے پر انڈیل کر اسے ہڑبڑا کر اٹھنے پر مجبور نہ کر دیتا۔

''کیا مصیبت ہے؟ تم کو معلوم بھی ہے ابا کہ میں پوری رات کا جاگا ہوا ابھی دو چار گھنٹے قبل ہی آن کر سویا تھا کہ تم نے اتنی صبح مجھے جگا دیا آخر بات کیا ہے؟'' وہ غصے سے بری طرح کھول اٹھا۔

''پوری رات جاگ کر تم نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے؟ کیا مسجد میں بیٹھ کر نفلیں ادا کی ہیں؟ یا غریبوں کے دکھ بانٹتے رہے ہو؟ کیا مجھے نہیں معلوم کہ تم پوری رات کہاں تھے؟ اسی ماں بیٹی کے قدموں میں بیٹھے ان کے تلوے چاٹ رہے تھے۔'' عبداللہ نے بے حد غصے اور نفرت سے کہا۔

''ابا'' عبداللہ کی یہ بات اسے سرتاپا سلگا گئی اس نے باپ کو غصے سے بھری ہوئی نگاہوں سے گھور کر دیکھا۔

''دیکھ بے حیا کس طرح دیدے پھاڑے باپ کو گھور رہا ہے۔'' غصے کے باعث عبداللہ کا بوڑھا وجود بری طرح کانپ کر رہ گیا۔

''ابا آج میں تمہیں آخری بار خبردار کر رہا ہوں کہ اپنے لب و لہجے اور لفظوں پر قابو رکھ کر مجھ سے بات کرنا۔ اگر میں نے اپنا لب و لہجہ بدل

کر بات کرنا شروع کر دی تو تم بہت پچھتاؤ گے۔''

بابو نے چوٹ کھائے ناگ کی مانند زہریلی پھنکار خارج کی چند لمحوں تک عبداللہ کی حیرت و غیر یقینی ساکت ہو جانے والی آنکھوں کی پتلیوں میں اپنی انگارے برساتی پتلیاں پیوست کئے دیکھتا رہا اور پھر اگلے ہی لمحے چادر پھینک کر پلنگ سے اتر کر غسل خانے میں جا گھسا۔

بابو کے بدلتے انداز پر عبداللہ بدستور غریق حیرت کھڑا غسل خانے کے بند دروازے کی جانب تکتا رہ گیا۔

بابو نے نہا کر بلیک جینز کی پتلون پر پیلے رنگ کی ہاف آستین کی چست جرسی زیب تن کی، پیروں میں جوگرز ڈالے اور کلائی پر قیمتی گھڑی سجا کر اپنے کمرے سے باہر نکلا۔

''جا رہا ہوں ماں۔'' اس نے صرف زلفاں بیگم کو مخاطب کیا۔ اس کے لہجے میں خفگی بول رہی تھی۔

''اس سے کہو اگر سیٹھ رحیم دکان پر موجود نہ ہو تو تھوڑی دیر اس کے آنے کا وہیں بیٹھ کر انتظار کر لے۔ سیٹھ لوگوں کو آنے میں تھوڑی بہت دیر سویر ہو جایا کرتی ہے۔'' عبداللہ نے بھی زلفاں بیگم کی جانب دیکھ کر کہا اگر چہ اس کا مقصد بابو کو سنانا ہی تھا۔ بابو نے باپ کی بات سنی اس کے لبوں پر حقارت آمیز مسکراہٹ ابھری اور لمبے ڈگ میں دروازے کی چوکھٹ عبور کر گیا۔

عبداللہ کا یہ خیال تھا کہ شاید بابو اس کا حکم مان کر سیٹھ رحیم سے ملنے گیا ہے لیکن یہ عبداللہ کی خام خیالی تھی بابو کے قدم مخصوص راستوں کو روندتے ہوئے جانم کے مکان کے دروازے پر آن کر رک گئے اب تو یہ مکان اور اس میں رہنے والے مکین بابو کو اپنی منزل دکھائی دیتے تھے اس کے قدم از خود اپنی اسی منزل کی جانب کھنچے چلے آتے تھے۔ اس کا چین و سکون سب جانم کی آنچل کے چھاؤں تلے پوشیدہ تھا اور اس کا وہ چین و سکون معصومہ کی ہستی تھی وہ بنا اجازت مکان میں داخل ہو گیا۔

''بہت چپ چپ دکھائی دے رہے ہو کیا بات ہے؟'' جانم نے پیار سے اس کے بالوں سے مخروطی انگلیاں پھیرتے ہوئے اس قدر محبت و اپنائیت سے دریافت کیا کہ اس کا سارا غصہ جھاگ کی مانند بیٹھتا چلا گیا۔ جانم کا یہی ممتا بھرا انداز تو اسے بہت پسند تھا بلکہ یہی انداز بابو کو بے بس کر کے رکھ دیتا تھا۔ جانم کی خوبی یا اس کی محبت کی خاص بات یہی تھی کہ وہ بابو کے جذبات و احساسات کو سمجھ کر اس کی اداسی دور کرنے کی کوشش کیا کرتی تھی اس کے برعکس زلفاں بیگم تھیں جس کی زبان پر ہر وقت ہر لمحہ مدیحہ کی خوشی و غم کی باتیں ہوا کرتی تھیں اور جس نے سگی ماں ہونے کے باوجود یہ جاننے کی کبھی کوشش نہ کی کہ بابو کے دل میں کیا ہے؟ بابو کیا چاہتا ہے؟ وہ تو بس یہی چاہتے تھے کہ بابو اپنے دل کی ہر آرزو کا خون کر کے، ہر خواہش کا گلا دبا کر اور اپنے تمام جذبات کو موت کی نیند سلا کر صرف بہنوں کی خوشیوں کی خاطر جئے۔ بہنوں کے دامن خوشیوں کے پھولوں سے بھرنے کے لئے چاہے اپنے دامن میں کانٹے بھی بھر لے تو کوئی مضائقہ نہیں کہ بھائی ہوتے ہی اس لئے ہیں کہ بہنوں کی خوشیوں پر قربان ہو سکیں۔

جانم کی محبت دیکھ کر بابو کا دل اس قدر بھر آیا کہ اس نے اپنی ہستی سے عبداللہ کے تلخ رویے، ماں کا صرف بیٹیوں کی خوشی کے بارے میں سوچنا اور بہنوں کا کھنچے کھنچے رہنا سب کچھ من و عن بیان کر ڈالا صرف ثریا سے اپنی منگنی کی بات یہ سوچ کر گول کر گیا کہ کہیں اس کی منگنی کا سن کر جانم اور معصومہ بھی اس سے کھنچ کر نہ رہ جائیں جو اسے کسی صورت گوارہ نہ تھا کیونکہ معصومہ تو اس کے جسم میں روح کی مانند جا بستی تھی اور بنا روح کے جسم

بیکار ہوتا ہے بلکہ مردار کہلاتا ہے۔

''تمہاری تمام باتیں میں نے نہایت توجہ واطمینان سے سنی اور مجھے یہ جان کر گہرا دکھ پہنچا ہے کہ تمہارے گھر والے تمہاری کوشی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ تم سے خوشیوں کے طالب ہیں۔لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ تمہارے ساتھ اس قدر تلخ رویہ اپنائے رکھنے کی کوئی وجہ تو ہوگی؟ کوئی یونہی تو بلاوجہ کسی سے تلخی وترشی سے پیش نہیں آتا۔'' جانم نے اپنی کھوجتی نگاہیں اس کے چہرے پر لٹکادیں جبکہ جانم کے سوال نے اسے سٹپٹا کر رکھ دیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ وہ جانم کے اس سوال کا کیا جواب؟ آیا جانم کو سچائی سے آگاہ کرتے ہوئے ثریا کے بارے میں بتادے؟ یا جھوٹ کا ہاتھ تھام کر کوئی بھی من گھڑت کہانی سنا کر جانم کی ہمدردیاں حاصل کرے؟ ابھی وہ اپنے دل میں کوئی فیصلہ بھی نہیں کر پایا تھا کہ جانم کی آواز نے اس کی سوچوں کے ذرات کو بکھیر کر رکھ دیا۔ایک دم سے منتشر کرڈالا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟ کیا میں نے کوئی ایسا سوال کرڈالا ہے جس کا جواب دینے سے تمہارے دل کو چوٹ پہنچتی ہے؟ یا تمہارا کوئی زخم پھر ہرا ہوکر رہ جاتا ہے؟ اگر ایسی بات ہے تو مجھے اپنے سوال کا جواب نہیں چاہئے میں تمہیں خوش دیکھنا زیادہ پسند کرتی ہوں۔اداسی تم پر اچھی نہیں لگتی تم ہنستے مسکراتے ہوئے زیادہ اچھے لگتے ہو۔'' جانم کی یہ بات سن کر بابو نے خود کو دل ہی دل میں کوسا اور سچ بولنے کا فیصلہ کرلیا وہ جنم سے جھوٹ بول کر ایک مخلص ہستی سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔

''وجہ۔وجہ میرے چچا کی بیٹی ہے۔ثریا نام ہے اس کا۔اماں ابا نے میری مرضی معلوم کئے بغیر میرے چچا سعد اللہ کی بیٹی ثریا سے میرا رشتہ طے کردیا تھا۔اس رشتے میں میری پسند قطعی شامل نہیں۔ پسند تو کیا میری رضا بھی نہیں لی گئی اور وٹے سٹے کے چکر میں مجھے پھانس لیا گیا۔اب صورت حال یہ ہے کہ میری سب سے بڑی بہن مدیحہ ثریا کے بھائی رمضان سے بیاہ دی گئی ہے۔ویسے تو وہ اپنے گھر میں بہت خوش اور مطمئن ہے لیکن آئندہ بھی وہ اسی طرح اپنے گھر میں خوش و مطمئن رہے اس بات سے مشروط ہے کہ میں ثریا سے شادی کرکے اسے بھی بے شمار خوشیاں دوں اور ثریا کی خوشیاں میری محبت وتوجہ میں پوشیدہ ہے جو میں اسے نہیں دے سکتا۔'' بابو نے بے خوف سچائی اگل دی۔

''کیوں؟ تم ثریا کو اپنی محبت اور توجہ کیوں نہیں دے سکتے؟'' جانم نے اس کی تمام باتیں پوری توجہ وانہماک سے سنیں اور آخر میں ایک ایسا سوال کرڈالا جس نے بابو کو اپنے دل کی بات عیاں کرنے کا سنہرا موقع عنایت فرمایا۔

''وہ مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔ مجھے وہ کالی کلوٹی بہت زہر لگتی ہے بلکہ مجھے اس کی ہستی۔اس کے وجود سے ہی نفرت محسوس ہوتی ہے۔'' بابو کے لہجے میں بسی اور لفظوں سے عیاں ہوتی نفرت جانم کو اس کی بادامی آنکھوں میں رقص کرتی دکھائی دینے لگی۔

''اس لڑکی سے اس قدر نفرت کی وجہ کیا صرف یہی ہے کہ وہ بہت کالی ہے؟ یا اس بات کی آڑ لے کر تم کسی اور وجہ سے اس کی ہستی سے اس قدر نفرت کرتے ہو؟'' جانم نے غور سے اس کی جانب دیکھ کر دریافت کیا۔

''بات دراصل یہ ہے کہ میں کسی اور سے محبت کرنے لگا ہوں اور ثریا کا وجود مجھے اپنی محبت کی راہ میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ لگتا ہے۔'' بابو نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''اوہ! تو یہ بات ہے۔'' جانم کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ آن ٹھہری۔

''کیا مجھے نہیں بتاؤ گے وہ خوش نصیب لڑکی کون ہے؟ جو تمہارے دل کی ملکہ بن بیٹھی ہے؟'' جانم کی بات پر ایک بار پھر اس کے دل کی دھڑکنیں اپنے معمول کی رفتار سے تیز دوڑنے لگیں۔ شرم اور جھجک نے اس کے چہرے کا گھیراؤ کر لیا اس نے اپنی ہمت یکجا کی اور گردن جھکا کر ڈرتے ڈرتے بمشکل کہا۔

''مم مجھے۔ مجھے معصومہ سے محبت ہوگئی ہے۔''



خوشی اس کے چہرے سے پھوٹے پڑ رہی تھی۔ یہ خوشی کی انتہائی زیادتی کا ہی نتیجہ تھا کہ اس کے پاؤں زمین پر ٹک کر نہیں دے رہے تھے۔ وہ خود کو کسی پرندے کی مانند آسمان کی بلندیوں کی جانب اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اس کا شدت سے یہ دل چاہ رہا تھا کہ وہ خوب دل کھول کر ہنسے۔ اس قدر بلند وبانگ قہقہے لگائے کہ ہر شخص اس حقیقت کو پالے کہ بابو آج بہت خوش ہے اور اس کے دل کی خوشی کوئی معمولی خوشی نہیں تھی۔ اس کے لئے تو یہ خوشی دنیا کی ہر خوشی سے بڑھ کر تھی اگر کوئی اس کے دامن میں قارون کے پوشیدہ خزانے بھی انڈیل کر رکھ دیتا تو اسے اتنی مسرت نہیں ہوتی جتنی جانم کے ان الفاظوں کو سن کر حاصل ہوئی۔

''گویا دونوں طرف ہے، آگ برابر لگی ہوئی ہے۔'' یہ مصرعہ جانم نے ابو کے لبوں سے معصومہ کی ہستی سے محبت ہو جانے کا سن کر جواب ادا کیا تھا۔

''کیا مطلب؟'' بابو نے اپنے دل کی تسلی کے لئے دریافت کیا تو جواباً مسکرا کر جانم نے کہا۔

''مطلب یہ کہ معصومہ کو بھی تم سے محبت ہوگئی ہے وہ بھی ہر وقت۔ ہر لمحہ تمہاری محبت کا دم بھرتی رہتی ہے۔ اس کی دیوانگی کی کیا کہوں؟ شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرتا ہو جو تمہارے ذکر سے خالی ہو اس کے لبوں پر ہر وقت تمہارا نام رہتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میری بیٹی کا انتخاب غلط نہیں ہے۔''

بابو کے لئے یہ اطلاع حیران کن ہی نہیں بے حد مسرت افزا بھی تھی وہ دم بخود سا بیٹھا جانم کے لبوں سے ادا ہونے والے یہ پھول سے الفاظ سنتا رہا اس لمحے اس کا یہی دل چاہ رہا تھا کہ جانم بولتی رہے اور وہ یونہی بیٹھا سنتا رہے۔

بابو سوچ رہا تھا کہ یہ ''الفاظ'' بھی قدرت کا کس قدر انمول تحفہ ہے اگر ان الفاظ میں محبت کے سر بول رہے ہوں تو کانوں کو کس قدر بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ گویا دلوں کو جیت لیتے ہیں۔ فتح کر لیتے ہیں اور اگر یہی لفظ نفرت کی ترجمانی کر رہے ہوں تو ساعتوں کو کس قدر گراں گزرتے ہیں۔ گویا زہر میں بجھے تیر کی مانند اس طرح جا کر دل میں پیوست ہو کر رہ جاتے ہیں کہ بندے کا جسم ہی نہیں روح بھی تڑپ اٹھتی ہے۔

جانم کے محبت بھرے جادوئی لفظوں نے بابو کے ذہن پر چھائے عبداللہ کے تلخ لفظوں کے زہریلے اثر کا اس طرح خاتمہ کر کے رکھ دیا جیسے اس کے دماغ کی سلیٹ پر اسے کوئی لفظ تحریر ہی نہ کئے گئے ہوں۔

''اماں! کھانا لے آؤ بہت بھوک لگی ہے۔'' گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے اچانک آواز لگائی اور صحن کے وسط میں بچھی چارپائی پر اس طرح اپنے وجود کو پھینک دیا جیسے تھکن کی زیادتی سے اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہو۔ یا چور چور ہو رہا ہو ویسے دیکھا جائے و یہی سچائی بھی تھی جب سے اس کے دل میں معصومہ کی محبت نے اپنے پنجے گاڑے تھے اس کی بھوک و پیاس مٹ کر رہ گئی تھی وہ برائے نام ہی کھانا کھاتا اور پیاس تو صرف معصومہ کے معصوم حسن کا دیدار کر کے ہی بجھا کرتی تھی۔ ایک نامعلوم سی بے چینی اور اضطراب نے اس کا گھیراؤ کر رکھا تھا اور اسی بے چینی اور اضطراب نے اس کے وجود کو ایک ایسی تھکن سی سونپ دی تھی کہ اس کا کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ اس کے دل ودماغ پر یہی بوجھ تھا کہ ''کیا معصومہ اس کی محبت کو خوش آمدید کہے گی؟ کیا وہ اس کی محبت کا جواب محبت سے دے گی؟'' اور آج جب جانم کے لبوں سے اسے معصومہ کی محبت کا علم ہوا تو ایک دم سے دماغ پر دھرا بوجھ چھٹ کر رہ گیا۔ وہ خود کو اس قدر ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا جیسے برسوں بھاری بھرکم زنجیروں میں سرتاپاؤں جکڑے رہنے کے بعد اسے رہائی نصیب ہوئی

ہو۔تمام تر بے چینی اور اضطراب کا خاتمہ ہو کر رہ گیا۔ساری تھکن اتر کر رہ گئی اور کئی دنوں کی بھوک و پیاس ایک دم سے جاگ اٹھی۔

چارپائی پر گرتے ہی اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنی تصوراتی دنیا میں پہنچ گیا۔

تصور کی دنیا بھی کیا خوب کمال کی دنیا ہوتی ہے۔ایک بے حد انوکھی اور حیرت انگیز دنیا! جہاں انسان جب اور جس وقت چاہے پہنچ سکتا ہے۔ہزاروں کلومیٹر کی مسافت محض لمحے بھر کے اندر طے کرتے ہوئے جہاں انسان ہر کام عین اپنی خواہش کے مطابق انجام دیتا ہے اور بعض اوقات ناممکن کام بھی بڑی سہولت سے انجام دے ڈالتا ہے اور تو اور قبر کی گہرائیوں میں دفن ہستی کے جیتے جاگتے وجود سے ہم کلام اور ہم آغوش ہو کر لوٹ آتا ہے۔یہی تو وہ دنیا ہوتی ہے جہاں محبوب اپنی محبوبہ کے ساتھ آزادانہ گھومتا پھرتا رہتا ہے کیونکہ اسے یہ خوف دامن گیر نہیں ہوتا کہ کوئی اسے پکڑ لے گا یا اس کی محبوبہ کو اس سے چھین کر لے جائے گا کیونکہ اس کی تصور کی دنیا ہے جہاں کوئی ناپسندیدہ ہستی اس کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتی ہے۔

بابو نے بھی اپنی تصور کی خوب صورت دنیا میں معصومہ کے ساتھ قدم دھرا اور اس حسن کی دیوی کا ہاتھ تھامے ساحل سمندر کی گیلی ریت پر چلتے ہوئے اس سے اپنے دل میں بند محبت کی ڈھیروں باتیں کرنے پر دلفریب تبسم سجائے اس کی محبت کی باتیں سنتی رہی۔

”تم بھی تو کچھ کہو معصومہ؟ کب سے میں ہی بکواس کئے جا رہا ہوں۔“اس نے محبت کی شراب چھلکاتی نگاہوں نے معصومہ کے بے مثال حسن کو نگاہوں میں جذب کرتے ہوئے کہا۔معصومہ نے اپنی حسین نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اس کے لب تھرتھرائے اور تھرکتے لبوں سے بجائے محبت کے میٹھے بولوں کے عجیب سا جملہ ایسی آواز میں ادا ہوا جیسے وہ آواز معصومہ کی نہیں کسی اور ہستی کی ہو۔

”کھانا لے آئی ہوں“اس آواز نے سماعت میں پڑ کر ایسی ہلچل مچائی کہ بابو نے گھبرا کر ایک دم سے آنکھیں کھول کر آواز کے وجود کی طرف دیکھا اپنے سامنے ثریا کو پا کر اس کے پورے حلق میں کڑواہٹ سی گھل کر رہ گئی۔آنکھوں میں محبت کی چھلکتی جام کی جگہ نفرت کے دہکتے ہوئے انگاروں نے لے لی اور چہرے پر غیض وغضب کی سرخی بکھر کر رہ گی۔

”تو اب تک گئی نہیں کالی کلوٹی؟ کیا تجھے اپنے گھر میں آرام نہیں ہے؟“اس کا لہجہ از کو در تلخ ہو کر رہ گیا۔

”تائی بہت اصرار کر کے لائی ہے۔میں نے تو بہت منع کیا تھا لیکن تائی نے میری ایک نہیں سنی۔اپنی قسم دے کر ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔“

ثریا نے دکھی لہجے میں وضاحت کی اور ایک بھرپور نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔وہ بے چاری آج تک یہ نہیں جان پائی تھی کہ یہ شخص اس کی ہستی سے اس قدر خار کیوں کھائے رہتا تھا؟ کیوں اس سے بلاوجہ نفرت کرتا تھا؟ کیوں اس کی ہستی سے اس قدر چڑتا تھا کہ اس کی صورت تک دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا؟ آخر کیوں؟ وہ اکثر یہی سوچا کرتی تھی۔لیکن بہت سوچنے پر بھی اسے اپنے کسی سوال کا کوئی ایسا جواب نہیں ملتا جو اس کے دل کو مطمئن کر پاتا۔بہرحال اپنے دل کی تسلی کے لئے یہی کافی تھا کہ وہ خود بابو سے بے حد محبت کرتی تھی اس نے تو جانے کب سے اپنے مسند دل پر بابو کو ایک بادشاہ کی طرح براجمان کر رکھا تھا؟ ایک ایسا فاتح بادشاہ جو کئی برسوں سے اس کے سلطنت دل پر نہایت کامیابی سے حکمرانی کئے جا رہا تھا۔

”اونہہ! قسم دے کر! تجھے قسم دینے کی ضرورت پڑتی ہے کیا؟ تجھے تو کوئی ایک بار غلطی سے بھی ساتھ چلنے کو کہہ دے تو اس طرح اپنا بوریا بستر ساتھ لے کر چل پڑے گی جیسے عمر بھر رہنے کا سوچ رکھا ہو۔اماں نے ایک بار اخلاق سے کہہ دیا اور تو نے اسے ”اصرار“ سمجھ لیا۔واہ ری تیری

معصومیت۔'' بابو نے طنز کے زہر میں بجھا ہوا ایک تیر اس کے ارمانوں بھرے دل میں پیوست کیا ایک ٹیس سی اٹھی اور اس کی کالی کالی آنکھوں کے کناروں سے نمکین پانی چھلک پڑا۔

''اب کیا یونہی میرے سر پر کھڑی رہو گی۔ مجھے سکون سے چند لقمے زہر مار کرنے دو گی یا نہیں؟ اس کے لہجے کا زہریلا پن برقرار رہا وہ بھیگی نگاہوں سے صرف اسے گھورتی رہی۔

''اری کس ڈھیٹ مٹی کی بنی ہوئی ہے تو؟ مسلسل کھڑے ہوئے دیدے پھاڑے گھورے چلے جا رہی ہے، کیا کچا چبانے کا ارادہ ہے کالی چڑیل؟'' بابو کے لہجے کی نفرت وحقارت اس کے کانچ جیسے نازک دل کو کرچی کرچی کر گئی وہ اپنے آنسو روکتی ہوئی وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

''زہریلی ناگن! میری زندگی کی خوشیوں میں بھی زہر گھولنا چاہتی ہے۔'' بابو نے آواز بلند بڑبڑاتے ہوئے کہا اور کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

مدیحہ ایک کمرے کے اندر کھڑی کھڑکی سے یہ سب دیکھ اور سن رہی تھی۔ ثریا کی ہستی کے لئے بابو کی آنکھوں میں نفرت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور لہجے میں تلوار کی سی کاٹ بسی ہوئی تھی یہ سب دیکھ کر اور سن کر مدیحہ کا دل خشک پتے کی مانند لرز اٹھا۔ اس کی چھٹی حس ایک ایسے بھیانک طوفان کی پیشگی اطلاع دے رہی تھی جو اگر اٹھ کھڑا ہوا تو اس کی زندگی کی تمام خوشیوں اور ارمانوں کو حقیر تنکے کی مانند بہا لے جائے گا۔

بے شک رمضان کو مدیحہ سے بے محبت تھی اور مدیحہ سے شادی کر کے رمضان کی محبت میں مزید شدت پیدا ہو گئی تھی لیکن ساتھ ہی رمضان کو اپنی بہن ثریا سے بھی بے حد وحساب محبت تھی۔ شادی کی پہلی رات ہی رمضان نے مدیحہ کو یہ باور کر دیا تھا کہ۔

''ثریا میری اکلوتی بہن اور ہم سب کی بے حد لاڈلی ہے۔ ہمیں اس سے اس قدر محبت ہے کہ ہم نے آج تک اس کی کسی خواہش کو رد نہیں کیا۔ جب اماں کی زبانی مجھے اس بات کا علم ہوا کہ میری لاڈلی بہن تمہارے بھائی بابو سے بے حد محبت کرتی ہے تو میں نے اسی لمحے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں کسی بھی قیمت پر اپنی لاڈلی بہن کی محبت اس کے سپرد کر کے رہوں گا حالانکہ ذاتی طور پر مجھے تمہارا وہ نکما اور ہڈ حرام بھائی ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ لیکن ثریا کی خوشی کی خاطر میں نے اپنی ناپسندیدگی کو اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا اور تم سے شادی کی یہ شرط رکھی کہ بابو اور ثریا کی بات بھی طے کی جائے۔ مجھے معلوم ہے تمہارے دل کو میرے سخت رویے سے بہت ٹھیس پہنچی ہو گی لیکن مین نے بہن کی محبت میں مجبور ہو کر ایسی شرط رکھی تھی اور میں آج بھی تم پر یہ بات واضح کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اگر بابو نے ثریا سے شادی نہیں کی۔ یا اس کی جوانی انتظار کی سولی پر لٹکے ہوئے بڑھاپے کی حدود میں داخل ہونے لگی تو؟ تمہیں بھی اس گھر سے اور میری زندگی سے نکلنا ہو گا کیونکہ میں اپنی بہن کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔''

رمضان کی یہ بات بجلی بن کر مدیحہ کے حواسوں پر گری اور پہلی رات کی اس دلہن کے ارمانوں بھرے دل کو جلا کر خاکستر کر گئی۔

اسی دن سے مدیحہ کسی ہرنی کی مانند ڈری سہمی رہنے لگی اس کے دن رات اسی خوف کے تحت گزرنے لگے کہ اگر بابو نے ثریا سے شادی نہیں کی تو؟

اور آج بابو کی آنکھوں میں ثریا کے لئے نفرت وحقارت کے سرخ ڈورے دیکھ کر وہ اپنی پوری جان سے لرز اٹھی ثریا کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس کا مقدر بھی بن سکتے تھے۔ اس کی ہنستی بستی زندگی کو بھی اجاڑ کر رکھ سکتے تھے؟ یہی سوچیں تھیں جس نے مدیحہ کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی

خوشیوں کے لئے بابو کے سامنے بھکارن بن جائے۔

رات کی تاریکی پھیلتے ہی جب گھر کا ہر فرد خوابوں کی حسین وادیوں کی جانب روانہ ہو گیا تو مدیحہ نے بابو کے کمرے میں اپنے لرزتے قدم رکھے۔

''بابو!'' مدیحہ کے لہجے میں بھی لرزش سی تھی۔ ''مدیحہ! تم اس وقت؟ خیریت تو ہے؟'' بابو نے حیرت سے دیوار گیر گھڑی کی جانب دیکھ کر دریافت کیا جو شب کے ڈھائی بجنے کا خاموش اظہار کر رہی تھی۔

''تجھ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' مدیحہ کے لہجے میں آنسوؤں کی ملاوٹ بابو کو بہت کچھ سمجھا گئی لیکن اس نے مدیحہ کی زبان سے سننے کو اہمیت دی اور مدیحہ کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے سامنے بیٹھنے کے لئے کہا اور خود بھی اس کی بات سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''بابو! میری خوشیوں کی ڈور اب تیرے ہاتھ میں ہے۔ تو چاہے تو میں ہمیشہ اپنے شوہر کے گھر میں ہنسی خوشی بسی رہ سکتی ہوں اور اگر تو نے اپنی من مانی کی۔ ثریا سے شادی نہ کرنے کی ضد پر قائم رہا تو تیری اس بہن کا بسا بسایا گھر اجڑ کر رہ جائے گا ار تو یونہی ثریا سے اپنی نفرت کا اظہار کرتا رہا۔ اسے رلاتا رہا تو اتنا جان لے کہ تیری نفرت رمضان کی محبت کو بھی نفرت مین بدل سکتی ہے۔ وہ ثریا کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو کے ایک قطرے کے جواب میں تیری بہن کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب رواں کر کے رکھ دے گا وہ مجھے بھی طلاق دے سکتا ہے۔'' آخری جملہ ادا کرتے ہوئے مدیحہ کی آنکھیں برس پڑیں بابو صرف سر جھکا کر رہ گیا وہ اس موضوع پر سخت عاجز آ چکا تھا۔

''میری۔ میری کوکھ میں رمضان کا جو بچہ پل رہا ہے۔ مجھے بتا؟ میں اس بچے کو جنم دوں؟ یا اپنی کوکھ میں ہی اس کی زندگی کا خاتمہ کر ڈالوں؟ مجھے بتا بابو میں کیا کروں؟ تجھے اللہ کا واسطہ ہے بابو مجھے اجڑنے سے مجھے اور میرے بچے کو بے سہارا ہونے سے بچا لے۔'' مدیحہ نے روتے ہوئے بابو کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

''مم۔ مجھے ثریا پسند نہیں۔ مین اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں خود پر یہ ظلم نہیں توڑ سکتا میری اپنی بھی کوئی پسند ہے کہ نہیں؟'' وہ ایک دم سے پھٹ پڑا۔ مدیحہ بھیگی آنکھوں سے اس کی صورت تکتی رہ گئی۔ چند لمحوں بعد اس کے لبوں پر تلخ سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ تلخ اور بے حد زخمی سی مسکراہٹ۔ وہ ایک دم سے اس کے سامنے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''گویا تو نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تو ثریا سے شادی نہیں کرے گا؟ مدیحہ نے بے دردی سے اپنے آنسو اپنے گالوں پر سے صاف کرتے ہوئے بابو سے دریافت کیا۔

''آج تیرے سامنے میں یہ قسم کھاتی ہوں کہ اگر ثریا سے شادی نہ کرنے کے تیرے فیصلے کی سزا مجھے رمضان کی طرف سے طلاق کی صورت میں بھگتنی پڑی تو میں پلٹ کر اس گھر میں واپس نہیں آؤں گی۔ اس بچے سمیت میں اپنی زندگی کا خاتمہ کر ڈالوں گی اور ہمارا یہ خون تیری گردن پر ہو گا سچ کہتی ہوں بابو میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' مدیحہ نے آنسو کے موتی لٹاتے ہوئے اسے دھمکی دی۔

''ایک بات یاد رکھنا بابو؟ کسی کا دل دکھا کر اپنے دامن میں خوشیاں سمیٹنے والے کبھی خوش نہیں رہتے۔'' مدیحہ نے دکھی دل سے کہا اور ایک دم سے کمرے سے نکل پڑی۔

مدیحہ کے جاتے ہی بابو نے سر اٹھا کر دروازے کی سمت دیکھا اور مدیحہ کے وجود کے اوجھل ہوتے ہی اطمینان کی طویل سانس خارج کر کے رہ گیا۔اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے قطعی عاری بالکل سپاٹ تھا اس کا دل خدا جانے کیوں اس قدر سخت ہو چکا تھا کہ بہن کے آنسو اور آنسوؤں بھری التجائیں بھی اس چکنے گھڑے پر بے اثر ثابت ہو رہی تھیں وہ شدت سے صرف اس لمحے کا منتظر تھا کہ کب مدیحہ اس کے کمرے سے جائے؟ اور وہ اپنے آرام دہ بیڈ پر لیٹ کر اپنی چاہت معصومہ کے حسین تصور میں کھو کر اپنے اطراف پھیلی اداسیوں اور تلخیوں سے نجات حاصل کر سکے۔معصومہ کے عشق کے تیز بخار نے اسے اندھا ہی نہیں بہرہ بھی کر کے رکھ دیا تھا۔نا تو اسے کسی کے چہرے پر پھیلا درد و کرب دکھائی دیتا تھا اور نا ہی کسی کی درد بھری پکار سنائی دیتی۔ہاں!اگر اس کی بینائی سلامت تھی تو معصومہ کا بے مثال حسن اور پر شباب سراپا دیکھنے کے لئے سلامت تھی اس کی سماعتیں سوائے معصومہ کی ترنم خیز، میٹھی اور کوئل جیسی سریلی آواز کے کسی اور کی آواز سننا نہیں چاہتی تھیں۔یہی وجہ ہے کہ مدیحہ کے جاتے ہی اس نے اٹھ کر ٹیوب لائٹ آف کی اور زیرو پاور کا بلب روشن کرتے ہی آرام دہ بیڈ پر گر گیا۔

صبح حسب عادت وہ نہا دھو کر اور نیلے رنگ کی شلوار قمیص زیب تن کئے آئینے کے سامنے کھڑے رہ کر اپنے سراپے کا تنقیدی جائزہ لے رہا تھا کہ نہایت خاموشی سے ثریا آن کر کھڑی ہوگئی اور اپنی آنکھوں کی سیاہ پتلیوں کو حرکت دیئے بابو کے سراپے اور خوب صورت چہرے پر پھیلی انجانی مسرت کا جائزہ لیتی رہی بابو کا چہرہ اس کے لئے ایسی کھلی کتاب کی مانند تھا جس پر خوشی و غم کی ہر تحریر وہ با آسانی پڑھ لیا کرتی اور پڑھ سکتی تھی۔اس وقت بھی بابو کے چہرے پر بکھری لالی اور خمیدہ لبوں پر سجی دھیمی سی مسکراہٹ صاف بتا رہی تھی کہ وہ اپنے دل کے خالی فریم میں کسی حسینہ کی تصویر سجا چکا ہے۔

''کیا بہت خوب صورت ہے وہ؟'' اس سے پہلے کہ ثریا کو بنا اجازت اپنے کمرے میں گھس آنے پر وہ کچھ تلخ و ترش سنا پاتا؟ اسے لب کھولنے کا موقع دیئے بغیر ایک دم سے ثریا نے سوال کا پتھر کھینچ مارا اس نے چونک کر ثریا کی جانب دیکھا۔

''کک۔کون؟'' وہ دانستہ انجان بن گیا۔

''کیا تو نہیں جانتا؟ میں کس کے بارے میں پوچھ رہی ہوں؟'' ثریا کے لہجے میں تلوار کی سی کاٹ تھی وہ بری طرح ٹپٹا کر رہ گیا اسے یہ سوچ کر حیرت سی ہو رہی تھی کہ ثریا اس کی محبت کی کہانی سے کیسے واقف ہوگئی؟ اس نے تو کسی کے سامنے اپنی محبت کی تشہیر نہیں کی تھی۔

''تیرا چہرہ تیرے دل میں بسی محبت کو بیان کر رہا ہے۔تو کب تک مجھ سے اپنی محبت پوشیدہ رکھے گا؟'' ثریا نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں! وہ بہت خوب صورت۔ بے حد حسین ہے۔'' یہ جملہ بابو کے لبوں کی کمان سے کسی تیر کی مانند سنسناتا ہوا نکلا اور ثریا کے ارمانوں بھرے دل میں اس بے دردی سے جا کر پیوست ہوگیا کہ ایک سسکی سی اس کے لبوں سے خارج ہو کر رہ گئی۔

''میرے پاس وہ خوب صورت الفاظ کے موتی نہیں جنہیں جملوں کی مالا میں پرو کر میں اس حسن کی دیوی کی تعریف بیان کر سکوں۔جنت کی حور کا تصور دکھائی دیتی ہے وہ۔میں نے اپنی پوری زندگی میں اس جیسی حسین لڑکی اب تک نہیں دیکھی۔اس کا نام معصومہ ہے اور وہ واقعی حسن اور معصومیت کا حسین ملاپ ہے اسے ایک نظر دیکھتے ہی میرا دل میرے ہاتھوں سے پھسل کر اس کے قدموں میں ڈھیر ہوگیا۔اس کے ایک ہی دیدار نے

میرا چین و آرام، صبر و قرار سب کچھ لوٹ لیا۔ مجھے اس سے محبت ہوگئی۔ بے انتہا شدید محبت میرا یقین کرو۔ ثریا میں اب اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسے بنا دیکھے مجھ سے ایک ایک پل کاٹنا مشکل ہو جاتا ہے پھر میں پوری زندگی اس کے بغیر کیسے گزار پاؤں گا؟ وہ میرے جسم میں روح کی طرح سمائی ہوئی ہے۔ آنکھوں میں بینائی کی مانند بسی ہوئی ہے تم خود سوچو ثریا؟ بنا روح کے جسم کی کیا اہمیت؟ بینائی نہ تو آنکھیں کس کام کی؟'' اس نے جوش جذبات میں ثریا کو بے اختیار بازوؤں سے تھام لیا معصومہ کے ذکر نے اس کے دماغ سے یہ بات ایک دم سے محو کر ڈالی تھی کہ وہ ایک ایسی لڑکی کے سامنے اپنے دل کی کیفیات بیان کر رہا تھا جسے اس نے کبھی منہ لگانا گوارہ نہ کیا تھا۔

وہ معصومہ کے خیال میں گم، اپنی دھن میں بولے چلا جا رہا تھا۔ اس بات سے قطعی بے خبر کہ اس کے لبوں سے نکلنے والا ہر لفظ ہنٹر بن کر کچھ اس شدت سے اس کے وجود پر پڑ رہے تھے کہ اذیت کی زیادتی نے اسے بری طرح بلبلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن اس نے اپنی بلبلاہٹ کو لبوں کے دروازے سے باہر آنے نہیں دیا اور صبر و ضبط کی تصویر بنی بابو کے دل کی بے قراریوں کی کہانی سنتی رہی۔

''لیکن؟'' اگلے ہی لمحے بابو پھرکی کی مانند گھوم پڑا اور اپنی قہر برساتی نگاہوں سے اسے گھورنے لگا۔

''تیرا وجود۔ تیرا منحوس وجود میرے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ تیرے ماں، باپ نے وٹے سٹے میں تیرا مجھ سے رشتہ ہی اس لئے کیا ہے کہ ان کی اس کالی کلوٹی اور بدصورت عورتوں کی ملکہ سے بھلا کون بے وقوف و کم عقل مرد شادی کرے گا؟ اور وہ؟ تیرا بزدل بھائی جس نے مدیحہ کے سر پر طلاق کی تلوار لٹکا کر اسے ہراساں کئے رکھا ہے اور بار بار اسے دھمکیاں دے کر جو مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کئے جا رہا ہے تو جا کر کہہ دینا اپنے بزدل اور ڈرپوک بھائی سے کہ بابو اپنے ارادے سے باز آنے والا نہیں اور تو بھی آج اپنے دونوں کان کھول کر سن لے کہ معصومہ میری پہلی اور آخری محبت ہے اور میں ہر قیمت پر اپنی محبت کو حاصل کر کے رہوں گا۔ معصومہ کو پانے کے لئے چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے میں بے خوف و خطر کر گزاروں گا دنیا کی کوئی طاقت مجھے معصومہ کو پانے سے روک نہیں سکتی اور تیرا وہ بزدل بھائی رمضان تو بالکل نہیں وہ ایسا مرد ہے جو صرف ایک عورت کو ہی ڈرا دھمکا سکتا ہے۔ مجھ سے بات کرنے کی ہمت اس بزدل میں کہاں؟'' بابو نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

''بابو! تو نے کبھی میرے بارے میں سوچا ہے؟ مجھے بھی تو تیرے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ دیکھا تو نے اپنے ہاتھ سے اپنے نام کی انگوٹھی مجھے پہنائی تھی نا؟ میں بھی تو تجھ سے بہت محبت کرتی ہوں۔ بے حد و حساب محبت۔ اللہ گواہ ہے کہ تجھ سے پہلے اور تیرے نام کی انگوٹھی پہننے کے بعد میں نے کسی کو نہیں چاہا۔ کسی سے محبت نہیں کی۔ یہاں تک کہ کسی دوسرے کے بارے میں سوچا تک نہیں۔ پھر میں کس طرح اپنے دل کو۔ اس پاگل دل کو یہ سمجھاؤں گی کہ تو میرا نہیں بن سکتا؟ تم مرد ہو شاید معصومہ کو۔ اپنی محبت کو حاصل کر لو گے لیکن مم میرا کیا ہوگا؟ میں اپنی محبت کے بغیر کیسے جی پاؤں گی؟'' وہ ایک دم سے رو پڑی۔

''یہ تیرا مسئلہ ہے۔ میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ تو مجھ سے محبت۔'' وہ چڑ سا گیا۔

''یہ تو نے خوب کہی بابو۔ حالانکہ تو بھی اس سچائی۔ اس کڑوی حقیقت سے واقف ہے اور بہت اچھی طرح واقف ہے کہ پیار کیا نہیں جاتا ہو جاتا ہے۔ محبت ہوتی ہے یا پھر نہیں ہوتی بس یہی محبت کا مکمل فلسفہ ہے۔'' ثریا کے لہجے کی گھمبیرتا بابو کو حیران سا کر گئی۔

"مجھے اگر اس پری پیکر سے محبت نہیں ہوتی تب بھی میں تجھ جیسی کالی بینا سے کبھی شادی نہیں کرتا۔ جانتی ہے کیوں؟ کیوں کہ تو مجھے بہت زہر لگتی ہے بلکہ زہر سے بھی زیادہ بری لگتی ہے تجھے دیکھتا ہوں تو میرے سارے حلق میں کڑواہٹ سی گھل کر رہ جاتی ہے متلی سی ہونے لگتی ہے۔ کیا تو نے کبھی خود کو آئینے میں غور سے دیکھا ہے؟ سچ کہتا ہوں آئینہ بھی تیری بدصورتی برداشت نہ کر کے چیخ کر رہ جائے گا۔ ذرا دیکھ!" بابو نے اس کے بازو پر اپنا پنجہ پیوست کیا اور اسے بے دردی سے گھسیٹ کر قد آدم آئینے کے سامنے اپنے مقابل کھڑے کرتے ہوئے آئینے میں نظر آتے اپنے اور اس کے عکس کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بے حد زہر خند لہجے میں کہا۔

"کیا تیرا اور میرا کوئی جوڑ بنتا ہے؟ تو ایک بے حد کالی گہری رات کی مانند کالی ہے اور میں دن کی مانند روشن اور پرنور۔ اندھیرے اور روشنی کا بھلا کیا میل؟ میری ماں کہتی ہے میں کہیں کا راج کمار دکھائی دیتا ہوں اور تو؟ خون پینے والی بھیانک صورت چڑیل۔" یہ کہہ کر بابو نے حقارت سے اسے اپنے وجود سے دور دھکیلا اس نے بڑی مشکل سے اپنے لڑکھڑاتے قدموں کو سنبھالا اور دکھ سے بابو کی صورت تکتی رہ گئی۔

"مجھے تیرے اسی رنگ و روپ سے نفرت ہے۔ تیرا یہ رنگ و روپ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا اور جب تک تیرا یہ رنگ و روپ برقرار رہے گا میری نفرت بھی جوں کی توں رہے گی کیا تو پوری زندگی میری نفرت سہہ پائے گی؟" اس نے نہایت سفاکی اور بے رحمی کا مظاہرہ کیا۔ ثریا بھیگی نظروں سے اس سنگ دل کو دیکھتی رہ گئی جو لبوں پر زہریلی مسکراہٹ سجائے اس کی آنسو بھری آنکھوں میں تکے جا رہا تھا۔

"تو کتنا خودغرض ہے بابو۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ تجھے صرف اپنی خوشیاں عزیز ہیں اور اپنی خوشیوں کو پانے کے لئے تو کسی بھی رشتے کا گلا گھونٹ سکتا ہے۔ میں نے ابھی اور اسی لمحے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں شام تک یہاں سے چلی جاؤں گی۔ آج کے بعد تجھے یہ کالی کلوٹی، بھیانک صورت چڑیل اور گہری کالی رات جیسی کالی لڑکی کبھی اس گھر میں دوبارہ دکھائی نہیں دے گی۔ اس بات کے لئے اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔" ثریا کی اس بات پر اس نے سوالیہ اور حیرت بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

"میں اپنے دل سے تیری محبت نوچ کر نہیں پھینک سکتی کیونکہ تیری محبت سرطان کی طرح میری رگ رگ میں سرایت کر چکی ہے یہ سرطان میری جان تو لے سکتا ہے میری جان چھوڑ نہیں سکتا۔" یہ کہہ کر وہ جانے کے لئے پلٹی لیکن دروازے کی چوکھٹ عبور کرنے سے پہلے اس کے قدم ٹھہر سے گئے اس نے آنسوؤں سے تر چہرہ گھما کر بابو کی طرف دیکھا۔

"مجھے یہ کہنا تو نہیں چاہئے۔ لیکن تیری سنگ دلی نے مجھے یہ کہنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اللہ کرے تجھے بھی تیری محبت آسانی سے حاصل نہ ہو۔" ثریا نے جلے دل سے بددعا دی اور دروازے کی چوکھٹ عبور کر گئی۔

"اونہہ! اپنی محبت کا ثبوت دے گئی آخر۔"

بابو نے اس کی بددعا پر طنز کیا۔

جب عبداللہ کو علم ہوا کہ وہ سیٹھ رحیم سے ملا ہی نہیں تو عبداللہ نے گھر میں داخل ہوتے ہی ایک قیامت سی برپا کر ڈالی۔ چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔

''میں آج اسے گھر میں گھسنے نہیں دوں گا۔'' غصے کی شدت کے باعث بوڑھے عبداللہ کا پورا وجود کانپ کر رہ گیا۔

''آخر ہوا کیا؟'' زلفاں بیگم نے دریافت کیا۔

''میں نے اسے چاولوں کے بہت بڑے بیوپاری سیٹھ رحیم سے ملنے کو بھیجا تھا۔ ابھی آتے ہوئے اتفاق سے سیٹھ صاحب کا ایک ملازم مل گیا میں نے اس سے پوچھا سیٹھ صاحب کو میرے بیٹے کا کام پسند آیا۔ تو اس نے بتایا کہ آپ کا بیٹا تو آیا ہی نہیں اس لئے سیٹھ صاحب نے ایک دوسرا لڑکا رکھ لیا میں کہتا ہوں؟'' اس سے پہلے کہ عبداللہ اپنی بات مکمل کر پاتا ایک دم سے درمیان میں زلفاں بیگم نے مداخلت فرما دی۔

''ان باتوں کو رہنے دو۔ ثریا نے اچانک گاؤں جانے کا فیصلہ کر لیا اور کچھ کھائے پئے بغیر مدیحہ کو ساتھ لئے چل دی۔ میں نے اس سے بہت پوچھا کہ کیا بات ہے؟ اس طرح اچانک کیوں جارہی ہے؟ لیکن اس نے میری کسی بات کا جواب نہ دیا اور سامان سمیٹتی رہی مجھے لگتا ہے اسے بابو ہی نے کچھ کہا ہے؟'' زلفاں بیگم کی یہ سب سن کر عبداللہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر چارپائی پر اس طرح جا بیٹھا جیسے اس کے پیروں میں کھڑے رہنے کی سکت باقی نہ رہی ہو۔

''اللہ جانے یہ لڑکا ہمیں کس بات کی سزا دے رہا ہے؟'' زلفاں بیگم نے دکھ سے کہا۔

گھر میں اس طرح سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے عبداللہ کے اس گھر میں کوئی ذی روح نہیں بستا ہو۔ ثریا کے ایک دم سے چلے جانے پر سب کا دل مدیحہ کے بارے میں سوچ سوچ کر لرز اٹھتا تھا۔ زلفاں بیگم کی نگاہوں سے ان کے جانے کا وہ آخری منظر محو ہو کر نہیں دے رہا تھا جب بھیگی آنکھوں سے مدیحہ بار بار پلٹ کر اس کی جانب دیکھ رہی تھی اور خاموشی و آنسوؤں کی زبان میں ایک ہی بات کئے جارہی تھی کہ۔

''میرے لئے دعا کرنا ماں۔'' اور زلفاں بیگم کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔

رات کے کھانے کے وقت جب بابو گھر میں داخل ہوا تو اسے دیکھتے ہی عبداللہ کا صبر و ضبط جواب دے گیا اس کا پارہ اس قدر بلند ہو کر رہ گیا کہ اس نے بابو کو صرف برا بھلا ہی نہیں کہا بلکہ کچھ کراری اور کچھ تیکھی گالیوں سے بھی دل کھول کر نوازا وہ لبوں پر خاموشی کا قفل ڈالے عبداللہ کی تلخ و تیکھی نہایت صبر و تحمل اور سعادت مند اولاد کی طرح سر جھکائے سنتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت غصے کی زیادتی نے عبداللہ کو ایسی بھڑکتی ہوئی آگ بنا کر رکھ دیا ہے جسے بجھانے کی حماقت کی گئی تو اپنے ہاتھ بھی جھلس کر رہ جائیں گے۔ اس لئے اس نے عبداللہ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش نہیں کی اور اسے اپنے دل کا غبار نکالنے دیا۔ البتہ اس دوران اس کا دماغ اپنے بچاؤ کی راہ تلاش میں مصروف رہا۔

''بس! نکال لی اپنے دل کی تمام بھڑاسیں؟ کہہ دیا جو کہنا تھا؟ یا ابھی کچھ اور کہنے کو باقی ہے؟'' عبداللہ کے خاموش ہوتے ہی وہ ایک دم سے بھڑک اٹھا۔

''ابا اور اماں! اب جو میں کہہ رہا ہوں وہ نہایت توجہ اور غور سے سننے کی زحمت فرما لینا۔'' اس نے طنز کیا۔

''سب سے پہلے تو اماں تم یہ بتاؤ کہ میرے پاس کیا ہے جو میں ثریا سے شادی کرنے پر ایک دم سے تیار ہو جاؤں؟ کیا اچھی اور پکی نوکری ہے؟ ڈھنگ کا گھر ہے؟ کوئی دولت و جائیداد ہے؟ نقدی یا سونے کے زیورات ہیں؟ آخر کیا ہے ہمارے پاس؟ رمضان نے ہماری مدیحہ کو کس قدر

عیش و آرام سے رکھا ہوا ہے؟ اس کی ہر خواہش وہاں پلک جھپکتے ہی پوری کر دی جاتی ہے۔ رمضان کی اپنی زمینیں ہیں جس سے حاصل ہونے والی آمدنی کا نصف حصہ وہ مدیحہ کے ہاتھوں پر رکھتا ہے۔ ان کے گھر کا نصف حصہ مدیحہ کے تصرف میں ہے۔ چالیس، پچاس ہزار کی نقد رقم ہر وقت مدیحہ کی الماری میں تجوری کے اندر موجود رہتی ہے اور زیورات کے بارے میں، میں کیا کہوں مدیحہ سونے میں پیلی ہو کر یہاں آتی ہے۔ کانوں میں، گلے میں اور کلائیوں پر سجے سونے کے زیورات تم لوگوں نے بھی آخر مدیحہ کے وجود پر دیکھے ہی ہیں اگر میں ثریا کو مدیحہ جیسا عیش و آرام نہ دے سکا تو چاچا اور چاچی تم دونوں کو طعنے مار مار کر ہی مار ڈالیں گے اور مدیحہ کی ہنستی بستی زندگی پر الگ برا اثر پڑے گا۔ ثریا وہاں گھر بھر کی بے حد لاڈلی ہے یہاں اسے ذرا سی بھی کوئی تکلیف پہنچی تو وہاں مدیحہ کو پریشان کیا جائے گا بلکہ اس کی ہر تکلیف و پریشانی کا مدیحہ سے پورا پورا بدلہ لیا جائے گا۔'' بابو اتنا کہہ کر لمحے بھر کے لئے رکا اور اپنی جذباتی باتوں کا اثر دیکھنا چاہا۔ عبداللہ اور زلفاں بیگم کو سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن پا کر اس کے لبوں پر دلفریب تبسم بکھر کر رہ گیا ان کی خاموشی اس بات کی جانب واضح اشارہ کر رہی تھی کہ دونوں ہستیاں اس کی باتوں سے متفق تھیں۔ لوہا گرم دیکھ کر اس نے آخری اور بھرپور ضرب لگانے کی ٹھان لی۔

''شادی کرنے کے لئے بھی ہزاروں روپوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہاں سے آئیں گے ہزاروں روپے؟ کیا آسمان سے برسیں گے یا زمین اگلے گی؟ کیا ہم لوگوں کے سامنے اپنے ہاتھ پھیلا کر بھیک طلب کریں گے؟ اول تو کوئی کسی کو کسی بھی قسم کی ضمانت کے بغیر ہزاروں روپے قرض کی بھیک نہیں دیا کرتا لیکن فرض کرلو کسی نیک انسان نے قرض دے بھی دیا تو ہم بعد میں قرض کے اس پھندے سے اپنی گردنیں کیسے آزاد کر پائیں گے؟ کیا یہ گھر بیچ کر گھر سے بے سہارا ہو کر بیٹھ جائیں گے؟ بعد میں ملیحہ اور صبیحہ کی شادیاں کیسے کریں گے؟'' بابو نے ان کے سامنے سوالنامہ رکھ دیا وہ مزید مضطرب ہو کر رہ گئے۔

''ابا! مجھے بیوی لا کر صرف گھر میں بٹھانا نہیں ہے بلکہ اس کے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کا بھی خیال رکھنا ہے، اللہ تمہیں صحت و تندرستی کے ساتھ لمبی زندگی عطا فرمائے لیکن تم کب تک ہمارا خرچہ اٹھاؤ گے؟ آج کے دور میں مہنگائی کے مگرمچھوں سے لڑنے کے لئے صرف تین یا چار ہزار روپے ماہانہ کی آمدنی کوئی اہمیت نہیں رکھتی، میں صرف اسی لئے سیٹھ رحیم کے پاس نہیں گیا، اب تم ان بیوپاریوں کو نہیں جانتے کیونکہ یہ غریب کے وجود کا خون پینے والی وہ جونکیں ہیں جو لہو کے آخری قطرے تک غریب کے وجود سے چپکے رہتے ہیں اور ان کے جسم کا تمام لہو چوس کر انہیں مرنے کے لئے بالکل تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔ سال دو سال بعد وہ میری تنخواہ میں پانچ سو زیادہ سے زیادہ ایک ہزار روپے ہی کا اضافہ کرے گا ناں؟ کیا ہزار، پانچ سو سے ہماری ضرورتیں پوری ہو جائیں گی؟ یہ تو سیدھے سیدھے ترس ترس کر جینے والی بات ہوئی گویا قدم قدم پر اپنی خواہشات کا گلا دبا کر اسے ختم کیا جائے۔ یا خواہشات کے چہرے پر طمانچے رسید کرتے ہوئے اسے سر اٹھانے سے باز رکھتے ہیں۔''

بابو نے بے حد نرمی و محبت سے اپنے ابا کو قائل کیا۔

''تو کہنا کیا چاہتا ہے؟'' عبداللہ نے اسے دیکھتے ہوئے نرمی سے دریافت کیا۔

''صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جلد بازی مت کرو کیونکہ جلد بازی بنے بنائے کام اکثر بگاڑ کر رکھ دیا کرتی ہے میں قبل از وقت بتانے کے حق

میں نہیں ہوں لیکن اب بتائے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے کہ میں نے ایک بہت اچھے کام میں ہاتھ ڈالا ہے۔ اللہ نے چاہا تو کامیابی میرے قدم چومے گی اور ہمارے دن پھر جائیں گے۔'' بابو نے اس خطرے کو ٹالنے کے لئے جھوٹ کا سہارا لیا۔

اگر وہ عبداللہ کے غصے کی بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے وقتی طور پر جھوٹ کا پانی نہیں ڈالتا تو عبداللہ اور زلفاں بیگم اسے کھڑے کھڑے گھر سے نکال باہر کرتے۔ اس کے جھوٹ کا یہ فائدہ ہوا کہ نہ صرف عبداللہ اس کی باتوں کے جال میں پھنس کر رہ گیا بلکہ زلفاں بیگم کے دل کو بھی ڈھیروں تسلی میسر آ گئی۔

''مطلب کہ تجھے ثریا سے شادی کرنے سے انکار نہیں ہے۔'' زلفاں بیگم نے اپنے دل کی تسلی کے لئے دریافت کیا۔ بابو نے مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیا تو زلفاں بیگم نے بے اختیار اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

☆......☆......☆

بابو نے جھوٹ کا سہارا لے کر فی الحال تو اپنی جان آزاد کر لی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ اس ایک جھوٹ کے سہارے زیادہ دنوں تک عبداللہ اور زلفاں بیگم کے تقاضوں سے بچ نہیں پائے گا۔ اس لئے وقت ضائع کرنا اس نے بے وقوفی سمجھ کر معصومہ سے نکاح کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسرے ہی دن وہ جانم کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور بے خوف جانم سے معصومہ کا ہاتھ طلب کر لیا۔

''میں دنیا جہاں کی خوشیاں معصومہ کے قدموں تلے بچھا دوں گا۔ اسے اتنی محبت دوں گا کہ اس کا دامن تنگ پڑ جائے گا'' اس نے ایک جوش وولولے سے کہا۔

''شادی کے بعد لڑکی کا نصیب کیا ہو۔ اس کی زندگی کس جانب کروٹ بدلے خوشی کی یا غموں کی جانب؟ وقت سے پہلے یہ کہنا بے وقوفی ہے؟ ویسے تو ہر ماں کی اولین خواہش یہی ہوتی ہے کہ اس کی بیٹی بہت خوش رہے۔ اسے بہت محبت کرنے والا شوہر ملے اور اس کی زندگی میں کوئی غم نہ آئے لیکن ہر ماں کی یہ خواہش تو پوری نہیں ہوا کرتی۔'' جانم نے مسکرا کر جواب دیا۔

''لیکن میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ میری معصومہ اس لحاظ سے خوش نصیب ہے کہ اسے تم جیسا محبت کرنے اور اس کی ہستی کو ٹوٹ کر چاہنے والا شخص ملا ہے۔ معصومہ کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے کر مجھے بہت خوشی ہوگی بلکہ میرا دل پرسکون و مطمئن رہے گا کہ میں نے اپنی بیٹی کی زندگی کی ڈور ایک اچھے اور مضبوط انسان کے ہاتھ میں تھمائی لیکن؟'' جانم کی ایک دم سے خاموشی بابو کو بے حد مضطرب کر گئی۔

''لیکن کیا؟'' بابو کا دل ڈوبنے لگا۔

''لیکن ایک مسئلہ درپیش ہے۔'' جانم کے لہجے میں نامعلوم سا کرب محسوس کر کے وہ چونک اٹھا۔

''کیسا مسئلہ؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''بات ذرا طویل ہے لیکن میں اختصار میں بیان کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔'' جانم نے کہا اور پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد گویا ہوئی۔

''چندہ بائی کے کوٹھے سے فرار ہونے کے بعد میرے پیش نظر صرف معصومہ کی پرورش ہی نہیں بلکہ اس کی تعلیم و تربیت اور تن ڈھانپنے کا مسئلہ بھی ایک پہاڑ کی مانند کھڑا تھا۔ میں اب جسم فروشی کر کے معصومہ کی پرورش کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن دوسرا کوئی راستہ مجھے سجھائی نہیں دے رہا تھا کیونکہ مالی طور پر میری پوزیشن بہت کمزور تھی معصومہ کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے لئے ڈھیر سارے روپوں کی ضرورت تھی۔ میری سمجھ سے باہر تھا کہ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ بہت سوچنے کے بعد میں نے مٹھن گوٹھ کے وڈیرے شاہنواز رستم کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی ندامت محسوس نہیں ہوتی کہ شاہنواز رستم میرے رقص و نغمے کا سچا قدردان ہی نہیں میری حسن و خوب صورتی پر فریفتہ بھی تھا۔ گویا میرا عاشق تھا۔ میں نے مٹھن گاؤں کا رخ کیا اور اس کی خدمت میں حاضر ہو کر اسے اپنی مجبوری و بے بسی کی کہانی سنائی۔ میری درد بھری کہانی سن کر اس نے پانچ برس کی معصومہ کی جانب دیکھا اور کچھ سوچ کر بولا۔

''آج سے تیری اس بیٹی کی تعلیم اور تربیت پرورش کی تمام تر ذمہ داری میری ہے۔ اس لڑکی کی طرف سے تو اپنا دل مطمئن کر لے شاہنواز رستم تیری بیٹی کی دیکھ بھال اور پرورش شہزادیوں کی طرح کرے گا۔'' اس نے وہی جواب دیا جس کی مجھے اس کی ہستی سے امید تھی۔

سب سے پہلے اس نے ہمیں شہر لاہور میں ایک عالی شان فلیٹ کرائے پر لے کر اس میں رہائش اختیار کرنے کو کہا اور پھر معصومہ کی دیکھ بھال ایک آیا کے سپرد کر دی۔

"تیری بیٹی کی خدمت کے لئے ہم نے ایک پڑھی لکھی آیا مقرر کر دی ہے۔ تجھے صرف ہماری خدمت کرنی پڑے گی۔" اس نے اپنی فطری خواہش کا بڑی بے خوفی سے اظہار کر دیا۔

چونکہ وہ میری معصومہ کی پرورش پر واقعی دل کھول کر اپنی دولت لٹا رہا تھا اس لئے میں اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس کی بیوی کے فرائض انجام دیتی رہی، میری خواہش تھی کہ وہ اس رشتے، اس تعلق کو ایک نام دے دے۔ ناجائز تعلقات کو نکاح کر کے جائز بنا دے لیکن وہ اس بات کے حق میں نہیں تھا میں نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا اور زندگی کی گاڑی کو اس کے رحم و کرم پر چلنے دیا۔

وقت کا چکر چلتا رہا اور میری معصومہ نے بہت اچھے نمبروں سے میٹرک پاس کر لیا۔

خوب صورتی میں وہ میرا ہی عکس تھی اچھی خوراک اور بے فکری نے سونے پر سہاگے کا کام کیا وہ وقت سے پہلے ہی جوان دکھائی دینے لگی۔ اس کی اٹھان قیامت خیز تھی۔ بس یہیں کہانی نے ایک دم سے بالکل اچانک قطعی غیر متوقع طور پر ایک نیا موڑ لے لیا۔

کہتے ہیں کہ مرد کی نیت کا کوئی اعتبار نہیں مرد کے اندر چھپا شیطان کب اور کس وقت انسانیت و شرافت کا لبادہ اتار کر اپنی حیوانیت اور کمینگی دکھانے کے لئے باہر آن کودے، کوئی نہیں بتا سکتا اگر اس حیوان کو اپنے نفس یا اپنے جذبات پر قابو ہوتا تو آئے دن اخبارات میں اس کی حیوانیت کے لرزہ خیز قصے نہیں چھپ رہے ہوتے؟ چھوٹی چھوٹی معصوم بچیاں اس درندوں کی درندگی کا نشانہ بن کر اپنی زندگیوں سے ہاتھ نہ دھوتیں؟

وڈیرا شاہنواز رستم بھی ایک ایسا ہی نفس کا پجاری کمینہ انسان نکلا معصومہ کی خوب صورتی اور معصومیت نے کب اسے گھائل کیا اور وہ خود بھی نہیں جان سکا ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ۔

"جانم! میں تیری بیٹی سے نکاح کرنے کا خواہش مند ہوں۔ مجھے اس کے معصوم حسن نے بچھاڑ کر رکھ دیا ہے۔" اس کمینے کے یہ الفاظ سن کر مجھ پر بجلی سی آن گری خدا جانے وہ کمینہ کب سے میری بیٹی کو اپنی میلوں نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ حالانکہ معصومہ اس کی پوتی اور نواسی کی عمر کی تھی لیکن وہ اس پر بھی بری نیت لگائے بیٹھا تھا۔ میں یہ کیسے برداشت کر پاتی کہ جو مرد کئی سالوں سے میرے وجود کو مانند گدھ نوچ جا رہا تھا اس کے بھیانک پنجے میری معصومہ کے جسم کو بھی گھائل کریں۔ اس وقت تو میں اس خبیث کے سامنے مصلحتاً چپ اختیار کئے رہی لیکن جب وہ اپنے گاؤں روانہ ہو گیا تو میں نے اسی دن اس کے کرائے کا فلیٹ چھوڑ دیا اور میں نے خیال کیا کہ نئے شہر میں شاہنواز رستم اور اس کے پالتو کتے ہمیں ڈھونڈ نہیں پائیں گے لیکن؟ یہ محض میری خام خیالی تھی بمشکل چار مہینے ہی خیریت سے گزرے تھے کہ ایک دن وہ شیطان میرے گھر کی دہلیز پر کھڑا بڑی خباثت سے مسکراتے ہوئے حیرت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"دیکھو ہم آ گئے، جانم! تو دنیا کے کسی بھی کونے میں جا کر چھپ جا، یہ شاہنواز رستم تجھے ہر جگہ سے ڈھونڈ نکالے گا۔ سچے عاشق کی تو یہی پہچان ہوتی ہے اور تو تو جانتی ہے کہ ہم تو تیرے عاشق ہیں صدیوں پرانے۔" اس نے اپنی بھونڈی آواز میں گا کر کہا، اگلے ہی لمحے وہ ایک دم سے

سنجیدہ ہو گیا اور مجھے اپنی قہر برساتی نگاہوں سے گھور کر کسی زہریلے سانپ کی مانند پھنکارتے ہوئے بولا۔

''وڈیرا شاہنواز رستم کے چنگل سے آج تک کوئی بچ کر نکل پایا ہے جو تو نے یہ گستاخی فرمائی۔ یہ وڈیرا قبر تک تیرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اس لئے دوبارہ ایسی کوئی کوشش نہ کرنا کیونکہ ہمیں لوگوں کو ڈھونڈنے سے سخت کوفت محسوس ہوتی ہے۔'' وہ یہ کہہ کر گھر میں گھس آیا اور ایک شان تفاخر سے صوفے پر جا بیٹھا۔

''آخر! اس قدر ناراضگی کی کیا وجہ ہے؟'' اس نے پھر سے محبت کی چاشنی لہجے میں بھر لی۔

''کان کھول کر سن لو شاہنواز! میں اپنی بیٹی کا نکاح تم سے کسی قیمت پر بھی نہیں کروں گی تمہیں یہ بات اپنی زبان پر لانے سے قبل سوچنا چاہئے تھا کہ میری معصومہ تمہاری پوتی اور نواسی کی عمر کی ہے۔ حالانکہ عمر کے لحاظ سے میں بھی تمہاری بیٹی کی عمر کی ہوں لیکن اس کے باوجود تم کئی سالوں تک میرے جسم کو روندتے رہے۔ بھوکے گدھ کی مانند نوچتے رہے لیکن میں یہ ظلم اپنی معصومہ بچی پر ہرگز ہونے نہیں دوں گی۔'' میں نے اس شیطان کو اپنے دوٹوک فیصلے سے آگاہ کر دیا، وہ بدستور مسکراتا رہا، مجھے اس کی مسکراہٹ بہت زہر لگ رہی تھی، میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اس بڈھے کا گلا دبا کر اس کا قصہ ہی تمام کر ڈالتی۔

''اتنی سی بات کے لئے گھر چھوڑ کر جانے کی کیا ضرورت تھی؟ ایک بات ہم سے بات تو کی ہوتی ہم نے آج تک تیری کوئی بات رد کرنے کی ہمت کی ہے جو یہ بات نہیں مانتا جان من۔'' اس کے لبوں سے ادا ہونے والے یہ الفاظ مجھے غریق حیرت کر گئے۔

''کیا مطلب؟'' میں نے اپنی حیرت کو زبان بخشی۔ ''بیگم صاحبہ کو وہ پیپر دکھاؤ۔'' اس نے اپنے ساتھ آئے ایک پالتو غنڈے کو اشارہ کیا۔

اس کے بندوق بردار پالتو غنڈے نے بغل میں دبی ایک فائل نکالی اور فائل کھول کر اس میں سے ایک کاغذ نکال کر میری جانب بڑھایا۔

اللہ جانے کیوں میرا ماتھا ٹھنک اٹھا اور مجھے وہ لمحات یاد آ گئے۔ جب میری معصومہ کو پہلی بار ایک نامور انگلش میڈیم میں داخل کرواتے وقت شاہنواز رستم نے معصومہ کے کچھ ضروری کاغذات کے ساتھ ایک بالکل کورے کاغذ پر یہ کہہ کر میرے سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے کا نشان اور میرے نام کے سائن لئے تھے کہ یہ اسکول کے پرنسپل کا حکم ہے۔ میری بے وقوفی یا کم عقلی کہہ لو کہ میں نے اس شیطان کی باتوں پر اندھا اعتماد کرتے ہوئے اس کورے کاغذ پر اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کا نشان لگا کر اور اپنے سائن کر کے کاغذ اس کے حوالے کر دیا۔ اب وہی کاغذ میرے ہاتھوں میں تھا اور اس پر یہ مضمون تحریر تھا۔

میں جانم شہزادی اپنے پورے ہوش و حواس میں یہ تحریر لکھوا رہی ہوں کہ وڈیرا شاہنواز رستم جو میری التجا پر میری بیٹی معصومہ کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر جتنی رقم خرچ کر رہا ہے، معصومہ کی تعلیم مکمل ہوتے ہی میں وڈیرے شاہنواز رستم کی ایک ایک پائی ادا کرنے کی ذمہ دار ہوں گی۔

اگر کسی مجبوری کے تحت میں وڈیرا شاہنواز رستم کا قرض نہیں کر سکی یا قرض کی رقم کی مکمل ادائیگی سے قبل مجھے کچھ ہو گیا تو میری بچی معصومہ پر سب سے پہلا حق وڈیرا شاہنواز رستم کا ہی ہوگا۔ وڈیرا شاہنواز رستم اگر چاہے تو میری بیٹی کو اپنی بیوی کا درجہ بھی دے سکتا ہے۔ مجھے اس نکاح پر کسی بھی قسم کا کوئی اعتراض نہیں بلکہ میں وڈیرا شاہنواز رستم کی اس مہربانی پر ان کی احسان مند رہوں گی۔''

یہ سب پڑھ کر میں اپنی پوری جان سے لرز اٹھی، غصے کا حملہ ہوتے ہی میں نے اس کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے اس شیطان کے منہ پر دے مارے۔

''کوئی بات نہیں۔ یہ تو فوٹو کاپی تھی۔ اس تحریر کی اصل کاپی میری حوصلی کے ایک کمرے کی خفیہ تجوری میں محفوظ ہے۔ اب تو یہ بتا کہ اس تحریر کو پڑھنے کے بعد تیرا آخری فیصلہ کیا ہے؟ ہمارے کان تیرا فیصلہ سننے کو ترس رہے ہیں۔'' وہ بولا۔

''تم نے میری بیٹی کی پرورش اور تعلیم پر کل کتنا خرچ کیا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''خرچ تو بے حساب کئے ہیں۔ اگر گنوانے بیٹھ جاؤں تو بات لاکھوں کے دائرے سے نکل کر کروڑوں کی حدود میں داخل ہو جائے گی۔ لیکن کچھ موٹا موٹا حساب میں نے لکھ رکھا ہے، تیری ان مہربانیوں کی قیمت نکال کر جو تو نے میری زندگی کی راتوں کو رنگین بنا کر مجھے خوشی بخشی، صرف 20 لاکھ روپے بنتے ہیں۔'' اتنی بڑی رقم کا سن کر مجھے اپنے پیروں تلے کی زمین سرکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

''صرف بیس لاکھ روپے۔ اگر تو مجھے میری یہ رقم نقد اور یک مشت ادا کر دے تو میں اپنے دل سے معصومہ کی طلب نوچ کر پھینک سکتا ہوں۔'' اس نے اسی شیطانی مسکراہٹ سے کہا تو میں سوچوں کے سمندر میں ڈوب کر رہ گئی۔

''ٹھیک ہے! میں تمہارے بیس لاکھ روپے ادا کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن مجھے کچھ مہلت درکار ہے۔'' میں نے بنا سوچے سمجھے کہہ دیا۔

''کیوں نہیں جان من! حکم کر کتنی مہلت چاہئے۔'' وہ بے حد مہربان سا ہونے لگا۔

''بیس لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی اور جمع کرنے میں بہت دن چاہئیں کم از کم دو سال کا وقت تو دینا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے! وڈیرا شاہنواز رستم نے اپنی جانم کو دو سال عنایت کئے۔'' اس نے لاپروائی سے کہا میں بدستور الجھی الجھی سی رہی۔

''دو سال گزرنے سے قبل تم ہمیں بے جا ہراساں اور پریشان ہرگز نہیں کرو گے۔'' میں اس کی فطرت سے واقف تھی اسی لئے میں نے یہ بات کہی۔

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ دو سال کی مہلت تمام ہونے سے قبل میں ایسی کوئی اوچھی حرکت نہیں کروں گا جو تیرے لئے کسی ذہنی اذیت کا باعث بنے۔ ہاں! البتہ آج سے ٹھیک دو سال بعد میں تیرے در پر سوالی بن کر آؤں گا اور تیری بیٹی کو اپنی بیوی بنا کر اپنے گوٹھ لے جاؤں گا۔'' وہ لطیف سی سسکی خارج کر کے رہ گیا اس بڈھے کی یہ حرکت میرے پورے تن بدن میں غصے کی آگ سی بھڑکا گئی۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں تمہارے بیس لاکھ روپے تمہارے منہ پر دے ماروں۔'' میں اپنے لہجے کی نفرت پوشیدہ نہیں رکھ سکی۔

''نہیں! یہ نہیں ہو سکتا۔ اب تیرے حسن اور جسم میں وہ پہلی سی کشش نہیں رہی کہ کوئی مجھ سا دیوانہ تیری ایک مسکراہٹ۔ یا ادا پر ہزاروں روپے قربان کر ڈالے۔ تیرے لئے پانچ لاکھ روپے کس طرح جمع کر پائے گی۔'' اس نے جانے سے قبل مجھے گہری چوٹ پہنچائی۔

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔'' میں نے جل کر جواب دیا تو وہ قہقہے اگلتا ہوا دفعان ہو گیا۔

اس کے جاتے ہی میں سوچوں کے بھیانک و تاریک جنگل میں کئی لمحات تک بھٹکتی رہی میں نے معصومہ کو اس جانور سے بچانے کے لئے

بیس لاکھ روپے یک مشت اور نقد ادا کرنے کا وعدہ تو کر لیا تھا لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی پریشان ہو اٹھی تھی کہ میں اتنی بڑی رقم کا بندوبست کیسے کروں گی؟ اور اس بات کا بھی مجھے اچھی طرح علم تھا کہ چاہے میں دس شہر بدل لوں لیکن وڈیرا شاہنواز رستم کی پہنچ سے دور نہیں بھاگ سکتی۔ وہ ایک ایسا کتا ہے جو میری بو سونگھتا ہوا ہر جگہ آن وارد ہو گا۔

میں جانتی تھی کہ میرے لئے بیس لاکھ روپے کا انتظام کرنا کوئی آسان کام نہیں لیکن میں نے پھر بھی اپنی کوششوں کا آغاز کر دیا اور ہاتھ پیر چلانے شروع کر دیئے، میں بھکارن بن کر ہر اس در پر گئی جہاں سے مجھے ایک روپیہ بھی ملنے کی امید تھی لیکن؟

''سیانے کہہ گئے ہیں کہ جب کسی انسان پر برا وقت آتا ہے تو سب سے پہلے اس کا اپنا سایہ ساتھ چھوڑ جاتا ہے..... میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ درپیش آیا۔ وہ لوگ جن کے بارے میں میرا یہ خیال تھا کہ میرے فن کے سچے قدردان ہیں وہ بھی سب وڈیرا شاہنواز رستم کی طرح محض میرے حسن و شباب کے قدردان نکلے..... انہوں نے پانچ سے دس ہزار تک کی مدد کرنے کا وعدہ تو کیا لیکن ان کا وعدہ اس بات پر مشروط تھا کہ وہ میری معصومہ کا رقص دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ ایسے مطلب پرست اور خود غرض انسانوں کی امداد مجھے قبول نہیں تھی..... کیا کرتی؟ تھک ہار کر غیبی مدد کی آس لگائے بیٹھ گئی۔

لمحات مٹھی میں بند ریت کی مانند تیزی سے پھسلتے چلے گئے اور پلک جھپکتے ہی ایک سال گزر گیا اس دوران وڈیرا شاہنواز رستم نے اپنے وعدے کا مکمل پاس رکھا اور مجھے ہراساں یا پریشان کرنے کی کوشش تک نہیں کی..... البتہ ایک سال مکمل ہوتے ہی وہ ایک دن بڑا سا کیک لئے حاضر ہو گیا۔

''یہ لے کھا۔'' اس نے کیک کے دل پر چھری چلائی اور کیک کا ایک ٹکڑا کاٹ کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ کس خوشی میں؟'' میں نے اس کا کیک تھامے ہاتھ کو اپنے لبوں سے دور ہٹاتے ہوئے غصے سے دریافت کیا۔

''ہماری کامیابی اور تیری ناکامی کی خوشی میں..... ہم جانتے ہیں کہ تو اب تک بیس لاکھ کی رقم کا چوتھائی حصہ بھی جوڑ نہیں پائی ہے اور نا ہی جوڑ پائے گی اب بھی وقت ہے ہماری بات مان لے تیری بیٹی تو کیا تو بھی اپنی باقی زندگی عیش و آرام سے بسر کرے گی۔'' اس نے خباثت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ابھی مہلت کا ایک سال باقی ہے۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ میں اس کے سامنے کمزور پڑنے کے حق میں نہ تھی۔

''ٹھیک ہے جانم! جیسے تیری مرضی زندگی رہی تو آئندہ سال قاضی اور گواہان کے ساتھ تشریف لاؤں گا اور دونوں میں سے کوئی ایک اپنی امانت لے جاؤں گا انشاءاللہ۔'' اس نے ایک عزم و یقین سے کہا اور کیک کا ٹکڑا اپنے منہ میں ٹھونستے ہوئے چلا گیا۔

جب کہیں سے بھی امید کی کوئی کرن دکھائی نہ دی تو بہت سوچنے اور سمجھنے کے بعد میں نے اس مسئلے کا ایک حل از خود ہی تلاش کر لیا..... یہ تو طے ہے کہ میں کسی قیمت پر اپنی معصوم سی ننھی پری کو اس دیوزاد کے حوالے نہیں کروں گی..... اسی لئے میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جو نوجوان میری معصومہ سے شادی کا خواہش مند ہو گا وہ میری معصومہ کو بیس لاکھ روپے کے عوض ہی پا سکتا ہے۔'' جانم کے آخری الفاظ بابو کے حواسوں پر بجلی بن کر گرے۔

''میری! اس بات سے تم یہ سمجھ لینا کہ میں اپنی بیٹی کا سودا کر رہی ہوں..... یہ ایک بے بس ماں کی مجبوری ہے اگر تم واقعی معصومہ سے سچی

محبت کرتے ہو اور اس سے شادی کے خواہش مند ہو تو پہلے تمہیں معصومہ کو وڈیرا رستم کے چنگل سے رہائی دلانی ہوگی وہ وڈیرا شاہنواز رستم کی ایک ایسی نادیدہ جیل میں قید ہے جس کی چابی بیس لاکھ روپے کی رقم ہے۔'' جانم نے اتنا کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔ بابو بھی کئی لمحات تک گم صم بیٹھا سوچوں کی وادیوں میں بھٹکتا رہا۔ اس کے سان وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ معصومہ کے حصول میں کوئی رکاوٹ اس کے راستہ روک پائے گی۔ لیکن اتنی بڑی رکاوٹ حائل ہو جائے گی اسے کیا معلوم تھا؟

''اگر معصومہ کی شادی تم سے ہوئی تو یقین مانو مجھے بے حد خوشی ہوگی...... معصومہ کے دل کی تمنا بھی یہی ہے کہ وہ صرف تمہاری دلہن بنے...... اگر ایسا نہیں ہوا تو وڈیرا شاہنواز رستم کی دی ہوئی مہلت پوری ہونے سے قبل میں اپنے ہاتھوں سے اپنی معصومہ کو زہر دے کر ہلاک کر دوں گی اور خود بھی زہر پی کر یہ دنیا چھوڑ کر چلی جاؤں گی کیونکہ میں اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی معصومہ کی زندگی برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتی...... اسے شاہنواز رستم کی منکوحہ بنتے نہیں دیکھ سکتی۔'' بابو کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا جب اس نے جانم کو اپنے سامنے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیکھا...... وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپے اس طرح روئے جا رہی تھی جیسے کسی نے اس کی عمر بھر کا کل اثاثہ چھین کر اسے قطعی بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہو...... ویسے دیکھا جائے تو معصومہ اس کی زندگی کا کل اور بے حد قیمتی اثاثہ ہی تھی جو وڈیرا شاہنواز رستم اس سے جبری چھین کر لے جانے کے درپے تھا۔

''وڈیرے کی دی ہوئی مہلت کو ختم ہونے میں باقی کتنے ماہ رہ گئے ہیں؟'' طویل خاموشی کے بعد اس نے سوال کیا۔

''کتنے ماہ؟ صرف بیس دن رہ گئے ہیں بیٹا...... صرف بیس دن۔'' جانم کے لہجے میں کرب سا گھل کر رہ گیا۔

''کیا؟ صرف بیس دن؟'' وہ بے اختیار چیخ اٹھا جانم نے اقرار میں گردن ہلا دی۔

''اسی لئے میں ایک بار پھر اس کمینے سے چھپتی پھر رہی ہوں حالانکہ میں جانتی ہوں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں لیکن......؟ جانتے ہو اس کتے کے خوف و دہشت کی وجہ سے میں نے اسی سال کرائے کے سات مکان تبدیل کیے ہیں۔'' جانم نے بتایا۔

''یہ تو بہت کم مدت رہ گئی ہے۔'' بابو کا ذہن اسی ایک نقطے پر اٹک کر رہ گیا تھا۔ اس کے ان الفاظ نے جانم کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ ''بیس دنوں میں کوئی لاکھ روپوں کا بندوبست نہیں کر سکتا بیس لاکھ روپے کہاں سے آئیں گے؟'' بابو کے چہرے پر تفکرات کا جال سا پھیل کر رہ گیا۔ جانم مایوسی سے ایک طویل سانس خارج کر کے رہ گئی۔

یہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا اتفاق تھا کہ اسے کسی مرد کو پہچاننے میں ذرا سی چوک ہو گئی تھی۔ بابو کے تن پر سجے قیمتی لباس اور اس کے شاہانہ انداز نے جانم کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ بابو کسی امیر و کبیر والدین کا اکلوتا بیٹا ہے۔ سونے پر سہاگہ ان بیش قیمت تحائف نے کیا جو بابو نے معصومہ کے حسن و شباب کے دربار میں پیش کیے لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ بابو ایک غریب ماں باپ کا لاڈ و پیار میں بگڑا ہوا ایسا نوجوان ہے جو معصومہ کو پانے کے لئے قرض لے کر قیمتی تحائف تو دے سکتا ہے...... اس سے شادی کر کے اس پر اپنی بے تحاشہ محبت کی دولت تو لٹا سکتا ہے لیکن نوٹوں کی بارش کرنا...... یا معصومہ کے قدموں تلے نوٹوں کا قالین بچھا دینا اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔

اپنی حسین و جمیل بیٹی کو ایسے جذباتی عاشقوں کے حوالے کر دینا جانم کو کسی صورت گوارا نہ تھا وہ گزشتہ کئی دنوں سے اسی نقطے پر سوچے جا رہی

تھی کہ کیا تدبیر اختیار کی جائے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی سلامت رہے...... گویا اس خوب صورتی سے بابو کو معصومہ کی زندگی سے خارج کیا جائے کہ بابو پر ان کی مکاری وعیاری بھی عیاں نہ ہو اور وہ معصومہ کو پانے کی امید بھی ہار بیٹھے اسی لئے بہت سوچ کر جانم نے یہ ڈرامہ رچایا...... اس نے سوچا کہ یہ ڈرامہ اگر کامیابی سے ہمکنار ہو جاتا ہے تو اس کا دامن بیس لاکھ کی خطیر رقم سے بھر جائے گا اتنی بڑی رقم کے عوض اگر چند دنوں کے لئے معصومہ کو بابو کے نکاح میں دے دیا جائے تو کوئی حرج نہیں کہ ایسے وقتی نکاح اس نے اپنے اور اپنی بیٹی کے بہت کئے تھے......اور اگر یہ ڈرامہ ناکامی سے دوچار ہوتا ہے تب بھی جانم کو یہ فائدہ تو ضرور پہنچے گا کہ بابو جیسے کنگلے عاشق سے اس کی بیٹی کی جان آزاد ہو جائے گی۔

''کیا سوچ رہے ہو بیٹا؟'' جانم کی آواز نے اس کے سوچوں کی دیوار میں دراڑسی ڈال کر رکھ دی وہ اس طرح چونک اٹھا جیسے گہری نیند سے بیدار کیا گیا ہو۔

''بیس لاکھ روپے کے حصول پر غور کر رہا ہوں۔'' بابو کے جواب نے جانم کے چہرے پر مسرت کی سرخی بکھیر کر رکھ دی۔

''بیس لاکھ روپے کا انتظام تمہیں کرنا ہی ہوگا بابو۔'' معصومہ کی آواز پر اس نے گردن گھما کر دیکھا اس کی محبت معصومہ سامنے کھڑی امید بھری نگاہوں سے اسے گھور رہی تھی۔ یہ دیکھ کر بابو تڑپ اٹھا کہ معصومہ کی حسین آنکھوں کے کنارے نمکین پانی سے اس طرح لبالب بھرے ہوئے تھے جیسے کسی بھی آنے والے لمحے میں چھلک پڑیں گے۔

''معصومہ۔'' وہ ایک دم سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ معصومہ کے چہرے پر بکھرا کرب اسے بے موت مار گیا۔

''صرف تم ہی مجھ سے محبت نہیں کرتے ہو بابو؟ میں نے بھی تمہیں اپنی دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے ہاں بابو یہ سچ ہے کہ میں بھی تمہاری محبت میں گرفتار ہو چکی ہوں اور تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میں جانتی ہوں کہ بیس لاکھ روپے کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی لیکن میری خاطر...... ہماری محبت کی خاطر تمہیں بیس لاکھوں روپے کا بندوبست کرنا ہی ہوگا ورنہ......؟ میں زہر کھا کر اپنی جان دے دوں گی۔ تم نہیں تو کوئی نہیں۔''

معصومہ کے لبوں سے محبت کا اظہار سن کر اور اس کی محبت کی شدت دیکھ کر وہ حیرت سے بت سا بن کر رہ گیا اس نے تو کبھی خواب وخیال میں بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ معصومہ کے دل میں اس کی ہستی کے لئے اس قدر محبت نے اپنی جگہ بنالی ہے...... اس سچائی اس خوشگوار احساس نے اسے خوشیوں کا خزانہ سونپ دیا۔

''میں اپنی پوری کوشش......'' اس سے پہلے کہ بابو اپنی بات مکمل کر پاتا معصومہ ایک دم سے بول پڑی۔

''نہیں...... کوشش نہیں بابو! وعدہ...... وعدہ کرو کہ تم ہماری محبت کی خاطر بیس لاکھ روپے کہیں سے بھی کچھ بھی کر کے ضرور لاؤ گے۔''

معصومہ نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''ہاں! میں وعدہ...... وعدہ کرتا ہوں کہ ہماری محبت کی خاطر میں کچھ بھی کر کے بیس لاکھ روپے لے کر آؤں گا۔ تت...... تم مجھ پر بھروسہ رکھو...... تمہارے یہ آنسو بہت قیمتی ہیں ان بیش قیمت موتیوں کو یونہی بہا کر ضائع مت کرو...... تمہیں پانے کے لئے میں کچھ بھی کر گزروں گا۔'' اس نے بے اختیار اپنی بانہیں کشادہ کر لیں وہ معصومہ کو...... اپنی معصوم محبت کو اپنے سینے سے لگانے کا خواہش مند تھا۔ معصومہ نے اسے مایوس نہیں کیا اور

ایک دم سے اس کے چوڑے اور مضبوط سینے سے جا لگی ایک ٹھنڈک سی بابو کے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ اس نے اپنی کشادہ بانہوں کا حلقہ تنگ کر لیا وہ اپنی چاہت کو پوری طرح اپنے وجود میں سما لینا چاہتا تھا۔

جانم خاموشی سے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی وہ دو محبت کرنے والوں کی محبت میں حائل ہونا نہیں چاہتی تھی۔

''میں تم سے بے حد و حساب محبت کرتی ہوں بابو...... میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔'' معصومہ کی آواز بھر آئی۔

''ایسی باتیں نہیں کرتے...... میں اپنی چاہت کو مرنے نہیں دوں گا۔'' اس نے اپنی بانہوں کی گرفت مزید تنگ کر دی اس کا نازک بدن بابو کے دل کی دھڑکنوں میں فساد سا برپا کر چکا تھا۔

''تم بیس لاکھ روپے کہاں سے لاؤ گے؟'' معصومہ نے یونہی پوچھ لیا۔

''اب یہ تمہارا مسئلہ نہیں میرا سر درد ہے...... تم قطعی بے فکر ہو جاؤ۔'' بابو نے اسے اپنی بانہوں کے حلقے سے آزاد کرتے ہوئے بے انتہا محبت سے کہا۔

''میرا دل کہتا ہے کہ تم مجھے اس بڈھے وڈیرے کی گرفت سے ضرور رہائی دلاؤ گے۔'' معصومہ کی بے انتہا محبت اور یقین نے اسے حوصلہ عطا کیا۔

''اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔'' یہ کہہ کر بابو نے اسے ایسی نگاہوں سے گھورا جن میں بے انتہا محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

وہ شرم سے سر جھکا کر رہ گئی۔ بابو نے اس کا حسین چہرہ اپنے ہاتھوں کے کٹورے میں بھر کر اوپر اٹھایا اور چند لمحوں تک اس کی آنکھوں میں جھانکتے رہنے کے بعد وہ اس کے چہرے پر جھک گیا۔

ہونٹوں کے راستے اس کے حسن و شباب اور جوانی کی چھلکتی ہوئی شراب سے سیراب ہونے کے دوران اس کے اندر لگی آگ ذرا سی گرمی یا حرارت پا کر ایک دم سے اس شدت سے بھڑک اٹھی کہ وہ معصومہ کے نرم و نازک بدن کو بری طرح دبوچ کر اپنے اندر کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگا...... لیکن جب معصومہ نے یہ محسوس کیا کہ بابو کی چھیڑ خانیاں اپنی حد سے تجاوز فرمانے لگی ہیں تو بارود کے ڈھیر میں دھماکہ ہونے سے قبل معصومہ نے اس کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد کیا اور اپنے کپڑوں کی شکنیں درست کرتی ہوئی اس کے وجود سے دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

وہ جذبات کے تیز بہاؤ پر فوری طور پر قابو نہ پا سکا اور اکھڑی سانسوں سے اس کی جانب دیکھ کر رہ گیا...... معصومہ کا یوں ایک دم سے چکنی مچھلی کی مانند اس کی گرفت سے نکل کر رہ جانا اسے بری طرح تڑپا گیا۔

ابھی تو اس نے حسن کی چھلکتی اس شراب سے صرف اپنے ہونٹ ہی تر کیے تھے...... ابھی اس کی پیاس بجھنے بھی نہ پائی تھی کہ شراب اس سے دور کر دی گئی...... وہ ایک بار پھر تیزی سے معصومہ کی جانب لپکا تاکہ اپنی برسوں کی تشنگی مٹا سکے...... لیکن اس سے قبل کہ وہ اس حسن کی دیوی کو چھو پاتا......؟

''رک جاؤ بابو۔'' معصومہ نے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر اس قدر سخت لہجے میں یہ الفاظ ادا کیے کہ بابو کے بڑھتے قدم ایک دم سے ٹھہر سے گئے۔

''میرا سب کچھ تمہارا ہے...... صرف تمہاری امانت ہے...... سر سے پاؤں تک میرے وجود کے صرف تم مالک ہو...... لیکن تمہیں پہلے میرے سر پر لٹکی ہوئی وڈیرا شاہنواز رستم کے نام کی دو دھاری تلوار کے خوف سے مجھے نجات دلانی ہوگی...... یہ میرا وعدہ ہے کہ جس دن مجھے اس بڈھے کے خوف سے رہائی حاصل ہوئی میں دھول کر تمہارے قدموں میں بچھ جاؤں گی...... محبت کی ٹھنڈی میٹھی پھوار بن کر اس طرح تم پر برستی رہوں گی کہ تمہارے اندر لگی آگ کو برف کی مانند ٹھنڈا کر کے رکھ دوں۔'' معصومہ کی بات سن کر اس نے اپنے جذبات کے منہ زور گھوڑے کی لگام کھینچی اور اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش میں ایک خالی صوفے پر جا بیٹھا۔

''تمہیں برا تو نہیں لگا بابو؟'' معصومہ اس کے قریب چلی آئی اور اس کے کاندھے پر اپنا ایک ہاتھ رکھ کر محبت سے دریافت کیا۔

''نہیں۔'' وہ یہ کہہ کر ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا اور ''چلتا ہوں'' کہہ کر جانے کے لئے قدم بڑھانے شروع کر دیئے۔

''میں کل اپنی ایک کالج فیلو اور میری بہت اچھی دوست سفینہ اقبال کے پاس کوئٹہ جا رہی ہوں۔'' معصومہ کی آواز پر وہ دروازے کی خلاء میں جا کر رک سا گیا تاہم اس نے چہرے گھما کر اسے دیکھنے کی زحمت گوارہ نہ کی۔

''میں دعا کروں گی کہ تم خالی ہاتھ نہ آؤ اور تمہاری آمد کی شدت سے منتظر بھی رہوں گی تم یہاں آنا چاہو تو آ سکتے ہو لیکن میں تمہیں اب یہاں نہیں ملوں گی...... میں سفینہ اقبال کے پاس کوئٹہ جا رہی ہوں...... غیر معینہ مدت کے لئے۔'' معصومہ کے لہجے میں دکھ عیاں تھا۔

''ایک بار پھر کہہ رہی ہوں مجھے مایوس مت کرنا۔ تمہارے پاس صرف بیس دن ہیں اور اتنے ہی دن کی میری زندگی بھی ہے...... میں تمہارا انتظار کروں گی۔'' معصومہ کی بات تمام ہوتے ہی اس نے اپنے پورے وجود کے ساتھ گھوم کر اس کی جانب دیکھا...... لبوں پر تسلی آمیز مسکراہٹ سجا کر خاموشی کی زبان میں اس نے معصومہ کو اپنی آمد کا یقین دلایا اور ایک دم سے دروازے کی خلاء عبور کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

جب سے اسے معصومہ کے معصوم حسن اور قیامت خیز شباب نے محبت کی راہ پر گامزن کیا تھا اس نے جانم کے گھر کی دہلیز کو اپنی مسجد، اپنا مندر سمجھ لیا تھا۔ اس کے دل کے نہاں خانوں میں کہیں دبی ہوئی یہ خواہش سی مچل رہی تھی کہ کاش وہ حسن کی دیوی بھی اس کی محبت کی آگ کی تپش کو اپنے بہت قریب محسوس کر سکے اور جب جانم نے اسے یہ نوید مسرت سنائی کہ معصومہ بھی اس کی ہستی سے محبت کرتی ہے تو اس نے سوچا کہ آخر معصومہ خود اپنی شیریں زبان سے محبت کا اظہار اس کے سامنے بیٹھ کر...... اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کیوں نہیں کرتی؟ غضب تو یہ تھا کہ اس نے بابو کے سامنے آنا ہی کم کر دیا پورے دن کے صبر آزما انتظار کے بعد اسے معصومہ کی صرف ایک جھلک دیکھنا نصیب ہوتا جو اس کی قوت برداشت کا امتحان بن کر رہ جاتی...... معصومہ کی یہ سنگ دلی اسے پاگل سا کر گئی اسے پانے کی طلب میں شدت پیدا ہوتی چلی گئی...... کبھی اگر معصومہ اس کے سامنے آن کر بیٹھ بھی جایا کرتی تو وہ جانم کی موجودگی کے باعث اس سے کوئی بات نہیں کر پاتا اور نا ہی معصومہ ہی اپنے لبوں پر لگی چپ کی مہر توڑنے کی کوشش کرتی...... بس اپنے یاقوتی لبوں پر شریر سا تبسم رقصاں کئے اسے محبت کے خزانے لٹاتی نگاہوں سے گھورے چلی جاتی...... اس کی ہر ادا اس قدر قاتلانہ ہوا کرتی کہ بابو کے دل پر چھریاں سی چلتی رہتیں...... وہ اکثر سوچا کرتا کہ اگر معصومہ نے اپنی زبان سے اپنی محبت کا اظہار اس کے سامنے کیا تو اس خوشی میں وہ اس کے قدموں میں اپنی جان نچھاور کر دے گا لیکن وہ حسین لمحہ آن کر گزر بھی گیا اور بابو اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنا نہ سکا جو مزا محبت میں ڈوب کر جینے میں تھا وہ ایک دم سے مر جانے میں کہاں؟ اور اب تو اسے معصومہ کی زندگی کی حفاظت کرنے کے لئے بطور خاص جینا اور اسے پانے کی جدوجہد کا آغاز کرنا تھا۔

وہ رات کاٹنا بابو کے لئے کچھ آسان نہ تھی رات بھر وہ بستر پر لیٹا اس طرح کروٹیں بدلتا رہا جیسے اس کا جسم کسی نرم و ملائم آرام دہ بستر پر نہیں بلکہ کسی کنکریٹ بچھی زمین پر برہنہ پڑا ہو اور ہر کروٹ پر بے شمار نوکیلے کنکر اس کے وجود میں پیوست ہو کر اسے بے حد و حساب اذیت سے دوچار کر رہے ہوں...... اذیت تو واقعی اسے بے پناہ اور بے حد و حساب پہنچ رہی تھی یہ سوچ سوچ کر کہ وہ بیس لاکھ روپے جیسی خطیر رقم کا بندوبست کیسے کر پائے گا؟ اتنی بڑی رقم وہ کہاں سے لائے گا؟ کس کے آگے اپنا دامن پھیلائے گا؟ اگر دامن پھیلا بھی دیا تو اتنی بڑی رقم کون بطور قرض دے گا۔''
بیس دن میں بیس لاکھ روپے کا انتظام کرنا کوئی آسان کام نہ تھا...... بابو جیسے غریب بندے کے لئے تو تقریباً ایک ناممکن سی بات تھی...... اسے اپنے ساتھ قدرت کا یہ ایک بہت بھیانک مذاق لگ رہا تھا کیا یہ ظلم کی انتہا نہیں تھی کہ جس انسان نے کبھی بیس ہزار روپے اکٹھے نہ دیکھے ہوں اسے بیس لاکھ روپے کے چکر میں پھانس دیا گیا تھا۔ اسے قدرت کا بھیانک مذاق یا ظلم کا نام نہ دیا جائے تو پھر کیا کہا جائے؟

وہ یہ سوچ کر بے چین سا ہوا اٹھا کہ اگر وہ بیس دن کے اندر بیس لاکھ روپے کا انتظام نہ کر سکا تو کیا وہ معصومہ کو ہمیشہ کے لئے کھو دے گا؟

''نہیں۔'' وہ گھبرا کر ایک جھٹکے سے بستر سے اٹھ بیٹھا۔ معصومہ کو کھو دینے کا تصور ہی اس کے لئے اس قدر کرب انگیز تھا کہ اسے اپنے جسم سے روح نکلتی ہوئی محسوس ہونے لگی...... معصومہ اس کے دل کی دھڑکن تھی، آنکھوں کا نور اور زندگی کا سرور بن چکی تھی...... اب تو معصومہ کے بغیر اس کے لئے زندگی کا تصور ہی بے کار تھا شاید معصومہ کے بغیر وہ ایک دن بھی جی نہیں سکتا تھا۔

پہلے اس کا یہ خیال تھا کہ معصومہ کے حصول کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثریا کی ہستی تھی جسے اس نے اپنی نفرت کے تیروں سے اس

بری طرح چھلنی کر ڈالا کہ وہ رکاوٹ از خود اس کے راستے سے دور ہوگئی...... اس نے اپنی باتوں کے جال میں مستقبل کے سنہرے سپنے دکھا کر اپنے ماں باپ کی زبانوں پر بھی وقتی طور پر خاموشی کے تالے لگا دیئے...... اس نے سوچا تھا کہ وہ معصومہ سے نکاح کر کے جب اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے گھر لے آئے گا تو چند دنوں تک گھر کے ماحول میں کشیدگی کی فضا قائم رہے گی پھر آہستہ آہستہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا...... وہ رمضان کے آگے ہاتھ پاؤں جوڑ کر مدیحہ کا مسئلہ بھی حل کر لے گا اور بختاور سے بھی معافیاں طلب کر کے سب کچھ ٹھیک کر دے گا لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ جیسا اس نے سوچ رکھا تھا ویسا کچھ بھی نہیں ہوگا...... قدرت نے اس کے سوچوں کی تمام بساط ہی اس سہولت سے الٹ کر رکھ دی تھی کہ وہ بس دیکھتا ہی رہ گیا...... معصومہ جیسے انمول ہیرے کو پانے کے لئے اب اس کی راہ میں بیس لاکھ روپے جیسی ناقابل عبور رکاوٹ آن کھڑی ہوئی تھی...... بابو یہی سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا تھا کہ کیا وہ بیس لاکھ روپے کی اس طویل ترین دیوار کو بیس دن کے اندر پاٹ سکے گا؟ کیونکہ اس دیوار کو پاٹ کر یا توڑ کر ہی وہ معصومہ تک رسائی حاصل کر سکتا تھا گویا معصومہ دور جدید کی ایسی انارکلی تھی جسے بیس لاکھ روپے کی دیوار میں زندہ مقید کر دیا گیا تھا اب وہی شہزادہ سلیم اس انارکلی کا حق دار پائے گا جو اس انارکلی کو بیس لاکھ روپے کی دیواروں کے درمیان سے نکالنے میں کامیاب رہے گا۔

معصومہ! جو بابو کی زندگی بن چکی تھی، معصومہ جو اس کی خوشیوں و مسرتوں کا خزانہ تھی، معصومہ جس کا بے مثال حسن ایک ایسا نشہ تھا جس کے ایک ہی کش نے بابو کے ہوش اڑا کر رکھ دیئے تھے اور جس کا ذائقہ یاد کر کے وہ اب تک نشے کی سی کیفیت میں جھوم ہی رہا تھا۔

اف! اس نازنین کے نازک بدن کی نزاکت، لطافت اور حرارت کو وہ کیسے فراموش کر سکتا تھا؟ جب اس کا نرم گرم وجود اس کے وجود میں آن کر لگا تھا...... اس لمحے کا تصور کرتے ہی بابو کے پورے وجود میں سرور انگیز گدگدیاں سی ہونے لگیں...... معصومہ کا بے اختیار اس کے وجود سے لپٹ پڑنا...... اس کے بدن کی گرمی اور یاقوتی لبوں سے خارج ہونے والی گرم سانسیں بابو کے وجود میں ایک ایسی آگ بھڑکا گئی تھیں کہ اگر معصومہ ایک دم سے اس کے وجود سے دور نہیں ہو جاتی تو وہ اس آگ میں معصومہ کے وجود کو بھی جلا کر راکھ کر دیتا لیکن اس بے رحم حسینہ نے اس کی پیاس بھڑکا کر اسے پیاسا تڑپنے اور بلکنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا۔

بابو کو کیا معلوم تھا کہ ایسی عورتیں مردوں کی پیاس بھڑکانے اور انہیں تڑپانے کے ہنر سے اچھی طرح واقف ہوتی ہیں بلکہ ایسی لڑکیوں کی تربیت بھی اسی نہج پر کی جاتی ہے کہ انہیں کس طرح حسن و جوانی کے شیدائی مردوں کو پھانسنا اور پھانسنے کے بعد تڑپانا ہے...... مردوں کی تڑپ ہی تو ان کی روزی روٹی کا ذریعہ بنتی ہے ان کی تڑپ کو شانت کرنے ہی کو تو وہ منہ مانگی قیمت طلب کرتی ہیں۔

ایسی ہی تڑپ معصومہ نے بابو کو بھی سونپ دی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ بابو بھی اس کے حسن و جوانی پر فدا ہونے والا ایک ایسا ہی مرد ہے اور اپنی پیاس بجھانے، اپنی تڑپ کو قرار مہیا کرنے کے لئے وہ ہر قیمت پر معصومہ کو پانے کی کوشش کرے گا...... اسی لئے جانم نے اپنی بیٹی کی حسن و جوانی کی اور بابو کی تڑپ و پیاس کی قیمت بیس لاکھ روپے لگائی تھی اور جانم کی اسی بے رحمی نے اس کی تمام ہمت کو کسی گیلے کپڑے کی مانند نچوڑ کر رکھ دیا تھا...... اس کے بے انتہا جوش و جذبے پر ٹھنڈے پانی سے بھری بالٹی انڈیل کر رکھ دی تھی۔ اسے کوئی راستہ سجھائی نہ دے رہا تھا...... وہ اپنی ہستی کو گھپ اندھیروں میں گھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اس کی عقل یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ وہ کہاں جائے؟ کس سمت قدم بڑھائے؟

اس نے اپنی زندگی میں ایک لاکھ روپے کبھی اکٹھے نہیں دیکھے اور نا ہی کبھی ہاتھوں میں لئے اسے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ بیس لاکھ روپے میں کتنے صفر ہوتے ہیں۔ پھر وہ بیس لاکھ روپے کہاں سے پیدا کرے گا۔ اسے تو رقم جمع کرنے کا فن بھی نہیں آتا تھا۔ روپے ہاتھ میں آتے ہی اس کے ہاتھوں میں کھجلی سی ہونے لگتی تھی اور جب تک وہ ہاتھ آئی رقم کا ایک ایک روپیہ خرچ نہیں کر لیتا تھا سکون سے نہیں بیٹھتا تھا اس لئے بیس لاکھ روپے کا انتظام کرنا اسے جوئے شیر لانے سے زیادہ مشکل دکھائی دے رہا تھا تاہم پھر بھی وہ بیس لاکھ کے حصول کے مختلف ذرائع پر غور فرمانے بیٹھ گیا۔

سب سے پہلا خیال اس کے دماغ میں یہ آیا کہ وہ کیوں نہ اپنے بگ باس خان کے سات سالہ نواسے کو اغوا کر لے؟ اور تاوان میں پچیس لاکھ روپے کا مطالبہ کرے اس طرح اسے معصومہ بھی حاصل ہو جائے گی اور مزید پانچ لاکھ کی رقم سے وہ معصومہ کے ساتھ کسی خوب صورت و پر سکون وادی کی سیر کو روانہ ہو جائے گا...... کسی سات سالہ بچے کو اغوا کرنا اگرچہ کوئی مشکل نہیں لیکن اگر وہ سات سالہ بچہ کسی صاحب حیثیت انسان کا ہو تو بڑی مشکلات پیدا کر سکتا تھا اور سب سے اہم بات جو اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی راہ کا سب سے کمزور پہلو تھا وہ یہ تھی کہ اسے بچوں کو اغوا کرنے کا قطعی کوئی تجربہ نہ تھا وہ اس قسم کے کاموں میں اناڑی ہونے کے علاوہ دل سے اس کام کو برا سمجھتا تھا...... اگر وہ معصومہ کو پانے کی خاطر یہ ناپسندیدہ کام انجام دے بھی ڈالے تب بھی یک و تنہا اس کام کو کرنا اس کے بس کا روگ نہ تھا اور کسی دوسرے بندے کو اپنا راز داں بنانا اسے کسی قیمت پر گوارا نہ تھا...... اگر خان باچا کی سماعتوں تک یہ خبر پہنچ جاتی ہے کہ اس کے بے حد لاڈلے نواسے کو اغوا کرنے والی ہستی بابو کی ہے تو وہ بپھرا ہوا بوڑھا شیر اسے اپنی خدمت میں طلب کرنے کے بعد اسے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر فوراً سے بھرا ہوا پستول اس پر تان کر صرف ایک گولی اس کی پیشانی میں پیوست کر کے لمحے بھر کے اندر اس کی زندگی کی کہانی ہی ختم کر کے رکھ دیتا۔

دوسرا خیال اس کے دماغ میں بینک میں ڈاکہ ڈالنے کا آیا اور تیسری سوچ کسی کروڑ پتی کے گھر میں چوری کرنے کی پیدا ہوئی لیکن دونوں خیالات پر اس نے یہ سوچ کر لعنت بھیجی کہ کہیں اس قسم کے کاموں میں اس کا اناڑی پن کوئی بہت بڑا مسئلہ نہ کھڑا کر کے رکھ دے اور اس کی حالت کسی شاعر کے اس شعر جیسی ہو کر نہ رہ جائے۔

''نا خدا ہی ملا نا وصال صنم

نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے''

''یا اللہ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچ کر رہ گیا۔

''اس قدر پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ اپنے باس خان سے بیس لاکھ روپے طلب کر لو'' عقب سے ایک غیر مانوس مردانہ آواز حملہ آور ہوئی۔ وہ ایک دم سے اس طرح اچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے کسی نادیدہ قوت نے اسے پلنگ کے نیچے سے ہاتھ مار کر بلندی کی جانب اچھال دیا ہو۔

''کک کون......؟'' وہ لٹو کی مانند گھوم کر رہ گیا۔ اس کے باوجود کہ اسے وہ غیر مانوس سی مردانہ آواز اپنے بے حد قریب سے سنائی دی تھی، کمرے کے کونے کونے کا بغور جائزہ لینے کے باوجود اسے مردانہ آواز کا وجود کہیں دکھائی نہ دیا لیکن پھر بھی اللہ جانے کیوں اس کا دل یہ کہہ رہا تھا کہ کمرے میں کوئی ایسی ہستی موجود ضرور ہے جس کا وجود اسے اگرچہ دکھائی نہیں دے رہا لیکن جس کی موجودگی وہ بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ ایک

ایسی تپش کی مانند جو کسی بھڑکتی ہوئی آگ کے قریب کھڑے رہنے سے محسوس ہوتی ہے۔

''کیا کوئی اس کمرے میں ہے؟'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے اپنے دل کی تسلی کے لئے ایک بار پھر دریافت کیا۔

''ہاں! ہاں میرے بھائی اس کمرے میں تمہارے علاوہ میں بھی ہوں۔'' آواز ایک بار پھر اس کے عقب سے ابھری۔ اگلے ہی پل بابو اپنے عقب میں پھرکی کی مانند گھوم پڑا لیکن اس بار بھی اسے مایوسی ہوئی اور غیر مانوس آواز کا وجود اس کی نگاہوں سے اوجھل ہی رہا لیکن تپش کا احساس بدستور ہوتا رہا۔

''کون ہو تم؟ تمہارا وجود مجھے دکھائی کیوں نہیں دے رہا؟ میرے کمرے میں تم کس طرح داخل ہو گئے؟'' بابو سوالات کے دوران آواز کے وجود کو کھوجنے کے لئے اپنی آنکھوں کی بھوری پتلیوں کو کمرے کے اطراف گھماتے ہوئے آواز کے وجود کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس عجیب وغریب صورت حال کو وہ اپنے کسی دوست کی شرارت کا نام ہرگز نہیں دے سکتا تھا۔ یہ یقیناً کوئی ایسا پراسرار معاملہ تھا جو اس کی عقل کی حد سے باہر تھا۔

''ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے...... مجھے تم اپنا خیر خواہ، شبھ چنتک یا ویل وشر کہہ سکتے ہو یہ تو ہوا تمہارے پہلے سوال کا جواب...... اب آتے ہیں تمہارے دوسرے سوال کے جواب کی جانب! جس طرح ہوا کا وجود دکھائی نہیں دیتا صرف محسوس کیا جا سکتا ہے اسی طرح میرا وجود بھی تمہیں دکھائی نہیں دے رہا لیکن میری موجودگی کو تم محسوس کر رہے ہو...... میرے بارے میں تمہیں اتنا جان لینا کافی ہے کہ میں ہر انسان کا مددگار ہوں اور دکھی انسان کی ایک پکار پر میں اڑتے ہوئے آن وارد ہوتا ہوں...... میں دکھی انسان کا دکھ بانٹنے والے ہر انسان کا سچا خیر خواہ ہوں...... کم از کم میری نظر میں، میں ایک سچا خیر خواہ ہی ہوں...... کیونکہ میں دکھی اور پریشان حال انسانوں کو وہ راستہ دکھاتا ہوں جس پر چل کر انہیں ان کی منزل دکھائی دینے لگتی ہے...... راستہ صحیح ہے یا غلط یہ فیصلہ کرنا میرا کام نہیں......'' آواز کا نادیدہ وجود باتیں کرنے کے دوران اپنی سمت بھی بار بار تبدیل کئے جا رہا تھا اور آواز کی بدلتی سمت کے ساتھ ساتھ بابو کا وجود بھی تیزی سے متحرک ہو رہا تھا۔

''گویا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ میں دکھی دل انسانوں کی رہنمائی کا فرض انجام دیتا ہوں...... ویسے میری ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ اگر میں کسی انسان پر مہربان ہو جاؤں تو اسے فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچا دیتا ہوں...... اپنی ذہانت سے بادشاہ کو فقیر اور فقیر کو بادشاہ بنا دیتا ہوں...... میری خوبیاں بے شمار ہیں کہاں تک سنو گے؟ کہاں تک سناؤں؟ ہزاروں ہی کارنامے ہیں کیا کیا بتاؤں؟'' آواز اس کے ارد گرد گرم ہوا کی مانند چکراتی رہی تپش کا احساس بابو کے وجود کو پسینہ پسینہ کرتا رہا۔

''لیکن میں یہ ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ تم میرے کمرے میں کس طرح داخل ہوئے؟'' بابو کی سوئی دوبارہ اس سوال پر آن کر اٹک سی گئی۔

''کیا کھڑکی دروازے بند کر دینے سے ہوا کو کمرے میں داخل ہونے سے روکا جا سکتا ہے؟ نہیں قطعی نہیں ہوا اپنا راستہ بنا لیتی ہے...... بالکل اسی طرح مجھے بھی دنیا کی کوئی طاقت کہیں آنے جانے سے نہیں روک سکتی...... میں جہاں چاہے جب چاہے اور جس جگہ چاہے بآسانی آ جا سکتا ہوں...... یہ کھڑکیاں، دروازے اور اینٹوں کی بنی دیواریں میرے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتیں۔'' بابو برق رفتاری سے پلنگ کی جانب پلٹ کر دیکھنے لگا کیونکہ گرم ہوا کا جھونکا اس کے وجود کو چھوتا ہوا پلنگ کی سمت بڑھتا ہوا محسوس ہوا تھا اور اگلے ہی لمحے پلنگ کی ایک جانب سے نادیدہ وجود کی

آواز ابھر کر اس کی سماعتوں سے آن ٹکرائی۔

''کیا میں تمہارا نام جان سکتا ہوں؟'' بابو کے اندر تجسس بیدار ہونے لگا۔

''اگر میں کہوں کہ میں امریکی صدر ہوں تو کیا تمہارے دل کو تسلی میسر آ جائے گی؟ نام میں کیا رکھا ہے؟ تمہیں نام سے کیا لینا دینا...... اس قسم کے فضول سوالات پوچھ کر میرا اور اپنا وقت ضائع مت کرو میرے پاس وقت کی کوئی کمی نہیں لیکن تم جانتے ہو کہ تمہارے پاس وقت بہت کم ہے...... اور تمہارے لئے گزرنے والا ایک ایک لمحہ بہت قیمتی ہے اس لئے میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ اپنا قیمتی وقت ذرا سوچ سمجھ کر ضائع کرو اور میری یہاں موجودگی کا فائدہ حاصل کر لو ورنہ پچھتانے کے لئے بھی وقت نہیں ملے گا۔'' بابو اپنی نگاہوں کا زاویہ آواز کی سمت گھماتا رہا۔

''اگر تم میرے سچے خیر خواہ ہو تو تمہیں مجھ سے پوشیدہ رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' بابو نے خالی پلنگ کے ایک جانب اس طرح گھورتے ہوئے کہا جیسے اسے آواز کا وجود وہاں براجمان دکھائی دے رہا ہو۔

''یہ فی الحال ممکن نہیں۔'' آواز ابھری۔

''اچھا یہ تو بتا دو کہ تم میری مدد کیوں کرنا چاہتے ہو؟'' بابو نے اپنے دل کی تسلی کے لئے دریافت کیا۔

''بابو! تم کیوں اپنا قیمتی وقت برباد کئے جا رہے ہو؟ میں نے کہا نا کہ میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں اور تمہیں پریشان دیکھ کر یہ سوچ کر چلا آیا کہ تمہیں میری...... یعنی ایک سچے دوست کی اس وقت اشد ضرورت ہے...... اگر تم اسی طرح مجھ سے بے فضول سوالات کرتے رہے تو میں چلا جاؤں گا۔'' آواز کے لہجے کی خفگی بابو کے دل کی دھڑکنوں کو منتشر کر گئی۔

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' بابو نے سوال کیا۔ ''کیا؟ میں؟ میں تم سے کچھ چاہوں گا؟ ہاں...... یہ تم نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں اپنی کسی غرض سے یہاں آیا ہوں؟ اور تم میرے لئے کر بھی کیا سکتے ہو؟ تم تو اپنے لئے بھی کچھ کرنے کے لائق نہیں ہو۔'' آواز میں غصے کا عنصر شامل ہو کر رہ گیا۔ اس بار آواز غسل خانے کے دروازے کے قریب سے ابھرتی ہوئی بابو کے کان کے قریب آن کر ٹھہری گئی تھی۔

''برخوردار میں تمہاری خدمت کرنے...... تمہیں راستہ دکھانے کے لئے بطور خاص حاضر ہوا ہوں نا کہ تم سے کسی قسم کی مدد لینے...... تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تمہیں میری مدد چاہئے یا نہیں؟'' آواز ابھری۔

''یہ سچ ہے کہ مجھے اس وقت ایک راستہ دکھانے والے مددگار کی اشد ضرورت ہے لیکن میں یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ مجھے تم سے مدد لینی چاہئے کہ نہیں؟ ایک تو تمہاری نادیدہ ہستی بہت پر اسراری محسوس ہو رہی ہے دوسرے یہ کہ تم پہیلیوں میں بات کر کے مجھے مسلسل الجھا رہے ہو...... میرا دماغ پہلے ہی بہت الجھا ہوا ہے میں تمہاری پر اسرار ہستی کے بارے میں زیادہ سوچ نہیں سکتا۔'' بابو نے اپنی الجھن لفظوں میں بیان کر دی۔

''تو پھر کچھ بھی مت سوچو اور میری مدد کی حامی بھر لو...... کوئی سوال کرنے سے پہلے اتنا ضرور یاد رکھنا کہ اس وقت اس مشکل گھڑی میں صرف ایک واحد میری ہستی ایسی ہے جو تمہیں اس بھنور سے نکال سکتی ہے...... تمہیں تمہاری منزل تک پہنچا سکتی ہے۔'' آواز کا عدم وجود پاگل و سرپھری ہوا کی مانند پورے کمرے میں چکراتا پھر رہا تھا اور بابو اپنے پورے وجود کے ساتھ آواز کی بدلتی سمتوں کی جانب لٹو کی مانند گھومے جا رہا تھا۔

''کیسی منزل؟ کون سی منزل۔'' بابو دانستہ انجان سا بن گیا اس کا دل بدستور ڈر سا محسوس کر رہا تھا۔ وہ کیسے کسی پراسرار ہستی پر بھروسہ کر لیتا؟

''استاد سے استادی۔'' آواز کے لہجے میں ہنسی کی آمیزش محسوس کر کے بابو ٹپٹا کر رہ گیا۔

''خیر چھوڑو! یہ بتاؤ تم معصومہ سے کتنی محبت کرتے ہو؟'' آواز نے معصومہ کا نام لے کر اسے حیرت کے سمندر میں ڈبکیاں لگانے پر مجبور کر دیا اور وہ یہ سوچے بنا نہیں رہ سکا کہ یہ عدم یا غائب وجود ہستی کوئی عام شے ہرگز نہیں تھی۔

''اگر دنیا میں محبت ناپنے کا کوئی پیمانہ ہوتا تو وہ بھی میری بے حد وحساب محبت کی حد بتانے سے قاصر رہتا۔ مجھے معصومہ سے محبت نہیں عشق ہے...... اس کے بغیر جینے کا تصور ہی مجھے موت کے قریب کر دیتا ہے۔'' بابو نے چشم تصور میں معصومہ کا حسین سراپا بساتے ہوئے بے حد محبت سے کہا۔

''مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے میرے سوال کا جواب عنایت فرمایا...... سوال کے جواب میں یہ سوال نہیں داغ دیا کہ میں معصومہ کے بارے میں کیسے جانتا ہوں؟'' آواز کمرے کے ایک کونے سے ابھری بابو اپنے پورے وجود کے ساتھ آواز کی سمت گھوم پڑا۔

''بہر حال کہانی یہ ہے کہ تم معصومہ سے بے انتہا محبت کرتے ہو اور اس کی والدہ محترمہ جانم شہزادی صاحبہ نے معصومہ کی قیمت پورے بیس لاکھ روپے رکھی ہے...... ہے نا یہی بات؟'' آواز کے وجود نے اپنا رخ بدلا۔

''ذرا سوچ سمجھ کر بولو...... قیمت سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا وہ عورت اپنی بیٹی کا سودا کر رہی ہے؟ کیا اس نے اپنی بیٹی کو نیلامی کے لئے بٹھا رکھا ہے؟'' بابو غصے کی زیادتی کے باعث اس قدر بپھر کر رہ گیا کہ اگر اسے آواز کا وجود دکھائی دیتا تو وہ اس کے منہ پر تھپڑ لگانے میں لمحے بھر کی بھی تاخیر نہ کرتا اور آواز کے وجود کو دھکے دے کر اپنے کمرے سے نکال باہر کرتا۔

''تم کیا جانو ایک ماں کی مجبوری؟ اس نے انتہائی بے بسی کے عالم میں بیس لاکھ روپے والی بات کہی ہے اگر درمیان میں وہ خبیث وڈیرا شاہنواز رستم آن وارد نہ ہوتا تو آنٹی کو میرے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ صرف آنٹی ہی مجھے پسند نہیں کرتی بلکہ معصومہ بھی مجھ سے بے حد محبت کرتی ہے...... صرف میں جانتا ہوں کہ بیس لاکھ روپے کی بات کر کے وہ کتنی شرمندگی سی محسوس کر رہی تھیں۔'' بابو کی وضاحت پر آواز کے نادیدہ وجود نے ہنسی بکھیری، ہنسی میں طنز و تمسخر کا عنصر نمایاں تھا جو محسوس کر کے بابو سر تا پاؤں سلگ کر رہ گیا۔

''میں تمہاری اس طنزیہ ہنسی کا کیا مطلب نکالوں کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ مجھے بے وقوف بنایا جا رہا ہے؟ معصومہ جیسی حسین اور کم عمر کنواری لڑکی کے لئے کوئی بھی دولت مند انسان بیس لاکھ تو کیا پچاس لاکھ روپے محض اس کے بے مثال حسن کا صدقہ اتار کر پھینک سکتا ہے...... آنٹی کسی بھی رئیس زادے سے بیس لاکھ روپے طلب کر سکتی تھیں اور معصومہ کو پانے کے لئے کوئی بھی بیس لاکھ روپے دینے سے ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا لیکن انہوں نے مجھے محض اس لئے ترجیح دی ہے کہ میں معصومہ سے اور معصومہ مجھ سے بے انتہا محبت کرتے ہیں...... اور آنٹی کی بھی اولین خواہش یہی ہے کہ معصومہ صرف میری بنے۔'' بابو جانے کیوں بے اختیار وضاحت کرنے لگا۔

''میں سب جانتا ہوں مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں...... کان سیدھا پکڑو یا ہاتھ گھما کر بات تو ایک ہی ہے تمہیں بیس لاکھ روپے تو

بہرحال دینے ہی پڑیں گے۔'' آواز کا وجود کھڑکی کی جانب لپکا جب بھی آواز کا نادیدہ وجود کمرے میں ادھر سے ادھر حرکت کرتا یا اپنی سمت تبدیل کرتا اس کی ہر حرکت پر ایک سرسراہٹ سی ابھرتی اور گرم ہوا کا ایک تیز جھونکا بابو کے وجود اور چہرے سے ٹکراتا ہوا گزرتا محسوس ہوتا۔ وہ اس برق رفتاری سے اپنی جگہیں تبدیل کرتا کہ اس کی آواز کی سمت کا درست اندازہ لگانا بابو کے لئے بے حد مشکل ثابت ہوتا اور اگر وہ آواز کی سمت پا لیتا تو آواز کا نادیدہ وجود اگلے ہی لمحے اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور جا ٹکتا تھا۔

''آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ کیا تم ایک جگہ ٹک کر بات نہیں کر سکتے؟ تم نے مجھے گھن چکر بنا رکھا ہے مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں کسی گول گھومنے والے جھولے میں بیٹھا تمہاری بات سن رہا ہوں یا تم جھولے میں بیٹھے بات کر رہے ہو۔'' بابو زچ ہو کر بولا وہ واقعی نادیدہ وجود کی اس حرکت سے سخت کوفت محسوس کر رہا تھا۔

''مجبوری ہے دوست! ٹک کر بیٹھنا میری فطرت میں شامل نہیں اور نا ہی میں کہیں ٹک کر بیٹھ سکتا ہوں جانتے ہو کیوں؟ کیونکہ میں سمجھتا کہ میری ضرورت تم جیسے سینکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگوں کو ہر لحہ محسوس ہوتی ہے...... مجھے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے قیمتی مشوروں سے نوازنا ہوتا ہے اور انہیں وہ آسان راستہ دکھانا...... یا...... اس راستے پر قدم بڑھانے کی ہمت دلانا ہوتا ہے جو ان کی نگاہوں کے سامنے تو ہوتا ہے لیکن جس کی جانب بڑھنے کی ان میں ہمت و حوصلہ نہیں ہوتا۔'' اس مرتبہ آواز کی سمت نے بابو کو حیران کرنے کے ساتھ ساتھ قدرے پریشان بھی کر کے رکھ دیا اس کی گردن بے اختیار چھت پر لگے پنکھے کی جانب اٹھ کر رہ گئی، آواز اسی جانب سے ابھری تھی، بابو نے تصور سا کیا کہ کوئی انسان بندر کی مانند چھت کے پنکھے سے لٹکا جھول رہا ہو یہ الگ بات ہے کہ بابو یہ محسوس نہ کر سکا کہ اس غائب ہستی نے پنکھا کس لمحے بند کر دیا تھا؟ بابو نے دیکھا کہ پنکھا اس طرح ہل رہا تھا جیسے کوئی وجود واقعی اس سے لٹکا جھول رہا ہو۔

بابو کے دماغ میں خیال کا کوندا سا لپکا اور آواز کی نادیدہ ہستی کو شناخت کرتے ہی اس کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ نے بسیرا کر لیا۔

''میں جان گیا ہوں کہ تم کون ہو؟'' بابو نے آواز کے نادیدہ وجود کو اپنے اطراف کھوجتے ہوئے کہا۔

''اچھا! بھلا بتاؤ تو میں کون ہوں۔'' بابو ایک دم سے دو قدم پیچھے ہٹ کر رہ گیا کیونکہ غائب وجود نے بابو کے کان کے بے حد قریب اپنے ہونٹ لا کر سرگوشی کی بابو کو ایسا محسوس ہوا جیسے غائب وجود کے لبوں سے لفظوں کے بجائے چنگاریاں نکلی ہوں جو بابو کے کان کو جھلسا سی گئی اس نے بے اختیار اپنا ایک ہاتھ اپنے کان پر رکھ کر اپنا کان ڈھانپ دیا حیرت انگیز بات یہ تھی کہ بابو کو اپنے کان کی جلد کچھ گرم سی محسوس ہو رہی تھی۔

''تم انسان نہیں ہو سکتے۔'' بابو نے اپنا کان سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''ارے واہ! مان گئے تمہاری ذہانت کو تم نے تو واقعی مجھے شناخت کر لیا...... ہاہاہا......'' آواز نے واضح طور پر اس کا مذاق بنایا۔

''مم میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم انسان نہیں کوئی جن ہو...... تمہیں بدروح یا بھوت میں اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ بدروحیں اور بھوتوں کے وجود زندگی کی گرمی سے خالی ہوتے ہیں جبکہ تمہارے وجود کی حرارت یا گرمی سے اس کمرے کا درجہ حرارت اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ میں سر تا پاؤں پسینے میں نہا چکا ہوں۔'' بابو نے جواب دیا۔

''میں کون ہوں؟ فی الحال یہ بحث رہنے دو۔'' غائب وجود نے قہقہہ لگایا اس بار آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی جیسے نادیدہ ہستی نے اپنے آپ کو کسی چیز میں بند کرلیا ہو اور وہاں سے بول رہا ہو۔

''تم اگر یہ سوچ کر مجھ پر ظاہر ہونے سے گریز کر رہے ہو کہ میں تمہارا اصل روپ دیکھ کر شاید خوف سے بے ہوش ہو جاؤں گا تو جان لو کہ میں بہت مضبوط اعصاب کا مالک ہوں بھیانک صورتیں مجھے ہراساں نہیں کرسکتی۔'' بابو کو اپنی غیر معمولی بہادری پر فخر سا تھا۔

''تم کتنے مضبوط اعصاب کے مالک ہو اس بات کی بھی آزمائش ہو جائے گی۔'' آواز بدستور دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''کیا کہیں پھنس کر رہ گئے ہو؟'' بابو کے لہجے میں تمسخر شامل ہو کر رہ گیا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے کپڑوں کی مقفل الماری کی جانب بڑھ کر غائب ہستی کے وجود کو! جو اس کے خیال کے مطابق کپڑوں کی بند الماری میں پھنس کر رہ گیا تھا، الماری کھول کر آزاد کرنے کے لئے الماری کی جانب بڑھ پاتا۔

''میرا وقت بہت قیمتی ہے پہلے میری وہ بات سن لو جو کہنے کے لئے میں بطور خاص یہاں آیا ہوں۔'' آواز اس کے عقبی جانب سے ابھری وہ پھرکی کی مانند گھوم کر آواز کی سمت نادیدہ وجود کو دیکھنے کی اپنی سی کوشش کرنے لگا۔

''کیا تم میرے کپڑوں کی الماری میں بند ہو کر نہیں بول رہے تھے؟'' بابو نے حیرت سے دریافت کیا۔

''میں الماری تو کیا مٹکے کے اندر جا کر بھی بول سکتا ہوں۔ میں ہر اس چیز کے اندر داخل ہو کر بول سکتا ہوں جس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتے ہو......اور اب میری ایک بات کان کھول کر سنو میں یہاں تم سے کسوٹی کھیلنے نہیں آیا تم نے میرا بہت وقت ضائع کرلیا ہے اب ایک بھی غیر متعلق سوال تمہارے لبوں سے ادا ہوا تو میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گا۔'' آواز کے لہجے کی سختی بابو کو پریشان کرگئی۔ وہ نہایت شرافت سے پلنگ کے ایک جانب ٹک کر بیٹھ گیا۔

بابو نے اپنا سر جھکالیا اور اپنی سماعتوں کی تمام تر قوت آواز کی جانب منتقل کردی ویسے بھی وہ آواز کی بدلتی سمتوں پر ادھر سے ادھر، دائیں سے بائیں اور اوپر نیچے گردن گھما کر بے حد تنگ آچکا تھا اب وہ ایک جگہ اطمینان سے بیٹھ کر اپنے بھلے کی وہ بات سننا چاہتا تھا جو اس کا نادیدہ خیر خواہ اس سے کہنے کے لئے بطور خاص اس کے پاس آیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنے نادیدہ خیر خواہ کی پراسرار شخصیت نے اس کے دل و دماغ میں کھلبلی سی مچا رکھی تھی۔

''جیسا کہ تم نے ابھی کہا کہ تم معصومہ سے بے حد محبت کرتے ہو......شاید لفظ محبت میں نے کچھ غلط کہہ دیا تم تو اس سے عشق کرتے ہو اور اپنے عشق کو پانے کے لئے بیس دن کے اندر تمہیں بیس لاکھ روپے چاہئیں...... گویا اس وقت بیس لاکھ روپے تمہاری اولین ضرورت ہے۔'' آواز ابھری بابو خاموشی سے سنتا رہا۔

''تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ بیس لاکھ روپے کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔ لکھنے میں بیس لاکھ کی رقم میں صفر زیادہ لگتے ہیں لیکن اگر وہ 20 لاکھ روپے نوٹوں کی صورت میں جمع کئے جائیں تو بندہ خود صفر ہو کر رہ جاتا ہے......اور میں یہ بھی دیکھ چکا ہوں کہ تم بیس لاکھ روپوں کے حصول کے لئے ہر جائز ناجائز ذرائع پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور فرما چکے ہو......موت اور گرفتاری کا خوف ہر بار تمہارے ارادوں کو آہنی زنجیروں میں جکڑ

کر تمہیں بے بس کر ڈالتا ہے...... تمہارا باس خان تمہیں بیس لاکھ روپے جیسی خطیر رقم کسی ضمانت کے بغیر کبھی نہیں دے گا کیونکہ وہ نئے لڑکوں پر بہت جلد بھروسہ نہیں کیا کرتا اور تمہاری طرف سے تو وہ پہلے ہی دن سے مشکوک و محتاط ہے۔'' آواز کی ہنسی ابھری۔

''جانتا ہوں بلکہ اگر اس بڈھے کو اس بات کی بھنک بھی مل جائے کہ میں ایک حسین وخوب صورت لڑکی کے لئے اس سے بیس لاکھ روپے طلب کر رہا ہوں تو وہ خود بیس لاکھ روپے جانم آنٹی کی جھولی میں ڈال کر میری معصومہ کو لے اڑے گا جبکہ جانم آنٹی کا مقصد ہی اپنی معصومہ کو بڈھے درندے سے بچانا ہے۔ وہ کبھی بھی یہ نہیں چاہیں گی کہ ان کی نازک وکم عمر بیٹی ایک بڈھے کی گرفت سے نکل کر دوسرے بڈھے کے چنگل میں جا پھنسے۔'' بابو نے نفرت وحقارت کا اظہار کیا۔

''یہ سب مجھے بتانے کی ضرورت نہیں...... خان باچا کو تم سے زیادہ میں جانتا ہوں۔'' غائب وجود کے اس جملے نے بابو کو ایک بار پھر اس کی پراسرار شخصیت کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ آخر یہ غائب ہستی کون تھی؟ یہ کس طرح بابو کے راز دل سے واقف تھی؟ سب سے بڑھ کر یہ غائب وجود معصومہ اور جانم کے متعلق ہی نہیں خان باچا کے بارے میں بھی سب کچھ جانتا تھا۔ کیا واقعی آواز کے غائب وجود کا تعلق اللہ کی بنائی ہوئی مخلوق سے تھا؟ بابو سوچ کر رہ گیا۔

''یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم خان کو کیسے جانتے ہو؟'' بابو نے سوال کیا۔

''کم عمر اور کسے ہوئے بدن کی جوان لڑکیاں ہی دراصل تمہارے باس خان کی کمزوری ہیں اور معصومہ تو ہر لحاظ سے ایک بھرپور لڑکی ہے۔'' غائب وجود نے اس کے سوال کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جبکہ معصومہ کی ایسی غیر اخلاقی تعریف بابو کو قطعی پسند نہیں آئی لیکن وہ یہ سوچ کر خاموش ہی رہا اور اپنے غصے کا اظہار نہیں کیا کہ وہ یہ دیکھنا یا جاننا چاہتا تھا کہ اس کا غائب وجود خیر خواہ کس طرح اس کی مدد فرماتا ہے؟ یا اسے بیس دن میں بیس لاکھ روپے کے حصول کا کون سا آسان طریقہ دکھاتا ہے؟

''کیا تم صرف مجھ سے متعلق لوگوں کے بارے میں سب کچھ جانتے ہو؟ یا ہر انسان کے بارے میں تمہاری معلومات کا یہی عالم ہے؟'' بابو نے ایک سوچ کے تحت دریافت کیا۔

''آخر تم مسلسل ایسے بے وقوفانہ سوالات مجھ سے کیوں کئے جا رہے ہو؟ تمہارے بند کمرے میں میری آمد...... تمہارے سامنے ہوتے ہوئے بھی تمہیں میرے وجود کا دکھائی نہ دینا اور پھر بھی میری آواز کا سنائی دینا اور تم سے مخاطب ہو کر تمہاری ہی زندگی کی کہانی کے ایک حصے سے تمہیں آگاہ کرنا کیا یہ ثبوت کافی نہیں ہیں کہ میں تمہاری زندگی کی پوری کہانی سے واقف ہونے کے علاوہ ہر اس شخص کی زندگی کی مکمل کہانی سے واقف ہوتا ہوں جس کی مدد کرنے کا میں پختہ ارادہ کر لیتا ہوں۔'' آواز چکراتی رہی۔

''اپنے بارے میں اتنا کچھ بتاتے ہوئے تمہیں کوفت نہیں ہوتی لیکن اپنا نام بتاتے ہوئے تم ایک دم آپے سے باہر ہو جاتے ہو...... جانے کی دھمکیاں دینا شروع کر دیتے ہو کیوں؟'' بابو نے کہا۔

''میرا نام جان کر کیا تمہیں قارون کے خزانے کی کنجیاں مل جائیں گی؟ تم بہت امیر ہو جاؤ گے؟ آخر میرا نام جان کر تمہیں کیا مل جائے

گا؟'' آواز نے کہا۔

''بعض ہستیوں کے نام ان کا تعارف بھی ہوتے ہیں مثلاً اگر تم یہ کہو کہ میں ایک جن ہوں تو مجھے تمہیں کھوجنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔'' بابو نے ایک امید سے وضاحت فرمائی۔

''کہا تو ہے کہ میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں پھر بھی اگر تم میرے بارے میں بہت زیادہ متجسس ہو تو صرف اتنا جان لو کہ میں تم جیسے انسانوں کے ساتھ ہر وقت ہر لحہ رہتا ہوں...... بالکل غیر محسوس طور پر میں انسانوں کی مدد کرتا ہوں انہیں ان کے فائدے کی بات بتاتا ہوں اور وہ راستہ دکھاتا ہوں جو زیادہ تکلیف زدہ بھی نہیں ہوتا اور تم جیسے انسانوں کے چھوٹے بڑے مسائل بھی نہایت سہولت سے حل ہو جاتے ہیں۔'' غائب وجود کے اس جواب سے بھی بابو کے دل کی مکمل تشفی نہ ہو سکی البتہ ایک نام اس کے دماغ میں کھلبلی سی مچاتا رہا۔

''میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب پھر کہہ رہا ہوں کہ میرا وقت بہت قیمتی ہے اور تم مسلسل الٹے سیدھے سوالات کر کے میرا اور اپنا وقت برباد کر رہے ہو، کیا تمہارے پاس بھیجہ نام کی کوئی چیز ہے یا نہیں؟ جس سے انسان اپنے مفاد کے بارے میں زیادہ سوچتا ہے لیکن تم جیسا بے وقوف میرے بارے میں ہی سوچے جا رہا ہے...... اب تم میرے بارے میں مزید کوئی سوال نہیں کرو گے اور اگر تم سچے دل سے معصومہ کو پانے کے خواہش مند ہو تو خاموش رہ کر یعنی زبان بند رکھ کر اور کان کھول کر میری بات سنو۔'' آواز بدستور کمرے میں چکراتی پھرتی رہی۔

''تم کہو میں سن رہا ہوں۔'' بابو نے کہا۔

''یہ جملہ تم پہلے بھی کئی بار کہہ چکے ہو لیکن پھر تمہاری زبان بے قابو ہو جاتی ہے بہر حال اب نہایت غور سے سنو۔ میرے یہاں سے جانے کے فوراً بعد تم اس قید خانے سے جسے تم گھر کہتے ہو باہر نکلو گے...... تمہارے گھر سے دو راستے دائیں اور بائیں جا رہے ہیں...... تم الٹے ہاتھ کے راستے پر قدم بڑھاؤ گے اور کوئی موڑ اختیار کیے بغیر ناک کی سیدھ میں بڑھتے چلے جاؤ گے...... تقریباً ڈھائی گھنٹے کی پیدل مسافت کے بعد تم آبادی کی حدود سے نکل کر ایک ویران اور غیر آباد علاقے میں داخل ہو جاؤ گے اس وسیع و عریض رقبے کی ویران جگہ پر دور دور تک کوئی تعمیر نہیں ہے...... تا حد نظر کانٹے دار سوکھی جھاڑیوں کا ایک جال سا پھیلا ہوا ہے...... اسی ویران و غیر آباد زمین پر کہیں پر ایک بہت پرانا برگد کا درخت ہے اس درخت کے نیچے ایک بزرگ تشریف رکھتے ہیں...... کہیں پر میں نے اس لئے کہا ہے کہ برگد کا وہ بے حد قدیم درخت انسانوں کی چشم بینائی سے پوشیدہ ہی رہتا ہے...... کہتے ہیں کہ نصیب والوں کو ہی وہ برگد کا درخت اور اس کے نیچے براجمان وہ نیک بزرگ دکھائی دیتے ہیں...... اس نیک بزرگ کی شہرت بہت زیادہ تو نہیں ہے لیکن جتنے بھی لوگ ان کے نام سے واقف ہیں وہ بتا سکتے ہیں کہ اس بزرگ ہستی کی کرامات بے شمار ہیں...... برگد کے درخت کے نیچے بیٹھ کر لوگوں کی مشکلات حل کرنے والے اس عظیم بزرگ کی پہچان و شناخت بھی ''برگد والے بابا'' کے نام سے ہوتی ہے...... تمہاری پریشانی کا حل بھی اسی برگد والے بابا کے پاس ہے۔'' آواز بابو کے بے حد قریب چکراتی رہی بابو اپنے پورے وجود کو کان بنائے اس کی ایک ایک بات نہایت توجہ و دھیان سے سنتا رہا۔

''مجھے اس بزرگ سے مل کر کیا کہنا ہوگا۔''

آواز کے خاموش ہوتے ہی وہ عادت سے مجبور ہو کر سوال کر بیٹھا لیکن جواب میں اسے غائب وجود کی آواز سنائی نہیں دی...... بابو تھوڑا سا چوکنا ہو کر اپنے اطراف میں دیکھنے لگا اسے کمرے کی فضا میں اس تپش کا احساس بھی نہیں ہو پا رہا تھا جو آواز کے غائب وجود کے ہونے کی وجہ سے بنا ہوا تھا۔

''دوست! محترم خیر خواہ صاحب۔'' بابو ایک دم سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور ایڑیوں کے بل پر اپنے پورے وجود کے ساتھ گھوم کر اس نے آواز کے غائب وجود کو ایک نہ دو کئی بار پکارا لیکن جواب ندارد......

''میری بھلائی چاہنے والے...... میرے سچے خیر خواہ...... میرے محسن و ہمدرد مجھے یہ تو بتا دو کہ میں اس بزرگ ہستی 'برگد والے بابا' سے کیا کہوں؟ کیا میں تمہارا حوالہ دے کر اپنی آمد کا مقصد بیان کروں یا......؟ دوست! کیا تم کمرے میں موجود ہو؟'' بابو بے اختیار چیخ کر بولا جیسے آواز کا وجود کسی سماعت سے محروم شخص کا ہو جب کئی لمحات تک بابو کو اپنے سوال کا کوئی جواب نہیں ملا اور نا ہی آواز کے غائب وجود کی موجودگی کا احساس ہی ہو سکا تو بابو مایوسی سے دوبارہ پلنگ پر ٹک سا گیا۔

''لگتا ہے محترم خیر خواہ صاحب تشریف لے گئے۔'' بابو نے اپنے آپ سے کہا بہر حال اس کا غائب وجود دوست خود کو سچا خیر خواہ کہنے والا گمنام ہستی اسے ایک راستہ دکھا کر جا چکا تھا اور اس کے راستے پر بے سوچے سمجھے قدم بڑھانے کو اس کا دل مان کے نہیں دے رہا تھا وہ پلنگ پر لیٹنے والے انداز میں بیٹھ گیا اپنے دونوں ہاتھ اس نے سر کی پشت سے باندھ دیئے اور غائب ہستی کی باتوں پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور فرمانے لگا۔

سب سے بڑی الجھن تو غائب وجود کی پراسرار ہستی تھی جسے وہ مکمل طور پر شناخت بھی نہیں کر پایا تھا بس اس کا یہ خیال یا اندازہ ہی تھا کہ وہ پراسرار غائب ہستی شاید اس کے وجود کا ہی کوئی پوشیدہ حصہ یا اس کے وجود میں چھپی کوئی ہستی تھی لیکن یہ خیال اس لحاظ سے بھی قابل قبول نہ تھا کہ اس کے اندر کی ہستی کو کسی برگد والے بابا کے بارے میں کیسے علم ہوا۔'' بہت سوچنے کے بعد بھی جب وہ آواز کے غائب وجود کو شناخت نہیں کر پایا تو اس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ غائب ہستی کے دکھائے ہوئے راستے پر قدم بڑھا کر دیکھ لے اگر اس کی قسمت یاوری کر گئی اور برگد والے بابا سے شرف ملاقات حاصل ہو گئی تو ممکن ہے بیس لاکھ روپے کے حصول کا واقعی کوئی راستہ مل جائے اور وہ تا عمر کے لئے معصومہ کو اپنی زندگی کا ساتھی بنا سکے...... اس خیال کے آتے ہی اس نے زیادہ کچھ نہیں سوچا اور ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پلنگ سے کھینچ کر اس نے ایک چادر اٹھا کر اپنے کاندھوں پر لے کر جسم پر لپیٹی اور پیروں میں چپل ڈال کر کمرے سے باہر جانے کی نیت سے ابھی ایک قدم ہی اٹھایا تھا کہ یہ دیکھ کر وہ ایک دم سے ٹھٹک کر رک سا گیا اور حیرت سے اپنے سامنے کھڑی ایک ہستی کو دیکھ کر بت سا بن کر رہ گیا...... اور وہ کیوں نہ حیران ہوتا سامنے کھڑی ہستی کسی زندہ وجود کی نہیں...... بلکہ اس کے مرحوم نانا جان کی ہستی تھی جو اپنی قہر برساتی نگاہوں سے بابو کو گھورے جا رہے تھے اور دروازے کی خلاء میں اس طرح حائل ہو کر کھڑے تھے جیسے وہ کسی قیمت پر بابو کو اس دروازے کی چوکھٹ پھلانگ کر باہر جانے نہیں دیں گے۔

''نانا جان؟'' بابو کے لبوں سے بمشکل تمام ادا ہوا۔

''بنا سوچے سمجھے چل دیئے۔'' اس کے نانا کے لہجے میں غصے کا عنصر بے حد نمایاں تھا۔

بابو نے محسوس کیا کہ نانا ابو کی روح کا غصہ بھرا انداز بھی ویسا ہی تھا جیسے کہ وہ اپنی زندگی میں اس کی کسی بات پر غصے میں آ کر بے حد تیز آواز میں بول کر یہ احساس دلایا کرتے تھے کہ انہیں بابو کی بات یا فلاں حرکت سخت گراں گزری ہے۔"

"اس میں سوچنا سمجھنا کیا ہے نانا؟ میں کوئی چوری کرنے یا ڈاکہ ڈالنے تو نہیں جا رہا۔" بابو نے ان کے احترام میں سر جھکا کر جواب دیا۔

شروع ہی سے وہ اپنے نانا جان کی بے حد عزت کیا کرتا تھا۔ اس کے نانا جان بھی اس کی تین بہنوں کی نسبت اسے بہت چاہتے اور اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ جب کبھی بھی بابو کوئی غلط کام یا غلط حرکت کرتا تو اس کے نانا جان سب سے پہلے اسے سمجھانے کا فریضہ انجام دیا کرتے۔

"ممکن ہے جس راستے کی جانب تم قدم بڑھا رہے ہو۔ ایک غلط راستہ ہو۔" نانا نے شک سا ظاہر کیا۔

"یہ تو وہاں جا کر...... برگد والے بابا سے مل کر ہی اندازہ ہوگا۔ قبل از وقت کیا کہا جا سکتا ہے؟" بابو نے کاندھے اچکا دیئے۔

"تم برگد والے بابا کے متعلق کیا جانتے ہو؟" نانا نے اگلا سوال داغ دیا۔

"کچھ بھی نہیں...... ان کے بارے میں برائے نام معلومات آج بلکہ ابھی کچھ لمحے قبل ہی میرے علم میں آئی ہے۔" بابو نے سچائی سے کہا۔

"اسی لئے کہہ رہا ہوں ذرا تسلی سے بیٹھ کر اور ٹھنڈے دل و دماغ سے تمام اچھے برے پہلو کو مدنظر رکھ کر کوئی مثبت قدم اٹھانا...... ایک دم سے بنا سوچے سمجھے گھر سے نکل پڑنا کوئی دانش مندی نہیں؟" نانا کے لہجے میں خفگی در آئی۔

"میرے پاس سوچنے سمجھنے میں ضائع کرنے کے لئے وقت نہیں ہے...... اور نا ہی آج میں تمہاری کوئی نصیحت سننے کے موڈ میں ہوں...... تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو نانا کہ میں کسی کی کوئی بات سنا نہیں کرتا اور اگر بحالت مجبوری سن بھی لیتا ہوں تو عمل نہیں کیا کرتا میرا یہ اصول ہے سنو کسی کی نہیں اور مانو ہمیشہ اپنے دل کی۔" بابو نے کہا۔

"گویا تمہارے لئے معصومہ کا حصول ہی سب کچھ ہے باقی رشتوں کی کوئی اہمیت اور وقعت نہیں۔" نانا کے لہجے کا غصہ برقرار رہا۔

"کن رشتوں کی بات کر رہے ہیں آپ نانا جان؟ وہ رشتے جنہوں نے مجھے قربانی کا بکرا سمجھ لیا ہے...... ماں اور باپ کی! جو چاہتے ہیں کہ میں مدیحہ کی خاطر اپنی ہستی کو بھول جاؤں...... اپنے ارمانوں اور خواہشات کو مدیحہ کے قدموں تلے بچھا دوں...... ان بہنوں کی! جو مجھے لائق عزت ہی نہیں گردانتیں...... نہیں نہیں! نہیں نانا جان نہیں! میں اپنی ہستی پر یہ ظلم نہیں توڑ سکتا...... سچ تو یہ ہے کہ میرے پیش نظر اس وقت صرف معصومہ کو حاصل کرنے کی اہمیت ہے...... ماں باپ اور بہنیں کہیں بھاگے نہیں جا رہے ہیں لیکن معصومہ میرے ہاتھوں سے نکل سکتی ہے اگر میں رشتوں کے چکر میں یونہی الجھا رہا...... یا مجھے الجھایا جاتا رہا...... یہ سچ ہے کہ معصومہ کے بغیر جینا میرے لئے ایک بدترین سزا ہوگی۔" بابو نے دوٹوک اپنا فیصلہ سنا دیا۔ نانا کی روح اس کی شکل گھورتی رہ گئی۔

"بے حس تو تم تھے ہی...... اس لڑکی کی محبت نے تمہیں پتھر دل بھی بنا ڈالا ہے...... تمہیں سمجھانا اور اپنے ارادوں سے باز رکھنا آسان نہیں...... کاش میں تمہیں بتا سکتا کہ تم جس راہ کی جانب قدم بڑھانے جا رہے ہو وہ کس قدر پرخطر ہے؟ میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ آئندہ تمہاری راہ میں حائل نہ ہوں۔ تمہاری ماں کے آنسو دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں تمہیں سمجھانے چلا آیا...... جانے میں یہ کیسے بھول گیا کہ تم تو کبھی

کسی کی سنتے ہی نہیں ہو؟ میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ اب اللہ ہی تمہارا حافظ و نگہبان ہے۔'' نانا کی روح نے کہا۔

بابو نے دیکھا کہ نانا کی روح بڑے دکھ سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی اور یونہی دیکھتے ہی دیکھتے نانا کا ٹھوس وجود بالکل غیر محسوس انداز سے دھویں کے مرغولے میں تبدیل ہونے لگا اور چند لمحوں کے اندر دھویں کا وہ انسانی پیکر بھی بابو کی نگاہوں کے سامنے فضا میں تحلیل ہو کر رہ گیا۔ بابو نے بے اختیار با آواز بلند شکر کے کلمات ادا کیے۔

''بابو! گھر سے باہر قدم رکھنے سے قبل اگر تم ایک بار ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ لو تو کوئی برائی نہیں...... کہیں ایسا نہ ہو کہ واقعی عشق کے جراثیم نے تمہاری عقل و سمجھ کو نگل لیا ہو۔'' بابو کے اندر بیٹھے ضمیر نے اسے روکنا چاہا۔

''بس خاموش! میں مزید کسی کی بکواس سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' بابو نے اپنے ضمیر کو بری طرح ڈانٹ کر چپ کروا دیا۔

''میں نے تو یونہی ایک مشورہ سا دیا تھا اگر تمہیں برا لگا تو میں شرمندہ ہوں۔'' اس کے ضمیر نے کہا یہ پہلی بار نہیں تھا کہ بابو نے اپنے ضمیر کو ڈانٹ کر چپ رہنے پر مجبور کیا تھا یہ فریضہ وہ اس وقت سے انجام دیتا آ رہا تھا جب پہلی بار اسکول کے سالانہ امتحان میں بابو نے نقل کی ابتدا کی تھی۔

''یہ تم سراسر غلط کر رہے ہو بابو یا تمہیں اپنی عقل و سمجھ پر بھروسہ کرنا چاہئے۔''

''خاموش رہو! آج کل کے دور میں عقل و سمجھ سے کام لے کر ڈگریاں حاصل کرنے والے آلو کے چپس بیچتے ہوئے نظر آتے ہیں۔''

بابو نے پہلی بار اپنے ضمیر کو بری طرح لتاڑا اور اس واقعے کے بعد سے ضمیر کو لتاڑنا، ڈانٹنا، ڈپٹنا اور کئی بار مارنے کی کوشش میں اس کے ضمیر نے سہم کر اسے نصیحت کرنا یا کسی غلط کام پر روکنا ٹوکنا تقریباً ختم ہی کر دیا۔

ایک بار پھر اپنے ضمیر پر فتح پا کر بابو قدرے مطمئن سا دکھائی دینے لگا۔ جانے کیا سوچ کر اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ساتھ ایک ضمیر باندھ دیا تھا یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ انسان کو ضمیر کے ساتھ باندھ دیا تھا حالانکہ یہ انسان! جسے خدا کی تخلیق کردہ تمام مخلوقات پر اشرف ہونے کا اعزاز حاصل ہے اگر ایک بار برائی کی راہ پر قدم بڑھا لیتا ہے تو اس کے نزدیک ضمیر کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی...... وہ اپنے ضمیر کو ایک بے کار سی شے سمجھ کر اس کی باتوں یا نصیحتوں پر کان دھرنا سراسر وقت کا ضیاع خیال کرتا اور اگر یہی انسان! اپنے مفاد یا غرض کی انتہا کو پہنچ جائے تو اس کی اولین ترجیح یہی ہوتی ہے کہ سب سے پہلے وہ اپنے ضمیر سے نجات حاصل کرے، کیونکہ انسانی نفس پر سب سے مضبوط گرفت انسان کے ضمیر ہی کی ہوتی ہے...... اور ضمیر سے نجات حاصل کرنے کے لئے ضمیر کو مارنا بے حد ضروری ہے اور خود غرض اور مفاد پرست انسان کے لئے اپنے ضمیر کا خوف کرنا کوئی مشکل کام نہیں؟ اگر انسانی ضمیر بھی انسانی دماغ کی شیطانی سوچوں کا ہم خیال ہو تو پھر انسان کو اپنے ضمیر سے نجات حاصل کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ احتیاط صرف یہ برتنی پڑتی ہے کہ ضمیر کی گہری و غفلت کی نیند کھلنے نہ پائے یا نیند میں کسی قسم کا خلل پیدا نہ ہو۔

اور کمزور ضمیر پر حاوی ہونا تو بے حد آسان ہوتا ہے بابو کا ضمیر بھی اس کے نفس کے مقابلے میں بے حد کمزور تھا۔ اگرچہ بابو نے کبھی اپنے ضمیر کو مارنے کی کوشش نہیں کی لیکن اس نے اپنے مقصد کی کسی بھی راہ پر قدم بڑھانے سے قبل اپنے ضمیر کی پکار کو کوئی اہمیت بھی نہیں دی گویا کسی بھی مرحلے پر اپنے ضمیر کو اپنے نفس پر حاوی ہونے نہیں دیا یہی وجہ تھی کہ بابو دن بہ دن برائیوں کے دلدل میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔

اپنے کمزور ضمیر پر غلبہ پانے کے بعد وہ نہایت خاموشی سے گھر سے باہر نکلا۔

ماحول پر رات کی سیاہی کی روایتی دہشت طاری تھی ہر انسان رات کے اندھیرے میں ہونے والی برائیوں اور گناہوں سے بے خبر گہری نیند کی چادر اوڑھے خوابوں کی حسین و پر اسرار دنیا میں گھوم رہا تھا۔ ایسے میں بابو اپنی زندگی کی ایک پر سکون رات قربان کئے اپنے غائب وجود خیر خواہ کے کہنے پر ایک ایسی راہ کی جانب بڑھے چلے جا رہا تھا جس کے بارے میں وہ قطعی اندھیرے میں تھا یعنی اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے کہاں جانا ہے؟ برگد والے بابا کون ہیں؟ یا یہ کہ جس راہ پر وہ بنا سوچے سمجھے قدم بڑھائے چلا جا رہا ہے کیا یہ راستہ واقعی اس کی منزل کی جانب ہی جاتا ہے؟

اگرچہ اندھیرا زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن بے دھیانی سے چلنا بھی مناسب نہیں تھا گھر سے نکلتے ہی بابو نے یہ احتیاط برتی تھی کہ گھر کے واحد داخلی و خارجی دروازے کو بند کر کے باہر سے کنڈی لگائی اور بند دروازے کی جانب پیٹھ کئے کھڑے رہ کر پہلے گردن گھما کر اپنے سیدھے ہاتھ کی جانب واقع راستے پر نگاہ دوڑائی اور پھر چہرہ گھما کر الٹے ہاتھ کی جانب واقع راستے کا بغور جائزہ لیا جہاں تک اس کی نگاہوں کی حد رہی اس نے دونوں راستوں کو قطعی سنسان پایا انسان تو کجا کسی کتے کے پلے تک کا وجود نہیں تھا خاموشی اس قدر گہری تھی کہ سناٹا چیختا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''یا اللہ! میری مدد فرمانا۔'' بابو نے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے دعا مانگی اور الٹے ہاتھ کی جانب واقع راستے کی سمت قدم بڑھا لئے۔

''جس کام کی شروعات ہی الٹی ہو اس کام کے سہل ہونے کی تم کیا امید لگا سکتے ہو؟'' اس کے ضمیر نے ایک بار پھر ہمت کر کے صدائے احتجاج بلند کی۔ بابو نے حسب عادت اپنے ضمیر کی یہ آواز بھی سن کر ان سنی کر دی اور اپنے دل میں امیدوں کے بے شمار چراغ روشن کئے آگے بڑھتا رہا۔

اس کے غائب وجود خیر خواہ نے جس ویران و غیر آباد جگہ کا ذکر کیا تھا بابو کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایسی کسی جگہ پر ایک بار انجانے میں راستہ بھٹک جانے کے باعث کئی لمحات تک گھن چکر بنا گھومتا رہا تھا اور اس نے وہاں دہشت سی طاری کر دینے والی ویرانی اور لرزہ بر اندام کر دینے والی خاموشی کے علاوہ کسی ایسی ہستی کا وجود نہیں دیکھا تھا جسے وہ ''بابا'' قسم کی کوئی پہنچی ہوئی ہستی قرار دے سکتا اس ویرانے میں برگد کا ایک بوڑھا درخت تو کھڑا تھا لیکن اس کی موٹی و مضبوط شاخوں تلے کسی بزرگ ہستی کا وجود اس دن بابو کو دکھائی نہیں دیا تھا۔ بہر حال پھر بھی اس کا دل قدرے مطمئن تھا صرف یہ سوچ کر کہ اس کا غائب وجود دوست اس سے غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتا کیونکہ اس نے خود کو بابو کا سچا خیر خواہ کہا تھا اور کوئی سچا خیر خواہ اپنے دوست کو اس کی منزل سے نہیں بھٹکا سکتا تھا۔

قدم بڑھاتے ہوئے بابو مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ کسی نیک و بزرگ ہستی کو آبادی سے اتنی دور ایک ویران و غیر آباد جگہ پر اپنی بیٹھک بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ بھلا ایسی ویران جگہ پر ان سے ملنے کون آتا ہوگا؟ آج کل کے برق رفتار دور میں بنا کسی پبلسٹی کے کون برگد والے بابا کی ہستی اور ٹھکانے سے واقف ہوگا؟ اور کس طرح ان تک پہنچ پاتا ہوگا؟

''میں بھی کتنا بڑا بے وقوف ہوں؟ جو نیک ہستیاں واقعی نیک و کراماتی ہوتی ہیں انہیں بھلا پبلسٹی کی کیا ضرورت؟ مجھے بھی تو برگد والے بابا کے بارے میں بتانے والی ایک پر اسرار غائب ہستی تھی...... اور جس طرح میں اپنے ایک انجان دوست و خیر خواہ کے کہنے پر اتنی رات گئے گھر سے نکل کر ایک دہشت ناک ویرانے کی جانب برگد والے بابا سے ملنے جا رہا ہوں اسی طرح باقی لوگ بھی اپنے اپنے خیر خواہوں کے کہنے پر برگد والے

بابا سے ملنے کسی طرح اس ویران جگہ پہنچ ہی جاتے ہوں گے۔" بابو نے از خود ہی اپنے دماغ پر یلغار کرتی سوچوں کا مقابلہ شروع کر دیا۔

سوچ کے بعد ایک اور سوچ...... پھر ایک اور سوچ اگر انسانی دماغ پر یونہی ایک تسلسل سے یکے بعد دیگرے سوچوں کے حملے ہوتے رہے تو انسانی دماغ کئی باتوں کی جانب مبذول ہو کر رہ جاتا ہے بابو کے دماغ میں ابھرتی سوچوں نے بھی ایک نیا موڑ لیا اور وہ سوچنے لگا۔" برگد والے بابا اس کے مسئلے کا کیا حل پیش کریں گے؟ کیا وہ حل اس کے لئے آسان ہدف ثابت ہوگا؟ کیا وہ کسی بھی انجانے ہدف تک پہنچنے کے لئے ثابت قدم رہ پائے گا؟ ابھی وہ انہی سوچوں کے تانے بانے میں الجھا کسی مثبت نتیجے پر پہنچنے بھی نہیں پایا تھا کہ دفعتاً اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نادیدہ قوت یا ہوا کے نادیدہ وجود نے اسے اپنی ہتھیلیوں پر اٹھا لیا ہو اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتا یا سمجھنے کی کوشش کرتا لمحے بھر کے اندر...... صرف پلک جھپکنے کی مختصر ترین مدت میں وہ اپنی مطلوبہ جگہ پر کھڑا تھا۔

وہ کئی لمحات تک حیرت زدہ و پریشان کھڑا حیران کن نگاہوں سے اپنے اطراف دیکھتا رہا...... سو فیصد وہ اسی ویران و غیر آباد جگہ پر موجود تھا جس کی نشان دہی اس کے غائب وجود خیر خواہ نے کی تھی اتنا اسے یقین تھا کہ وہ اپنے پیروں پر چل کر یہاں تک نہیں پہنچا تھا۔ اسے یہاں تک پہنچانے میں کسی غیبی قوت کا ہاتھ کار فرما تھا...... وہ شدت سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کا وجود کسی پرندے کی مانند فضا میں محو پرواز تھا یہ الگ بات ہے کہ فضا میں اڑتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ پاؤں قطعی نہیں ہلا رہا تھا یہی وجہ تھی کہ نہ تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور نہ ہی کسی قسم کی تھکاوٹ اس پر غالب آ رہی تھی۔

چاروں اطراف سے آن کر ٹکرانے والی ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوائیں اسے خوشگوار احساس سے دوچار کر گئیں۔ بابو نے دیکھا کہ آسمان پر چمکتا نصف چاند اپنی ٹھنڈی روشنی سے ویرانے پر کسی آسیب کی مانند مسلط اندھیرے کو شکست دینے کی اپنی سی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

اسی چاند کی ناکافی روشنی میں بابو نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھما کر برگد کے درخت کی تلاش کا آغاز کیا اور یہ دیکھ کر فرط مسرت سے اس کے چہرے پر سرخی سی بکھر کر رہ گئی کہ کچھ ہی فاصلے پر برگد کا بوڑھا درخت اپنے کشادہ وجود کے باعث دور ہی سے نمایاں ہو رہا تھا...... لیکن درخت کے واضح طور پر نظر آنے کی وجہ درخت کے وجود کا مخصوص پھیلاؤ نہیں بلکہ وہ بے شمار روشن دیئے تھے جن کی لو سے پھوٹنے والی روشنی نے درخت کے ارد گرد دن کا سا اجالا بکھیر رکھا تھا...... دیوں سے خارج ہوتی روشنی میں بابو نے دور ہی سے اس بزرگ کو دیکھ لیا جو سر تا پاؤں نارنجی رنگ کے لبادے میں کچھ اس طرح ملبوس تھے کہ صرف اس کا چہرہ ہی دکھائی دے رہا تھا باقی تمام وجود نارنجی لبادے میں چھپا ہوا تھا...... حیرت انگیز بات یہ تھی کہ بابا تنہا نہیں تھے ان کے ارد گرد ان کے کچھ عقیدت مند بھی دریوں پر نہایت خاموشی و ادب سے سر جھکائے بیٹھے تھے...... بابو کے پیروں میں تحریک سی بیدار ہوئی اور اس نے درخت کی جانب قدم بڑھانے شروع کر دیئے۔

"السلام علیکم۔" قریب پہنچ کر بابو نے بلند آواز میں سلام کیا۔ اس کا ایک خیال یہ تھا کہ جواب میں دریوں پر براجمان تمام ہستیوں کی جانب سے اس پر وعلیکم السلام کی بوچھاڑ ہو جائے گی لیکن یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اول! کسی ایک ہستی نے بھی اسے اس کے سلام کا جواب عنایت فرمانا گوارہ نہ کیا اور دوم یہ کہ دریوں پر براجمان تمام مرد و زن نے ایک دم سے اپنا چہرہ اٹھا کر اسے ایسی خون خوار یا کھا جانے والی نگاہوں سے گھورا جیسے اس نے انہیں سلام بھیج کر کوئی بہت ہی ناقابل معافی گناہ کر ڈالا ہو۔

اف خدایا! ان سب کے چہروں پر نظریں دوڑاتے ہوئے بابو کو اپنے پورے وجود پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں...... ایک سنسناہٹ سی ریڑھ کی ہڈی تک سرایت کر گئی اور اس خوف سے ابھرنے والی سنسناہٹ کی وجہ نہایت معقول تھی...... دریوں پر براجمان مرد و زن! جو تعداد میں سولہ تھے جن میں دس مرد اور چھ خواتین تھیں اپنے چہروں پر برستی وحشت کے سبب قطعی انسان دکھائی نہ دے رہے تھے...... ان کے چہروں پر سب سے زیادہ دہشت ناک ان کی آنکھیں تھیں جو اس قدر سرخ تھیں جیسے ان کے جسموں کا تمام لہو ان کی آنکھوں میں آن ٹھہرا ہو اور اس قدر تپش سی دے رہی تھیں جیسے کوئلے سلگ رہے ہوں...... یہ ان سولہ مرد و زن کی نگاہوں سے خارج ہوتی تپش کا ہی اثر تھا کہ بابو لمحے بھر کے اندر پسینہ پسینہ ہو کر رہ گیا...... اس کا دل اپنی معمول کی دھڑکن سے ہٹ کر بے حد تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''وہ...... وہ میں...... میں......'' بابو کی زبان بھی لڑکھڑاہٹ کا شکار ہو گئی۔

''خاموشی سے ایک جانب بیٹھ جاؤ۔'' ایک آدمی نے بدستور اسے گھورتے ہوئے کھرکھراتے لب و لہجے میں کہا۔

''اور اپنی باری آنے پر اپنا مسئلہ بیان کرنا۔'' آدمی نے اپنی بات مکمل کی۔

بابو ان سب پر اپنی نگاہیں گھماتا ہوا دھیرے دھیرے بیٹھنے کی تیاری کرنے لگا اس نے دیکھا کہ اس کے جھکنے کے ساتھ ساتھ سولہ مرد و زن کی نگاہیں بھی اس انداز سے آہستہ آہستہ جھکتی چلی جا رہی تھیں...... بابو کے بیٹھتے ہی سب نے بیک وقت اپنی گردنیں بابا کی جانب گھما دیں...... بابو ان کے درمیان کچھ عجیب سا محسوس کر رہا تھا جانے کیوں شدت سے اسے یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک اسی کی ہستی زندگی کی حقیقی حرارت سے لبریز ہو باقی تمام بیٹھے ہوئے وجود محض زندہ نظر آنے کی کوشش کر رہے ہوں دراصل وہ زندگی کی حرارت سے خالی محض جسم ہی ہوں...... اور بابو ایسا سوچنے پر اس لئے حق بجانب تھا کہ اسے ان کی آتی جاتی سانسوں میں وہ حرارت اور روانی محسوس نہیں ہو رہی تھی جو زندہ وجود کی پہچان ہے...... ان کے زندہ ہونے کی علامات و شناخت...... یہی وجہ تھی کہ وہ کچھ خوف سا محسوس کرنے لگا تھا...... لیکن چونکہ وہ ایک مضبوط قوت ارادی کا مالک انسان تھا اس لئے اس نے یہ سوچ کر بہت جلد اپنے خوف پر قابو پا لیا کہ......

''مسئلے مسائل تو زندہ انسانوں کی زندگیوں کا جنجال ہیں۔ زندہ انسانوں کو ہی پیروں فقیروں اور کراماتی بزرگ ہستیوں کی ضرورت پیش آتی ہے مر جانے والوں کو بھلا کیا حاجتیں ہو سکتی ہیں؟ اس لئے یہ انسان یقیناً زندہ ہیں ہاں! البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ دکھوں اور بیماریوں کی زیادتیوں نے انہیں موت سے پہلے مار ڈالا تھا۔ اس لئے ان کے چہروں پر برستی وحشت اور آنکھوں میں بسی ویرانیاں انہیں مردہ ظاہر کر رہی تھیں۔'' اپنے دل و دماغ کو خوف سے آزاد کرتے ہی بابو نے برگد کے درخت کا بغور جائزہ لیا۔

یہ دیکھ کر بابو ایک بار پھر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ چاروں اطراف تیز ہواؤں کا رقص جاری تھا اور یہی طوفانی ہوائیں جلتے ہوئے دیوں کے اردگرد بھی اپنے روایتی جوش و خروش سے منڈلا رہی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود دیوں کے شعلے بالو بالکل سیدھی کھڑی تھیں...... ہواؤں کی تیز رفتاری بھی ان دیوں کے شعلوں کو بجھانا تو در کنار! ٹمٹما بھی نہ پا رہی تھیں دیوں کے شعلے حیرت انگیز طور پر غیر متحرک کھڑے تھے البتہ ان دیوں سے پھوٹنے والی روشنیاں غیر حقیقی محسوس نہیں ہو رہی تھی...... وہ یہ دیکھ کر ایک نہ دو کئی لمحات تک غریق حیرت بیٹھا دیوں کے غیر متحرک شعلوں کو گھورتا

رہ گیا......اس کے دماغ کی خالی غلام گردشوں میں یہ سوال کسی بھٹکی ہوئی روح کی مانند چکرا تا رہا کہ۔

''یہ کس طرح ممکن ہے؟'' ابھی وہ اس معمے کو حل بھی نہیں کر پایا تھا کہ ایک عورت کی کھر کھراتی ہوئی آواز سماعتوں میں پڑ کر اس کے پورے وجود کو اس طرح جھنجھوڑ گئی جیسے کسی نے اسے گہری نیند سے بیدار کر ڈالا ہو......دیوں کی روشنی سے ہٹ کر اس کی توجہ و نگاہیں کھر کھراتی نسوانی آواز کے وجود کی جانب منتقل ہو کر رہ گئی۔

''بابا! یہ میری سگی بیٹی ہے۔'' ایک ادھیڑ عمر کی خاتون نے اپنے برابر بیٹھی ایک22,20 سالہ جوان لڑکی کی جانب دیکھ کر بابا کو مخاطب کیا جو بدستور آنکھیں بند کئے اور سر جھکائے بیٹھے تھے۔

''چھ مہینے قبل ہم نے اس کی شادی اس کے سگے چچا کے بڑے بیٹے سے اپنی حیثیت کے مطابق معقول دھوم دھام سے کروا کر اسے اس کے پیا گھر رخصت کیا تھا......شادی کے دو مہینے تک تو یہ بالکل ٹھیک ٹھاک بھلی چنگی رہی لیکن تیسرے مہینے کا چاند نظر آتے ہی ایک دن اچانک اسے اپنے سر میں درد سا محسوس ہونے لگا درد کی نوعیت عام سی جان کر اس کے شوہر، میں نے اور خود اس نے کوئی خاص توجہ و اہمیت نہیں دی اور سر درد میں فوری آرام پہنچانے والی ایک گولی پانی سے نگل کر اس نے معمول کے کام انجام دینے میں اپنا درد فراموش کر دیا......گولی نگلنے سے اس دن تو اسے سر درد سے آرام میسر آ گیا لیکن دوسرے دن صبح بیدار ہوتے ہی سر درد پھر سے آن وارد ہوا......یا یہ کہہ لیجئے کہ سر میں اٹھنے والے درد کی ٹیسوں نے اسے گہری نیند سے بیدار کر ڈالا......اگر درد ایک حد تک رہتا تو قابل قبول تھا اذیت ناک پہلو یہ تھا کہ درد کی شدت میں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اضافہ ہی ہوتا رہا اور شام ڈھلنے سے قبل درد کا یہ عالم ہو گیا کہ درد کی شدت برداشت نہ کر کے مانو یہ پاگل سی ہو گئی......کبھی اپنا سر دیواروں سے ٹکرائے جاتی......کبھی اپنے ہاتھوں سے اپنے سر پر ضربیں رسید کر کے خود کو پر سکون رکھنے کی اپنی سی ہر ممکن کوشش کرتی لیکن کم بخت مارے سر کے درد میں کسی بھی طریقے سے معمولی سی بھی کمی واقع نہ ہوئی......تیسرے دن اس درد نے میری بیٹی کی تمام تر ہمت کو گیلے کپڑے کی مانند نچوڑ کر رکھ دیا وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھنے کے لائق بھی نہ رہی......وہ بستر سے جا لگی یا یوں سمجھ لیجئے کہ بستر نے اسے اپنا شریک حیات بنا لیا......صبح سے لے کر آدھی رات تک سر کے منحوس درد سے میری بیٹی ایسے تڑپتی ہے جیسے زندہ مچھلی کو دریا سے نکال کر خشکی پر رکھ دیا گیا ہو......میرے داماد نے اس کا بہت ڈاکٹری اور حکیمی علاج کروایا لیکن اسے سر کے منحوس درد سے نجات حاصل نہ ہو سکی......مرد آدمی کب تک بیمار بیوی کو برداشت کرتا؟ جب ڈاکٹروں اور حکیموں نے بھی ہمت ہار دی تو اس کے شوہر نے اسے میرے در پر لا کر پھینک دیا۔

''یہ کیا منحوس اور بیمار عورت میرے گلے باندھ دی ہے؟ جانے اسے کون سی ایسی منحوس و لاعلاج بیماری لاحق ہے کہ کم بخت ماری صحت یاب ہونے کا نام لے کر نہیں دے رہی......اپنا ہزاروں روپیہ اس کے علاج پر برباد کر چکا ہوں۔'' میرے داماد نے اسے غصے سے گھور کر لہجے میں نفرت سی بھر کر کہا۔

''لیکن اسے تو کوئی بیماری لاحق نہیں ہے۔'' میں نے دکھ سے اپنی بیٹی کی جانب دیکھ کر داماد کے سامنے سچائی بیان کی۔ اپنی پیاری بیٹی کی ظاہری حالت نے مجھے آنسو بہانے پر مجبور کر دیا۔ سوجی ہوئی متورم آنکھیں، اترا ہوا چہرہ، چہرے پر چھائی زردی اور ہڈیوں کے ڈھانچے سے

مشابہہ وجود! ہم نے اپنی بیٹی اسے ایسی تو ہرگز نہیں دی تھی۔

''اسے اگر کوئی بیماری لاحق نہیں ہے تو پھر یہ ڈرامہ بازی کر رہی ہے...... اور اگر اس نے اپنی یہ ڈرامہ بازی بند نہیں کی تو میں اسے طلاق دے دوں گا۔'' اس نے دوٹوک اپنا فیصلہ سنایا اور اسے نفرت سے گھورتا ہوا چلا گیا۔

''کیا تکلیف ہے تجھے میری جان؟ یہ تو نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟'' میں نے اپنی اکلوتی اولاد کو ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے سینے سے لپٹا لیا۔

''ماں سر کا درد اٹھنے نہیں دیتا بہت اذیت دیتا ہے...... میں نے ندیم (شوہر) کی خاطر کئی بار اپنے اندر اٹھنے کی ہمت پیدا کی لیکن اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے ہی میری آنکھیں حلقوں سے باہر آنے لگتی ہیں...... جسم کا بچا کھچا لہو چہرے پر آن ٹھہرتا ہے...... پورا وجود شاخ بریدہ کی مانند کپکپا اٹھتا ہے اور مجھے شدت سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نادیدہ وجود کے نادیدہ لیکن بے حد طاقت ور ہاتھ نے میری گردن اپنی گرفت میں کس رکھی ہو اور وہ نادیدہ وجود ہرگز یہ نہیں چاہتا ہو کہ میں اٹھنے یا اٹھ کر چلنے کی ہمت کروں...... جیسے اسے یہ بات یا میری یہ حرکت قطعی پسند نہ ہو...... اس نادیدہ ہاتھ کی گرفت کی وجہ سے میرے سر میں درد کی ناقابل برداشت ٹیسیں اٹھنا شروع ہو جاتی ہیں اور میری ہمت اس قدر جواب دے جاتی ہے کہ میں پھر بستر سے جالگتی ہوں...... بستر پر گرتے ہی نادیدہ ہاتھ کی گرفت سے میری گردن کو بھی رہائی حاصل ہو جاتی ہے لیکن......؟ اف خدایا! سر کا درد ناقابل برداشت ہو کر رہ جاتا ہے...... اسی بات پر ندیم کو غصہ آن گھیرتا ہے اور ان کے لبوں سے میرے لئے گالیوں کا سیلاب رواں ہو جاتا ہے لیکن میں کیا کروں ماں! مجھ سے بالکل اٹھا نہیں جاتا۔'' میری بیٹی کے لہجے کی بے بسی اور آنکھوں سے بہنے والے آنسو مجھے بری طرح تڑپا گئے...... میں یہ سوچ سوچ کر پاگل ہونے لگی کہ میں اس بدنصیب لڑکی کو علاج کے لئے آخر کہاں لے جاؤں؟ ڈاکٹر اور حکیم پہلے ہی جواب دے چکے تھے۔

ایک دن میرے شوہر کو خدا کے کسی نیک بندے نے آپ کا نام و پتہ بتا کر کہا۔

''اب آپ کی بیٹی کی اس لاعلاج اور پراسرار بیماری کا علاج صرف برگد والے بابا ہی کر سکتے ہیں۔''

میں بہت امیدیں اور آس لے کر آپ کے در پر آئی ہوں میرا یقین کریں بابا میں ایک بہت ہی غریب عورت ہوں ہم نے اس کی شادی جس طرح کی ہے یہ ہمارا دل جانتا ہے اور یہ نصیبوں جلی چھ مہینے بھی اپنے پیا کے گھر میں ٹک نہ سکی اور پھر ہمارے سر پر ایک بوجھ کی مانند آن پڑی ہے...... میں آپ کے آگے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر یہ التجا کرتی ہوں کہ کوئی ایسا تعویذ عنایت فرما دیجئے کہ یہ بالکل ٹھیک ہو جائے اسے اس کے سر کے منحوس درد سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل ہو جائے...... یا...... پھر یہ دعا فرما دیجئے کہ اسے موت آ جائے میں اسے تڑپتا ہوا دیکھ سکتی ہوں نا ہی اجڑتا ہوا مر جائے گی تو ایک نہ ایک دن ہمارے دلوں کو قرار میسر آ ہی جائے گا۔ شوہر نے طلاق دے دی اور دوہرے دکھ کے باعث یہ دن رات روتی تڑپتی اور سسکتی رہتی تو اسے دیکھ کر ہمارا کلیجہ بھی سڑتا رہے گا۔'' عورت کے کھرکھراتے لہجے میں بسا دکھ وہاں موجود تمام نفوس کو اس قدر غمگین کر گیا کہ تمام مرد و زن بیک وقت اور ایک آواز میں اس طرح رونے لگے جیسے وہ اپنے کسی عزیز کے مر جانے پر ماتم کناں ہوں...... اف خدایا! سناٹے اور خاموشی میں ان کی کھرکھراتی آوازوں نے بابو کے دماغ کے تاروں کو ہلا کر رکھ دیا وہ قطعی غیر انسانی انداز سے اس طرح رو رہے تھے جیسے عورت کا دکھ

ان سب کا مشترکہ دکھ ہو...... بابو خوف زدہ نگاہوں سے ان کی شکل گھورتا رہ گیا روتے ہوئے وہ مزید بھیانک صورت دکھائی دے رہے تھے بابو اپنی نگاہیں چرا کر رہ گیا۔

''میری آنکھوں میں دیکھ لڑکی۔'' پہلی بار برگد والے بابا نے اپنی بند آنکھیں کھول کر عورت کی بیمار بیٹی کی جانب دیکھ کر اس قدر گرجدار لہجے میں لڑکی کو حکم سادرے کر کہا کہ ان کی آواز سناٹے وخاموشی کی دیوار میں شگاف ساڈالتی دور دور تک پھیل کر رہ گئی اور چند لمحوں تک گونج سی مچاتی معدوم پڑ گئی۔ بیمار لڑکی! جو اپنی ماں کی گود میں سر رکھے قطعی بے حس وحرکت زمین پر پڑی ہوئی تھی بابا کی گونج دار آواز سن کر ایک دم سے اس طرح اٹھ بیٹھی جیسے کسی نے اسے گہری نیند سے بری طرح جھنجھوڑ کر جبری بیدار ہونے پر مجبور کر دیا ہو۔

''میری آنکھوں میں دیکھ۔'' بابا کے دوبارہ کہنے پر لڑکی نے اپنی انگارہ آنکھیں بابا کی آنکھوں میں پیوست کر دیں...... بابو نے دیکھا کہ برگد والے بابا کی آنکھیں بھی خون کی مانند گہری سرخ ہو رہی تھیں بابا بنا پلک جھپکے اس لڑکی کی نگاہوں میں دیکھے گئے...... ایک، دو، تین لمحات پر لگا کر اڑتے رہے برگد والے بابا لڑکی کو اور لڑکی برگد والے بابا کو ایک تسلسل سے گھورتے رہے...... بابا نے ہار مانی اور نا ہی لڑکی نے ہمت ہاری۔

خدا جانے یہ کھیل کب تک جاری رہتا؟ کہ بابو کو یہ دیکھ کر قدرے اطمینان میسر آیا کہ لڑکی کی پلکیں بوجھل ہونا شروع ہو گئیں اس کے باوجود کہ لڑکی اپنی آنکھوں پر اوپری پردہ گرنے نہیں دے رہی تھی اور بار بار بوجھل ہوتی پلکوں کو ایک دم سے چوکنا ہو کر اوپر اٹھائے رکھنے کی کوشش کیے جا رہی تھی لیکن اسے اپنی اس کوشش میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی اور اس کی آنکھوں کی سیاہ پتلیاں اوپری پردے تلے جا چھپیں۔ ''دھب'' سے اس کا وجود بے جان سا ہو کر زمین پر گر کر رہ گیا۔

عورت نے گھبرا کر پہلے اپنی بیٹی کے بے جان وجود کی جانب دیکھا اور پھر اگلے ہی لمحے اپنی گھبرائی ہوئی نظروں کا زاویہ برگد والے بابا کے جلالی چہرے پر مرکوز کر دیا۔

''ڈرمت! زندہ ہے اسے نیند نے آن دبوچا ہے بہت دنوں بعد یہ آج اپنی نیند سوئی ہے۔'' بابا نے نرم لہجے میں عورت کو تسلی دی۔

دیگر لوگوں کے علاوہ برگد والے بابا کے لہجے کی کھرکھراہٹ بابو کو الجھن میں مبتلا کر گئی وہ یہ سوچ کر رہ گیا کہ آخر برگد والے بابا اور ان کے تمام عقیدت مندوں کے لہجوں میں یہ غیر انسانی سی کھرکھراہٹ کیوں تھی؟

''اور سن اسے سر درد کی کوئی تکلیف نہیں ہے اسے جان سے مارنے کے لئے اس پر کالا جادو کروایا گیا ہے۔'' بابا کے انکشاف نے دم سادھے بیٹھے تمام وجودوں میں ہلکی سی تحریک بیدار کی...... بیک وقت تمام وجود لمحے بھر کے لئے متحرک ہونے کے بعد پھر اس طرح چپ اور بے حس وحرکت ہو کر بیٹھ گئے جیسے وہ چابی والے کھلونے ہوں جو چابی ختم ہوتے ہی ایک دم سے رک گئے ہوں۔

''میری معصوم بچی نے کس کا کیا بگاڑا ہے؟ کون ہے وہ بدبخت جو میری اس بھولی بھالی بچی کو جان سے مارنا چاہتا ہے...... اللہ تعالیٰ اسے غارت کرے۔'' عورت کی آنکھوں سے آنسو جاری ہونے کی دیر تھی ایک بار پھر تمام مرد وزن بھی رونا شروع ہو گئے بابو ان کی نفسیات قطعی سمجھ نہ سکا اس نے اپنی زندگی میں ایسے انسان آج سے پہلے کہیں نہیں دیکھے تھے جو کسی کے دکھ یا تکلیف پر اس طرح کرب انگیز انداز سے روتے اور آنسو

بہاتے ہوں۔البتہ اس نے ایسے سنگ دل بے شمار دیکھے تھے جو اپنے جیسے کسی انسان کو دکھ یا اذیت میں مبتلا دیکھ کر بے حد خوش ہوتے ہیں اور کئی بار تو قہقہے لگانے سے بھی نہیں چوکتے...... یہ عجیب انسان تھے جو ایک عورت کے دکھ پر اتنا دکھی ہو رہے تھے کہ ان کے آنسو تھمنے میں نہ آ رہے تھے۔

''دیکھنا چاہتی ہے کہ وہ بدبخت کون ہے؟'' بابا نے عورت سے دریافت کیا عورت کے ساتھ دیگر مرد و زن بھی مشینی انداز سے اقرار میں گردنیں ہلا کر رہ گئے۔

بابو خاموش تماشائی بنا یہ سارا تماشہ دیکھے جا رہا تھا چند لمحوں کے لئے وہ اپنا مسئلہ قطعی فراموش کر بیٹھا تھا...... یا یوں کہہ لیجئے کہ اس عجیب و غریب صورت حال نے اس کے دماغ کو اس قدر الجھا کر رکھ دیا تھا...... اپنی گرفت میں کس لیا تھا کہ وہ اپنا مسئلہ ہی بھول بیٹھا۔

برگد والے بابا نے اپنے نیچے بچھی دری کا کونا ہٹا کر دری کے نیچے سے ایک بالکل سادہ کاغذ نکال کر اپنی چٹکی میں کاغذ کو ایک کونے سے پکڑ کر اپنے قریب رکھا ایک روشن دیا اٹھا کر اپنے سامنے کیا اور ایک بار پھر آنکھیں بند کر کے زیر لب کچھ پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔

ایک اور منظر بابو کی حیرت میں اضافے کا سبب بن کر رہ گیا جب اس نے یہ دیکھا کہ جس دیئے کی لو کچھ لمحے قبل ذرا بھی ٹمٹمانے پر راضی نہ تھی اسی دیئے کی لو یا شعلہ برگد والے بابا کے سامنے آتے ہی اس طرح ٹمٹمانے لگی جیسے پہلے اس دیئے کی لو بے جان ہو لیکن برگد والے بابا کے سامنے آتے ہی دیئے کے شعلے میں جان سی پڑ گئی ہو...... بابو نے بے اختیار نگاہیں اٹھا کر دیگر دیوں کی جانب دیکھا......دیگر تمام دیوں کی لو یا شعلے بدستور پہلے کی طرح غیر متحرک تھے...... برگد والے بابا کی آنکھوں دیکھی یہ کرامت بابو کو متاثر کر گئی۔

بابا نے پڑھنا ترک کیا...... اپنی آنکھیں کھولیں اور چٹکی میں پکڑے کاغذ کو اپنے سامنے رکھے دیئے کے شعلے سے چھو لیا...... ٹمٹماتے شعلے نے لپک کر کاغذ کو پکڑ لیا اور اپنی آگ سے کاغذ کے پورے وجود کو جلا کر کالا کر دیا...... کاغذ کو سیاہ کرتی آگ جب برگد والے بابا کی انگلیوں تک پہنچی تو از خود بجھ کر رہ گئی...... حیرت انگیز طور پر کاغذ مکمل طور پر جل جانے کے باوجود نا تو راکھ بن کر بکھرا اور نا ہی مرجھایا اگر یہ کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہو گا کہ کاغذ بدستور ایسا ہی رہا آگ نے صرف کاغذ کی سفید رنگت کو نگل کر سیاہ کر دیا۔

''یہ دیکھ مائی! یہ ہے وہ بدبخت جس نے اس پھول سی بچی کو مارنے کے لئے کالے جادو کا سہارا لیا۔'' بابا نے جلا ہوا سیاہ کاغذ عورت کی نگاہوں کے سامنے کر دیا۔

بابو اپنی زندگی کا بے حد انوکھا اور نا قابل یقین منظر دیکھ کر حیرت کی زیادتی سے گنگ سا ہو کر رہ گیا وجہ معقول تھی سیاہ کاغذ پر نہایت واضح طور پر ایک جوان مرد کا چہرہ ابھر آیا تھا۔ چہرے کے نقوش اس قدر واضح تھے کہ مرد کی عمر کا بخوبی اندازہ بھی لگایا جا سکتا تھا۔

''ہائے میں مر گئی۔'' عورت کے لبوں سے چیخ سے مشابہت رکھتی آواز نکل کر رہ گئی اور اپنا دل تھام کر رہ گئی شاید وہ اپنی بیٹی کے جان کے دشمن کو شناخت کر چکی تھی۔

''یہ بدبخت تو اس کا اپنا شوہر ہے یعنی میرا داماد ندیم۔'' عورت کے لہجے میں ایک بار پھر گہرا دکھ شامل ہو کر رہ گیا۔

''کیا میں جان سکتی ہوں کہ اس بدبخت نے میری بیٹی کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟'' عورت نے سوال کیا۔ ''تیرا داماد تیری بیٹی سے ذرا محبت

نہیں کرتا وہ بدبخت ایک بری عورت کے دام الفت میں جکڑا ہوا ہے...... وہ عورت اس کی ماں جادو ٹونے کی ماہر ہیں جادو کے زور پر ہی اس نے تیری بیٹی کے سہاگ کو اپنے قابو میں کیئے رکھا ہے...... تیرے داماد نے تیری بیٹی سے شادی محض اس لئے کی تھی کہ تیرے دیور یعنی تیرے داماد کے باپ کی دھمکی یہی تھی۔

''تو میری تمام دولت و جائیداد کا صرف اسی صورت میں حق دار ہو سکتا ہے اگر تو میرے بڑے بھائی کی اکلوتی بیٹی سے شادی کرنے پر رضا مند ہو گا۔ دوسری صورت میں میری تمام دولت و جائیداد میرے بڑے بھائی کی اسی بیٹی کے لئے میری جانب سے تحفہ ہو گی اور تو خود کو میری جائیداد سے قطعی بے دخل سمجھنا۔''

باپ کی یہ دھمکی کام کر گئی اور تیری بیٹی کی شادی ہو گئی تیرے داماد نے تیری بیٹی سے جبری شادی تو کر لی اور اپنے ماں باپ کی ناراضگی کے خیال سے تیری بیٹی سے جھوٹی محبت کا ڈرامہ بھی رچا تا رہا لیکن پس پردہ وہ تیری بیٹی کے وجود سے نجات حاصل کرنے کی تدبیریں سوچتا رہا اس کی یہ مشکل اس کی محبوبہ نے دور کر دی اور اسے کالے جادو کی راہ دکھائی وہ خود بھی اس بات کا خواہش مند تھا کہ وہ کچھ اس انداز سے تیری بیٹی کو مارنا چاہتا تھا کہ اس کی ہستی پر کسی کو معمولی سا شک بھی نہ گزرے اور اس کی راہ کی رکاوٹ بھی دور ہو جائے۔'' بابا نے اتنا کہہ کر چپ سادھ لی۔

''ہائے ہائے! کیسا حرامی نکلا ہے۔'' عورت بے حد نفرت سے بولی۔

''کیا تجھے یہ جاننے سے دلچسپی نہیں ہے کہ مجھے تیرے داماد کی اس سازش کا علم کیسے ہوا؟''

برگد والے بابا نے پہلی بار تبسم فرما کر عورت سے پوچھا چ تو یہ ہے کہ بابو بھی یہ راز جاننے کے لئے بے چین سا ہو رہا تھا اور ایک ماں کی بے چینی کے کیا کہنے؟ اس نے فوراً سے اقرار میں گردن ہلا کر اپنی بے چینی کا خاموش اظہار فرمایا۔

''تیری بیٹی کی آنکھوں نے مجھ سے ساری کہانی بیان فرمائی۔'' برگد والے بابا کا جواب سمجھ سے بالاتر تھا اس لئے بابو سمیت سب ان کی صورت تکتے رہ گئے۔

''تیری بیٹی کی دردناک کہانی تیری زبانی سن کر مجھے پہلا شک تیرے داماد پر ہی ہوا اس لئے میں نے ''عمل چشم'' کے ذریعے تیری بیٹی کی آنکھوں کی پتلیوں میں جھانک کر دیکھا تو تمام سچائی میرے سامنے عیاں ہو کر رہ گئی۔'' بابا نے کہا۔

''عمل چشم'' بے اختیار بابو کے لبوں سے ادا ہو کر رہ گیا۔ بابو کے ساتھ بیٹھے لوگوں نے بیک وقت مشینی انداز میں گردنیں گھما کر بابو کی جانب دیکھا۔

''کیا تجھے نہیں معلوم ''عمل چشم'' کسے کہتے ہیں؟'' ایک شخص نے اپنی کھر کھراتی آواز میں ایسے لہجے سے دریافت کیا جیسے بابو پر کسی بات پر اپنے بھرپور غصے کا اظہار فرما رہا ہو...... اس کی آنکھوں سے خون سا ٹپکتا محسوس ہوتا تھا۔

''ن نہیں...... میں عمل چشم تو کیا کسی عمل کے بارے میں کک کچھ نہیں جانتا۔'' بابو نے جواب دیا۔

''جس انسان پر اگر اس کے کسی دشمن نے کسی بھی قسم کا سفلی یا کالا جادو کر دیا ہو تو متاثرہ انسان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پہلے اس پر

سحر طاری کر کے عمل چشم کے ذریعے یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ اس کے کس دشمن نے اس پر سفلی یا کالا جادو کروایا ہے۔لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس انسان کا دشمن کبھی نہ کبھی اس کی نگاہوں کے سامنے ضرور رہا ہو...... پس پردہ رہ کر وار کرنے والے دشمن کا اس عمل سے پتہ نہیں چلایا جاسکتا۔" دہشت ناک انسان نے جواب دیا۔

"وہ کیوں؟" بابو نے پوچھا۔

"کیونکہ یہ عمل چشم ہے...... آنکھوں کا عمل اور انسانی آنکھ کیمرے سے مشابہہ ہے ایک بار کسی انسان کی صورت اس کیمرے کی زد میں آجائے تو دماغ کے کسی کونے میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو کر رہ جاتی ہے عمل چشم کے ذریعے انسانی دماغ میں محفوظ تمام صورتوں کو باری باری سامنے لاکر دشمن کا پتہ لگایا جاتا ہے...... یہ عورت خوش نصیب ہے کہ اسے اپنے بیٹی کے دشمن کا اتنی جلدی پتہ چل گیا...... ورنہ عموماً دنوں، ہفتوں، مہینوں اور بعض اوقات سالوں نکل جاتے ہیں دشمن کو کھوجنے میں۔" دہشت ناک انسان کی وضاحت سے بابو کے دل میں برگد والے بابا کی قدر و منزلت مزید بڑھ کر رہ گئی۔

"تو کیا میری بیٹی......؟" عورت اپنی بات مکمل نہ کرسکی۔

"ٹھیک ہو چکی ہے...... اور اب تجھے اپنے داماد کو کوسنے، برا بھلا کہنے کی یا اسے بددعائیں دینے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آنے والے دنوں میں وہ تیری اسی بیٹی کے! جس سے وہ نفرت کرتا ہے پیر دھو دھو کر پئے گا...... مانو اس کا دیوانہ ہو کر رہ جائے گا لیکن اپنی بیوی کو مارنے کی جو بھیانک سازش اس نے رچائی اسے اس حرکت کی سزا دینے کے لئے میں نے یہی اذیت و تکلیف اس کے وجود میں داخل کردی ہے...... اب تو یہ پوچھے گی کہ بابا تو یہاں سے اٹھ کر کہیں گئے نہیں پھر یہ کام کیسے کرلیا؟ تیرے دل کی تسلی کے لئے بیان کئے دیتا ہوں کہ میں نے اپنی ایک غلام روح کو حکم دے کر اسے تیرے داماد کی جانب روانہ کردیا ہے...... ہوش آنے پر اپنی بیٹی کو سمجھا دینا کہ شوہر کی تکلیف و اذیت دیکھ کر اپنا دل مضبوط رکھے اور اسے علاج کے لئے کسی ڈاکٹر یا حکیم کے پاس لے جانے کی ضرورت نہیں، جس دن اس نے تیری بیٹی کے آگے اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے اپنے کئے کی دل سے معافی طلب کرلی اس دن اپنے آپ وہ اس اذیت سے رہائی پالے گا۔"

"آپ عظیم ہیں بابا۔" عورت نے دل سے کہا۔

بابا نے اسے تسلی دیتے ہوئے اس جلے ہوئے کاغذ کو جس پر عورت کے داماد کا چہرہ ابھر آیا تھا تروڑ مروڑ کر اپنی مٹھی میں بند کرلیا چند لمحوں بعد جب برگد والے بابا نے مٹھی کھولی تو سب نے دیکھا کہ ان کا ہاتھ پہلے کی طرح بالکل صاف تھا جلا ہوا کاغذ تھا اور نا ہی کاغذ کی راکھ!

"تو جاسکتی ہے۔" برگد والے بابا نے عورت کو مخاطب کیا اور دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔

"اب تو جا تیری باری ہے۔" ایک آدمی نے بابو کی جانب دیکھ کر کہا۔

بابو کو اسی لمحے کا شدت سے انتظار تھا وہ ہوا کے بگولے کی مانند اپنی جگہ سے اٹھا اور لمحے بھر کے اندر برگد والے بابا کے سامنے جا ٹکا۔صرف ایک عورت کے مسئلے کے حل کے دوران اس نے بابا کی جتنی کرامات دیکھیں وہ اس کا دل مطمئن کرنے کے لئے اور یہ سمجھنے کے لئے کافی تھیں کہ برگد

والے بابا واقعی ایک پہنچی ہوئی ہستی ہیں۔

''بابا! میں اس لئے حاضر ہوا تھا کہ......؟'' ابھی بابو نے اتنا ہی کہا تھا کہ......؟

''میں سب جانتا ہوں تو یہاں کس لئے آیا ہے؟ اور تجھے کس نے میرے پاس بھیجا ہے؟'' بابا نے آنکھیں کھول کر بابو کی صورت تکتے ہوئے کہا ان کے لبوں پر غیر محسوس تبسم ابھر کر لمحے بھر کے اندر معدوم پڑ گیا۔ بابو یہ سن کر حیران سا رہ گیا۔

''کیا؟ آ...... آپ...... آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کے حضور اپنا کون سا مسئلہ لے کر آیا ہوں؟''

اس نے اپنی حیرت کو لفظوں میں ڈھالا۔

''ایک لڑکی سے شدید محبت کرتا ہے تو...... اس کے حصول نے تجھے پاگل بنا رکھا ہے......'' بابا کی زبان سے اپنا مسئلہ سن کر وہ لب کھولنے کے لائق ہی نہ رہا اور حیرت سے مجسمہ بنا برگد والے بابا کی صورت تکتا رہ گیا۔

''لڑکی کی ماں کی شرط بہت کڑی ہے...... صرف 20 دنوں میں 20 لاکھ روپے پیش کرنے کی شرط، ہے نا یہی بات؟'' بابا کے دریافت کرنے پر وہ سحر زدہ انداز سے اقرار میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

''زن، زمین اور زر، زیور کی ہوس نے ہمیشہ سے مرد کو اپنی گرفت میں کس رکھا ہے۔ اس شکنجے سے رہائی پانا نفس کے غلام اور اپنی بے حساب خواہشات کے پیچھے بھاگنے والے کمزور مرد کے بس کی بات نہیں...... حالانکہ انہی چیزوں کی ہوس مرد کو لے ڈوبتی ہے لیکن پھر بھی خدا کی یہ مخلوق انہی چیزوں کے حصول کے پیچھے پاگل ہے اور کچھ بھی کر گزرنے کو ایک دم تیار۔'' بابا کی ان باتوں کا مفہوم بابو کی سمجھ نہیں آ سکا۔

''کیا میں اپنی محبت حاصل کرنے میں کامیاب ہو پاؤں گا۔'' بابو نے دھڑکتے دل کے ساتھ دریافت کیا۔

''مرد کے ارادے اگر چٹان ہوں تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے آسمان سے تارے بھی توڑ کر لا سکتا ہے۔'' بابا نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ بابو کے چہرے پر جوش کی سرخی بکھر کر رہ گئی۔

''پھر جس نے تجھے میرے پاس بھیجا ہے اس کی خاطر میں تجھے مایوس نہیں لوٹا سکتا۔'' بابا کی اس بات پر بابو کا ذہن ایک دم سے اپنے غائب وجود خیر خواہ کی پراسرار ہستی کی جانب منتقل ہو کر رہ گیا۔ گویا جو غائب وجود ہستی بابو کے لئے ایک سوالیہ نشان بنی ہوئی تھی برگد والے بابا اس ہستی کو جانتے اور پہچانتے تھے اور بابو کے لئے یہ ایک سنہرا موقع تھا اپنے غائب وجود خیر خواہ کی پراسرار ہستی کے بارے میں کچھ جاننے کا۔

''کیا میں یہ جاننے کی گستاخی کر سکتا ہوں کہ مجھے آپ کے پاس بھیجنے والی ہستی کون ہے؟''

''ان باتوں کو رہنے دے۔'' جانے کیوں برگد والے بابا کا لہجہ ایک دم سے سخت ہو کر رہ گیا؟

''ہر بات وقت کے حساب سے کہی جائے تو زیادہ مزا دیتی ہے بے موسم کا پھل اور بے وقت کی بات میں کوئی چاشنی نہیں پائی جاتی ہے...... ہر بات اپنے وقت پر کھل کر سامنے آ جائے گی کوئی راز، راز نہیں رہے گا ہر راز سے از خود پردے اٹھتے چلے جائیں گے۔'' بابا نے گویا اسے ٹال کر اس کے اندر جنم لیتے تجسس کو اپنی باتوں سے مزید جلا بخشی۔ بابو کے دماغ کے پردے پر غائب وجود خیر خواہ کا چکراتی ہوا سے مشابہہ پراسرار

وجود لہرا کر رہ گیا۔

''اس وقت تو صرف یہ جان لے کہ تو اپنی محبت کو پا سکتا ہے۔'' برگد والے بابا کے یہ الفاظ بابو کے جسم میں نئی روح پھونک گئے۔ اس کی آنکھوں کی چمک میں غیر معمولی اضافہ ہو کر رہ گیا۔

''زندہ وجود کے دل کی ترجمان ان کی آنکھیں ہی ہوتی ہیں۔'' برگد والے بابا نے بابو کی ہیروں کی مانند چمکتی آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا۔

بابو برگد والے بابا کے اس جملے کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا اور نگاہوں میں سوال بھر کر بابا کی جانب دیکھا جو کہیں کھو سے گئے تھے۔

''بابا! آپ میری محبت کے بارے میں کچھ فرما رہے تھے۔'' لمحے بھر کے لئے بابو کو ایسا محسوس ہوا جیسے بابا کی آنکھیں کسی خزاں رسیدہ گلستان کی مانند اجاڑ و ویران ہیں جن میں نامعلوم ویرانی اور خالی پن تو شدت سے محسوس ہو رہا تھا لیکن زندگی سے بھرپور چمک اور حرارت کہیں دکھائی نہ دے رہی تھی۔

''ہاں! میں یہ کہہ رہا تھا کہ تو ایک باہمت نوجوان ہے اور تو اپنی محبت کو پا سکتا ہے۔'' بابا نے اپنے الفاظ دہرا کر اسے خوشیوں کا خزانہ سونپ دیا۔

''لیکن میری ایک بات یاد رکھنا کسی بھی چیز کا حصول آسان نہیں ہوتا، تجھے بھی اپنی محبت کو پانے کے لئے اپنی بہت زیادہ ہمت و بہادری کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔'' بابا نے کہا۔

''میں اپنی محبت کو پانے کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں آپ صرف مجھے یہ بتایئے کہ مجھے کیا کرنا ہے؟'' بابو نے بے اختیار بابا کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ لئے لیکن اگلے ہی لمحے اس نے انتہائی برق رفتاری سے اسی بے اختیاری سے اپنے ہاتھ اس طرح کھینچ لئے جیسے نادانستگی میں بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں تھرکنے لگیں اور وہ اپنا بدن سمیٹے کسی ڈرے سہمے بچے کی طرح برگد والے بابا کی صورت تکتا رہ گیا...... اس کر کے بے اختیار خوف زدہ ہونے کی وجہ معقول تھی بابا کے ہاتھ برف کی سل کی مانند سرد تھے...... جیسے ان کے وجود میں زندگی کی حرارت کا گزر نہ ہو۔

بابو نے محسوس کیا کہ برگد والے بابا نے اس کے دور ہٹنے اور خوف زدہ ہو جانے والی حرکت کو کوئی اہمیت نہ دی بلکہ مکمل طور پر نظر انداز فرما دیا یہی وجہ تھی کہ بابو اپنی اس حرکت پر خود ہی بے حد شرمندہ ہو کر رہ گیا اور اپنی گزشتہ حالت کی بحالی میں جت گیا۔

''اتنا جان لے کہ تجھے تیری خوش نصیبی مجھ تک لائی ہے اگر قدرت نے تیرے ہاتھوں کی لکیروں میں تیری محبت کا حصول درج نہیں کیا ہوتا تو تیرا مجھ تک پہنچنا آسان نہیں تھا تیرا یہاں تک آنا اور مجھ سے ہم کلام ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ کامیابی تیرے قدم چومے گی تیری محبت تیری جھولی میں ہوگی۔'' بابا کی ان باتوں نے اس پر ایک دم سے حملہ آور ہو جانے والے خوف کو ایک جھٹکے سے ختم کر کے رکھ دیا اس کے لبوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ آن ٹھہری۔

''اگر میں اپنی محبت کو پانے میں کامیاب ہو گیا تو آپ کا یہ احسان میں تاحیات یاد رکھوں گا۔'' بابو نے عقیدت و احترام سے اپنے دونوں

ہاتھ جوڑ دیئے اس کا سر بھی ذرا سا جھک کر رہ گیا۔

''صرف بیس لاکھ روپوں کی کیا اہمیت؟ دولت کے پہاڑ تیرے اطراف آن ٹھہریں گے میں تجھے زمین کی تہوں اور سمندر کی گہرائیوں میں پوشیدہ خزانے حاصل کرنے کا ایک آسان سا عمل بتاؤں گا...... عمل کی کامیابی میں ہی تیری خوشیوں کی ضمانت ہے۔'' بابا کے الفاظ اس کے ذوق تجسس کو ہوا دیتے رہے۔

''جلدی بتایئے بابا! اب مجھ سے برداشت نہیں ہو پا رہا۔'' بابو نے اپنی بے صبری کا اظہار کیا۔

''آج نہیں۔'' برگد والے بابا نے مسکرا کر کہا۔

''کک کیا مطلب؟'' وہ حیران سا ہوا تھا۔

''مطلب یہ کہ آج نہیں کل تو اسی وقت یہاں دوبارہ آنا میں تجھے وہ عمل بتا دوں گا۔ اب تو جا سکتا ہے۔'' بابا کے لہجے میں ایک دم سے سختی در آئی۔

''کل! کل کیوں بابا! آج کیوں نہیں؟'' بابو نے بے صبرے پن کا مظاہرہ کیا۔

''ہر کام کرنے کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے اور وقت پر ہی ہر کام انجام پاتے ہیں...... تو دیکھ رہا ہے ابھی بہت سوالی اپنے دامن میں دکھوں اور تکالیف کے کانٹے بھرے بیٹھے ہیں مجھے سب کو تھوڑا تھوڑا وقت دے کر ان کی تکالیف اور دکھ دور کرنے کی کوشش کرنی ہے میرا آج کی باقی شب کا تمام وقت ان دکھی لوگوں کے لئے ہے تیرا وقت پورا ہوا اب تو کل آنا...... ہاں! یہ میرا وعدہ ہے کہ میرا کل کا تمام وقت صرف تیرے لئے ہو گا کل میں تیری ہر بات تسلی و اطمینان سے سن کر تجھے وہ آسان عمل اور اس کی تفصیلات سے آگاہ کر دوں گا...... اب تو گھر جا کر آرام کر۔'' بابا نے اپنی بات مکمل کرتے ہی آنکھیں بند کر لیں جو اشارہ تھا اس بات کا کہ اب وہ مزید کچھ سننے کے موڈ میں نہیں ہیں بابو کے وجود سے انہوں نے اس طرح توجہ ہٹا لی جیسے سرے سے بابو کی ہستی موجود ہی نہ ہو۔

بابو نے دو تین بار کچھ کہنے کے لئے اپنے لبوں کو متحرک کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار بابا کے بازو کے قریب بیٹھے دو کالے اور بھیانک صورت آدمیوں نے اپنے موٹے بھدے ہونٹوں پر اپنی موٹی انگلی رکھ کر ''شیش'' کی آواز خارج کرتے ہوئے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا نا چاہتے ہوئے بھی بابو کو وہاں سے اٹھتے ہی بنی۔

اس نے بابا اور ان کے عقیدت مندوں سے رخ موڑا اور گھر کی جانب جانے والے راستے کی جانب چل پڑا۔

وہ مسلسل یہی سوچ جا رہا تھا کہ آخر وہ عمل آج بتانے میں حرج ہی کیا تھا؟ وہ ان کے عقیدت مندوں کے جانے کا انتظار کر لیتا اب اس قدر لمبا وقت اس سے کس طرح کٹے گا؟ اسے بابا کے عقیدت مندوں پر شدید غصہ آنے لگا جو اپنے بے سروپاؤں کے مسائل لئے چلے آتے تھے۔

بابو کے خیال سے اس کا مسئلہ دنیا کے تمام حساس مسائل سے زیادہ حساس، گھمبیر اور فوری توجہ کا طالب تھا اسی لئے برگد والے بابا کو چاہئے تھا کہ لوگوں کے مسائل کو ایک طرف رکھ کر پہلے بابو کے مسئلے کا حل پیش کرتے کیونکہ اس کے پاس وقت بہت محدود تھا اور رقم بہت زیادہ! اللہ

جانے برگد والے بابا ایسا کون سا عمل بتائیں گے کہ دولت کے پہاڑ آن کھڑے ہوں گے؟ اور وہ زمین کی گہرائیوں اور سمندر کی تہوں میں چھپے خزانوں کا یک و تنہا مالک ہو کر رہ جائے گا۔

"اگر سچ مچ ایسا ہو گیا تو تمام مسائل اپنے آپ حل ہو کر رہ جائیں گے۔" اس سوچ کے آتے ہی اس کے دل میں برگد والے بابا کے لئے بے شمار عقیدت و احترام کے جذبات بیدار ہونے لگے انہی جذبات نے اسے گردن گھما کر برگد والے بابا کی متاثر کن ہستی کی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

گردن گھما کر اس نے اپنے عقب میں دیکھا ہی تھا کہ "بھک" سے اس کا دماغ اڑ کر رہ گیا۔

آنکھوں کی سیاہ پتلیاں برگد کے درخت والی جگہ پر گویا جم کر رہ گئیں وجہ معقول تھی بابا اور ان کے عقیدت مند برگد کے درخت والی جگہ سے ایسے غائب تھے جیسے سرے سے ان کا وہاں کوئی وجود ہی نہ ہو۔

برگد کا درخت جو بے شمار روشن دیوں کے باعث دن کے سے اجالے میں نہایا ہوا تھا۔ اب محض چاند کی روشنی میں اداس اداس اور اس طرح تنہا کھڑا تھا جیسے برسوں سے کسی کے آنے کی راہ تک رہا ہو۔

"یا اللہ! یہ سب کیا اسرار ہے؟ بابا اور ان کے عقیدت مند ایک دم سے کہاں چلے گئے؟ ان سب کو زمین کھا گئی یا آسمان نے نگل لیا۔" ابھی وہ حیرت و استعجاب کے گہرے سمندر میں ڈوبا اس معمے کو حل بھی نہ کر پایا تھا کہ ایک دم سے خاموشی اور سکوت میں غرق ویران جگہ پر اپنے تنہا ہونے کے احساس نے اسود ہلا کر رکھ دیا...... اس نے خوف زدہ نظروں سے اپنے اطراف میں پھیلے ویران علاقے کا سرسری جائزہ لیا۔ کہتے ہیں خوف اتنا طاقتور نہیں ہوتا جتنا خوف کا احساس ہوتا ہے...... اگر ایک بار خوف کسی پر حملہ آور ہو جائے تو ہر بار خوف کا احساس بڑھتا ہی جاتا ہے...... بابو کے دل و دماغ پر بھی خوف حملہ کر چکا تھا اور ہر گزرنے والے لمحے کے ساتھ خوف کے بڑھتے ہوئے احساس نے بابو کو اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا...... خوف کے بڑھتے ہوئے اسی احساس نے اسے یہ محسوس کروایا کہ ماحول میں رچی بسی یہ خاموشی اور دل پھاڑ کر رکھ دینے والا بھیانک ترین سکوت یونہی نہیں تھا؟ اس کا دل انجانی وحشت اور پوشیدہ خوف کے باعث بندر والے کی ڈگڈگی کی مانند بجنے لگا۔

کس قدر خوف و دہشت انگیز تھا یہ تصور کہ! چند لمحات قبل وہ کچھ لوگوں کے درمیان بیٹھا تھا جو سب ایک دم سے چند لمحات کے اندر جانے کہاں اور کیسے غائب ہو کر رہ گئے تھے؟ اس نے کسی ایک بندے کو جاتے ہوئے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا اور اس قدر ویران و غیر آباد جگہ کے قرب و جوار میں انسانی آبادی کا وجود تک نہ تھا کہ شک کیا جا سکتا۔

"کھڑ کھڑ...... کھڑ رڑ...... کھڑ۔" اچانک اسے اپنی پشتی جانب سے ایسی آواز ابھرتی ہوئی محسوس ہوئی جیسے کوئی وجود سائیکل پر سوار نہایت تیز رفتاری سے سائیکل چلائے اسی کی جانب بڑھا چلا آ رہا ہو...... اس احساس کے بیدار ہوتے ہی اس نے بے اختیار اپنے پورے وجود کے ساتھ گھوم کر آواز کی سمت دیکھا...... گیارہ تاریخ کے چاند کی روشنی میں جہاں تک اس کی بینائی نے ساتھ دیا اسے دور دور تک کسی سائیکل سوار کا نام و نشان تک دکھائی نہ دیا...... اس سے پہلے کہ وہ اپنا وہم جان کر اپنی توجہ ہٹا پاتا سائیکل چلنے کی آواز ایک بار پھر اس کی سماعتوں سے آن ٹکرائی اس نے اپنے جسم کی تمام تر قوت اپنی آنکھوں کی پتلیوں میں منتقل کر کے ایک بار پھر آواز کی سمت دیکھا لیکن ایک بار پھر اسے کچھ دکھائی نہ دیا...... یا...... اس کی

بصیرت اسے سائیکل سوار کا وجود دکھانے سے قطعی قاصر رہی لیکن......؟ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ آواز ایک تسلسل سے نا صرف سنائی دیتی رہی بلکہ ہر گزرنے والے لمحے کے ساتھ قریب سے قریب تر آتی ہوئی محسوس ہوتی رہی۔ اس سے پہلے کہ بابو نادیدہ سائیکل سوار کے متعلق کوئی اندازہ لگا پاتا اس احساس نے اسے ہلا کر رکھ دیا کہ نادیدہ سائیکل سوار کے ارادے بے حد خطرناک تھے وہ اپنی تیز رفتاری کے زعم میں مبتلا اپنی راہ میں حائل ہونے والی ہر چیز کو روندتا اور اڑاتا ہوا گزر جانا چاہتا تھا اور اس لمحے اس کی راہ میں حائل ہونے والی واحد رکاوٹ بابو کی ہستی تھی اور قبل اس کے کہ نادیدہ سائیکل سوار اس کے وجود سے آن کر ٹکراتا......؟ بابو نے لمحے بھر کی تاخیر کے بغیر اپنے وجود کو ایک طرف کر دیا۔

''اف خدایا!'' یہ اس کا وہم ہرگز نہیں تھا۔ ''زن'' سے کوئی نادیدہ وجود ہوا کے تیز جھونکے کی مانند اس کے بے حد قریب سے گزر گیا بابو کے دل کی دھڑکنیں بری طرح بکھر کر رہ گئیں اس نے بے اختیار گردن گھما کر اپنے قریب سے گزرنے والے نادیدہ سائیکل سوار کو دیکھا اس نے یہ یقین کر لیا تھا کہ اسے نادیدہ سائیکل سوار دکھائی نہیں دے گا لیکن اس لمحے اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے اپنی کھلی آنکھوں اور اپنے پورے ہوش وحواس سے ایک سائیکل سوار کو جاتے ہوئے دیکھا، سائیکل سوار بھی گردن موڑے اس کی جانب دیکھ رہا تھا......اس کا چہرہ جلتے ہوئے تانبے کی مانند تپتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''باز آ جاو ورنہ، بہت پچھتائے گا۔'' سناٹے میں اس کی گرجدار آواز کی گونج نے زمین کے سینے پر موجود چیزوں پر لرزہ سا طاری کر کے رکھ دیا خود بابو کا دل بھی گویا لرز اٹھا وہ حیرت وخوف کے باعث مجسمہ سا بنا سائیکل سوار کو گھورتا رہ گیا۔ سائیکل سوار بھی اسے اپنی لہو رنگ نگاہوں سے گھورتا آگے ہی آگے بڑھتا رہا اگرچہ اس کے چہرے کا رخ بدستور بابو کی جانب تھا لیکن بابو نے دیکھا کہ اس کی سائیکل چلانے کی رفتار میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی اور ایک بار پھر وہ بابو کو دیکھتے دیکھتے اس کی نظروں کے سامنے سے از خود غائب ہو کر رہ گیا......اس کے غائب ہونے کی دیر تھی کہ بابو کے پیروں میں بجلی سی بھر کر رہ گئی اور اس نے وہ دہشت انگیز جگہ چھوڑنے میں لمحے بھر کی بھی تاخیر گوارہ نہ کی۔

جب وہ اپنے گھر کے بند دروازے تک پہنچا تو اس کی ہمت جواب دے گئی وہ بند دروازے سے پیٹھ ٹکائے بیٹھ گیا اس کا کشادہ سینہ نا صرف دھونکنی کی مانند تیزی سے پھول پھول کر پچک رہا تھا بلکہ جسم کے تمام مسامات سے نمکین پانی اس روانی سے خارج ہو رہا تھا کہ وہ سرتا پاؤں اس بری طرح بھیگ چکا تھا جیسے وہ کسی نہر سے کپڑوں سمیت ایک ڈبکی لگا کر نکلا ہو......سناٹے اور خاموشی کے باعث اسے خود اپنی بپھری ہوئی سانسوں کی آواز کانوں کے قریب دھمک سی پیدا کرتی محسوس ہو رہی تھی کئی لمحات یونہی گزر گئے اس نے بہ مشکل تمام اپنی حالت کو قابو کیا۔

''اپنی اس بہادری پر تمہیں فخر ہے؟ حیرت ہے۔'' اسی غائب وجود خیر خواہ کی آواز ابھری اور گرم ہوا کا جھونکا سا بابو کے قریب سے گزر گیا۔ بابو ایک دم سے چونکنا ہو کر آواز کی سمت کا اندازہ کرنے لگا۔

''تم نے تو کہا تھا کہ تم بہت بہادر اور مضبوط اعصاب کے مالک ہو۔ پھر اس طرح بدحواس ہو کر بھاگ کھڑے ہونے کے کیا معنی ہوئے؟'' آواز کے لہجے میں بسا تمسخر بابو کے پورے وجود میں چنگاریاں سی سلگا گیا۔

''وہ سب بھوت اور بدروحیں تھیں......اور میں نے بھوتوں یا بدروحوں کے سامنے اپنی بہادری دکھانے کی بات نہیں کی تھی اور نا ہی مجھے یہ

معلوم تھا کہ تم مجھے دھوکہ سے بھوتوں اور بدروحوں کے درمیان بھیج رہے ہو، اگر مجھے اس بات کا ذرا سا بھی اندازہ ہوتا تو میں تمہارے کہنے پر اپنے گھر سے نکلتا اور نہ ہی ان بھوتوں کے درمیان اتنا وقت گزارتا...... ویسے سچ تو یہ ہے کہ مجھے تم پر بھی بھوت ہونے کا گمان ہے۔" بابو نے اپنے غصے کا اظہار فرمایا جواباً غائب وجود کا قہقہہ فضا میں بکھر کر رہ گیا۔

"مجھے تم بھوت سمجھو یا تمام ارواح خبیثہ کا ابا حضور! مجھے تمہاری کوئی بات بری نہیں لگے گی لیکن برگدوالے بابا جیسی ہستی کی شان میں ایسے گستاخانہ کلمات ادا کرنے سے پہلے سوچ لیا کرو کیونکہ میں ان کی ہستی سے متعلق ایک بھی غلط لفظ برداشت نہیں کروں گا۔" آواز میں غصے اور ناراضگی کا عنصر نمایاں تھا جو بابو کی عقل سے قطعی بالاتر تھا۔ آواز کا غائب وجود اپنے آپ کو بابو کا دوست اور سچا خیر خواہ کہتا تھا اور ناراض ان ہستیوں کی خاطر ہو رہا تھا جن کے بارے میں ابھی بابو یہ بھی اندازہ نہیں کر پایا تھا کہ آیا وہ زندہ وجود تھے یا بھٹکی ہوئی روحیں؟

"جن کے چہروں پر وحشت سی برس رہی ہو...... جن کی آنکھیں زندگی کی حرارت یا رمق سے قطعی خالی محسوس ہو رہی ہوں...... جن کی آوازیں بلغمی اور ہیبت ناک سی کھرکھراہٹ لئے ہوئے ہوں...... جو مشینی انداز سے بیک وقت اپنے چہرے اور دیدے گھما کر بار بار ایک عورت کی دردناک کہانی پر ایک ساتھ رو رہے ہوں اور سب سے بڑھ کر جن کے وجود برف کی سل کی مانند بے حد ٹھنڈے پڑے ہوں ایسی ہستیوں کو مردے یا بدروحیں نہ کہا جائے تو پھر کیا کہا جائے؟ اور ایک دم سے ان کے وجود کا غائب ہو جانا ان کے بدروح ہونے کا کھلا ثبوت ہے۔" بابو نے بھی بھرپور طریقے سے اپنا دفاع کیا۔

"یہ تم سے کس نے کہا کہ روحیں یا بدروحیں غائب ہوتی ہیں؟ کیا تمہارا واسطہ کبھی کسی بدروح سے پڑ چکا ہے؟" غائب وجود نے سوال کیا۔

"جنرل نالج بھی کوئی چیز ہوتی ہے؟" بابو کے لہجے میں تمسخر در آیا۔

"کیا میں یہ جاننے کی گستاخی کر سکتا ہوں کہ تمہیں یہ معلومات عامہ کہاں سے میسر آئیں؟" آواز نے کہا۔

"کیا میں یہ سمجھوں کہ تم میری معلومات کو چیلنج کر رہے ہو؟" بابو نے جواباً سوال داغ دیا۔

"میں نے ایسا تو نہیں کہا۔" آواز کے نادیدہ وجود نے جواب دیا۔

"انداز تو یہی بتا رہا ہے۔" بابو نے بحث کی۔ "تم نے خود ہی تو کہا کہ جنرل نالج بھی کوئی چیز ہوتی ہے اسی بہانے میری معلومات عامہ میں بھی کچھ بیش قیمت معلومات کا اضافہ ہو جائے گا۔" جانے کیوں بابو کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا نادیدہ خیر خواہ مسلسل اس کا تمسخر اڑا رہا ہو یا اسے بے وقوف جان کر بھرپور لطف حاصل کر رہا ہو۔

"ہم نے اپنے بزرگوں سے یہ باتیں سن رکھی ہیں...... اور ہمارے بزرگوں نے اپنے بزرگوں سے...... اور ان بزرگوں نے اپنے بزرگوں سے یہ سنا تھا کہ روحیں ہوں یا بدروحیں، بھوت پریت، چڑیلیں ہوں یا جنات، انسانی نگاہوں کے سامنے کھڑے ہی کھڑے غائب ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔" بابو نے جواب دیا۔

"کیا تم ان باتوں پر یقین رکھتے ہو؟" آواز ابھری آواز کا غائب وجود اپنی عادت سے مجبور ہوا کی مانند یہاں سے وہاں چکراتا پھر رہا تھا

خدا جانے اس کی ایسی کون سی مجبوری تھی۔ جس کے باعث اس کے لئے ایک جگہ ٹک کر کھڑے رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا؟

''یقین نہ رکھنے کی کوئی وجہ؟'' بابو نے مضبوط لہجے میں دریافت کیا۔

''میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔'' آواز ابھری۔

''تم سے ملنے...... میرا مطلب ہے تمہاری آواز سے متعارف ہونے سے قبل اگر یقین پختہ نہیں تھا تو تم سے ملنے کے بعد میرے اس یقین میں پختگی آچکی ہے کہ شیطان اور دیگر ہوائی مخلوق چشم انسانی سے پوشیدہ رہنے کی قوت رکھتے ہیں۔'' بابو نے بات ختم ہی کی تھی کہ اپنے لبوں سے ادا ہونے والے ایک لفظ یا نام نے اسے چونکا کر رکھ دیا۔

''کہیں تم شیطان تو نہیں ہو؟'' بابو نے بے اختیار پوچھ لیا۔

''میرے ایسے نصیب کہاں؟'' غائب وجود کی آواز میں بولتی حسرت بابو کو حیران کر گئی۔

''شیطان ہونا تمہارے خیال سے خوش نصیبی ہے؟'' بابو نے اپنی حیرت کو زبان بخشی۔

''میری چھوڑو اپنی کہو...... تمہاری بزدلی نے مجھے بے حد مایوس کیا۔'' غائب وجود نے افسوس کا اظہار کیا اور ایک بار پھر نہایت خوب صورتی سے بات ٹال گیا۔

''میں نے اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں دی تھی کہ میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا...... جہاں تک بہادری کی بات ہے تو مجھے اپنے بہادر ہونے پر جو فخر ہے وہ تا حال برقرار ہے۔'' بابو نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اب تم جا سکتے ہو مجھے نیند آرہی ہے میں پہلے ہی تمہارے ایک بے کار سے مشورے پر عمل فرما کر اپنی ایک رات کی آدھی حسین نیند گنوا چکا ہوں باقی گنوانا نہیں چاہتا۔'' بابو نے ٹکا سا جواب دے کر دروازے کی کنڈی کھولنا شروع کر دی۔

''برگد والے بابا نے غائب ہونے کا ڈرامہ تمہاری بہادری و ہمت کو جانچنے کے لئے رچایا تھا۔'' آواز کے غائب وجود نے فوراً سے ایک ایسا تیر چھوڑا جو عین نشانے پر جا کر لگا اور بے اختیار بابو کے ہاتھ دروازے کی کنڈی پر ٹھہر سے گئے۔

''تمہارے ان الفاظوں سے میں کیا معنی اخذ کروں۔'' بابو نے پلٹ کر دریافت کیا۔

''یہی کہ برگد والے بابا کسی بھوت یا بدروح کا نام نہیں ہے...... بابا اور ان کے عقیدت مند وہیں اسی جگہ پر موجود تھے...... جب تم ان کے درمیان سے اٹھ کر چل دیئے تو یہ دیکھنے کے لئے کہ تم کس قدر مضبوط اعصاب کے مالک ہو بابا نے اپنے ایک ادنیٰ سے کرشمے کا استعمال کرتے ہوئے اپنے آپ کو اور اپنے تمام عقیدت مندوں کو ایک ایسے نادیدہ پردے کے پیچھے پوشیدہ کر لیا جسے تم نہیں دیکھ پائے...... آسان لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ اپنے اور تمہارے درمیان ایک ماورائی پردہ تان لیا...... اس نادیدہ یا ماورائی پردے کے پیچھے بابا اور وہاں بیٹھے تمام لوگ تمہاری ایک ایک حرکات و سکنات کو دیکھ رہے تھے مگر تم انہیں دیکھنے سے محروم تھے......'' غائب وجود کی آواز اس کے اردگرد چکراتی رہی۔

''اگر برگد والے بابا نے نادیدہ پردہ تان لیا تھا تو مجھے برگد کا درخت کیوں دکھائی دے رہا تھا؟''

بابو نے اپنے دل کی مکمل تشفی کے لئے دریافت کیا۔

''بابا نے صرف اپنا اور اپنے عقیدت مندوں کے وجود ہی پوشیدہ کیے تھے۔'' آواز آئی۔

''گویا تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھوت یا بدروحیں نہیں تھے۔'' بابو نے دریافت کیا۔

''نہیں! وہ صرف تمہاری بہادری کا امتحان بلکہ ٹیسٹ لیا جا رہا تھا اور مجھے نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ تم اس ٹیسٹ میں پاسنگ نمبرز حاصل نہیں کر پائے۔'' آواز کے غائب وجود نے دکھ اور افسوس کا بھرپور اظہار فرما کر بابو کو پچھتانے پر مجبور کر دیا۔

''تو؟ تو کیا کل برگد والے بابا مجھ سے ملاقات نہیں فرمائیں گے؟ مجھے وہ عمل بھی نہیں بتائیں گے جو میری محبت مجھ سے ملانے اور مجھے دولت مند بنانے کا ایک آسان عمل ہے۔'' اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

''کیا کہا جا سکتا ہے؟'' غائب وجود نے اسے تسلی تک دینا گوارہ نہ کیا بابو کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

''کیا تم کچھ نہیں کر سکتے؟'' بابو نے ایک امید سے دریافت کیا۔

''تمہاری خاطر کوشش تو کر سکتا ہوں، شاید بابا کی خفگی دور کر سکوں۔'' غائب وجود نے کہا۔

''میں کب تک تمہاری آمد کا منتظر رہوں؟'' بابو نے بے صبری سے دریافت کیا۔

''تم بابا کے حکم کے تحت کل رات اسی جگہ پہنچ کر پھر بابا سے ملاقات کرنا...... میں ابھی اور اسی وقت بابا کے حضور پہنچ کر ان کی خفگی اور غصہ دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں تم مایوس مت ہو۔'' غائب وجود کے لہجے میں بابو کے لئے تسلی در آئی۔

''کیا بابا مان جائیں گے؟'' بابو نے سوال کیا۔

''ستر فیصد امید تو یہی ہے کہ میں انہیں منانے میں کامیاب رہوں گا آگے تمہارا نصیب؟'' غائب وجود نے کہا۔

''گویا مجھے 30 فیصد انکار کے خدشے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔'' بابو نے کہا۔

''ظاہر ہے لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ میں اپنی ہر ممکن کوشش کروں گا۔'' غائب وجود نے کہا۔

''میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو؟ تمہارا نام یا پہچان کیا ہے؟ تمہاری اصلیت کیا ہے؟ لیکن جانے کیوں میرا دل یہ کہتا ہے کہ تم پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟'' بابو نے مسکرا کر کہا۔

''اور تمہارا دماغ کیا کہتا ہے؟'' غائب وجود نے بھی غالباً مسکراہٹ کا استعمال فرمایا تھا۔

''میرا دماغ کچھ حد تک میرے ضمیر کی گرفت میں ہے اور میرا دماغ یا میرا ضمیر یہ کہتا ہے کہ کسی بھی راستے پر قدم بڑھانے سے قبل خوب سوچ لینا چاہئے۔'' بابو نے جواب دیا۔

''دل و دماغ کے درمیان یہ جنگ برسوں سے یونہی جاری ہے کبھی دل کے فیصلے غالب آ جاتے ہیں دماغ پر! اور کبھی دل پر دماغ کا غلبہ ہو جاتا ہے لیکن یہ قطعی ضروری نہیں کہ ہمیشہ دماغ سے کیے گئے فیصلے ہی کامیابی سے ہمکنار ہوں، کئی معاملات میں بندے کو دل کی بھی سننا پڑ جاتی

ہے۔خصوصاً محبت وعشق کے معاملے میں انسان سنتا صرف اپنے دل کی ہے کیونکہ یہ لطیف جذبہ دل میں ہی بیدار ہوتا ہے اور اس جذبے کا مکمل تعلق دل سے ہی ہوتا ہے......اور سچ تو یہ ہے کہ محبت کے معاملے میں دل کے فیصلے ہی پائیدار ہوتے ہیں۔'' غائب وجود نے کہا۔

''میں نے ہمیشہ اپنے دل کا کہا ہی مانا ہے۔جس دن میں نے اپنے دماغ کا کہا سن لیا میری ہستی کا اسی دن خاتمہ ہو جائے گا اور یہ بابو قربانی کا بکرا بن کر رہ جائے گا بہنوں کی ضرورتوں اور خوشیوں پر قربان ہونے والا ایسا بکرا جس کی اپنی کوئی خواہش یا تمنا کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔'' بابو کے لہجے میں تلخی در آئی۔

''لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ایک انسان پر اس کی اپنی ذات کا پہلا حق ہے...... پہلے انسان کو اپنی ذات کے متعلق سوچنا چاہئے پھر کسی اور کے بارے میں۔'' غائب وجود نے رائے پیش کی۔

''مجھے تمہاری رائے سے اتفاق ہے اور اتفاق سے میں بھی تمہاری طرح ہی سوچتا ہوں۔اسی لئے میری تم سے یہ التجا ہے کہ اپنی بے وقوفی سے اپنا بنا بنایا کام میں آپ بگاڑ آیا ہوں اب ایک دوست ایک سچے خیر خواہ ہونے کے ناطے تمہیں ہی میرا بیڑہ پار لگانا ہوگا۔'' بابو کے لہجے میں التجا سی تھی۔

''تمہیں اپنا ہم خیال پا کر مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے اب تم قطعاً کوئی فکر مت کرو برگد والے بابا کی ناراضگی دور کرنا میری ذمہ داری ہے اور میں اپنی تمام مصروفیات کو پس پشت دھکیل کر سب سے پہلے تمہارا یہ کام کروں گا لیکن تمہیں دو باتوں کا بے حد خیال رکھنا ہوگا۔'' غائب وجود نے کہا۔

''حکم کرو۔'' بابو نے مسکرا کر شوخی سے کہا۔

''سب سے پہلی بات تو یہ کہ تم کل برگد والے بابا سے ملنے ہر حال میں پہنچو گے اور دوسری اور سب سے اہم بات یہ کہ کوئی تمہیں برگد والے بابا کے بارے میں کچھ بھی الٹا سیدھا کہے تم اپنے دل ودماغ میں شک کے کیڑوں کو کلبلانے ہرگز نہیں دو گے......تم میری بات کا مطلب سمجھ رہے ہو نا یعنی بابا کی ہستی سے متعلق کوئی غلط بات یا کسی غلط سوچ کو اپنے دل میں جگہ نہیں دو گے...... میں صاف لفظوں میں کہے دیتا ہوں کہ اب اگر تم سے کوئی الٹی سیدھی حرکت سرزد ہوئی تو میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گا بلکہ میں کبھی تمہارے پاس نہیں آؤں گا......اور تم جانتے ہو بلکہ بہت اچھی طرح جان گئے ہو کہ میرے لوٹ جانے سے اور بابا کی ناراضگی سے سراسر نقصان تمہیں پہنچے گا برگد والے بابا کی ناراضگی مول لے کر تم اپنی ہستی پر سے بابا کا اعتماد کھونے کے ساتھ ساتھ اپنی محبت کو بھی ہمیشہ کے لئے کھو دو گے۔'' آواز اس کے اطراف چکراتی ہوئی اسے ڈراتی رہی اور خاموشی سے کھڑا سنتا رہا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں اب ایسا نہیں ہوگا میرا یقین کرو میں وعدہ کر رہا ہوں۔'' بابو نے کہا۔

''ٹھیک ہے زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ تمہیں ایک اور موقعہ ملنا چاہئے لیکن یہ بات فراموش مت کرنا کہ یہ تمہارا دوسرا اور آخری چانس ہوگا...... جسے تم سنہرا موقعہ یا گولڈن چانس بھی کہہ سکتے ہو اور اس سنہرے موقع سے تم کس طرح فائدہ حاصل کرتے ہو یہ تمہاری ذہانت پر منحصر ہے۔'' آواز کا گرم ہوا سے مشابہہ وجود حسب عادت چکرا کر اپنی بات بیان کرتا رہا۔

''اور ہاں! کل کسی غیر معمولی بات کے دکھائی دینے پر ڈر و خوف سے بھاگ کھڑے مت ہونا یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے دینا......

مضبوط کر لینا کہ یہ تمہاری آزمائش ہے۔'' آواز ابھری۔

''ٹھیک ہے۔'' بابو نے بچوں کی سی سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔

''اب میں چلتا ہوں وقت ضرورت حاضر ہوتا رہوں گا۔'' آواز کے اختتام پر بابو نے ہوا کا بگولہ سا سرکتا ہوا محسوس کیا۔

''اگر کبھی مجھے تمہاری ضرورت محسوس ہوئی تو میں تمہیں کس طرح طلب کروں؟ یا کہاں آ کر تم سے ملاقات کروں۔'' بابو نے دریافت کیا اور جواب کا انتظار فرمانے لگا لیکن اس کا انتظار انتظار ہی رہا اس کی سماعتوں نے اپنے غائب وجود دوست یا خیر خواہ کی آواز نہیں سنی۔

''لگتا ہے چلا گیا۔'' بابو نے اپنے آپ سے کہا اور دروازے کی کنڈی کھول کر گھر میں داخل ہو گیا۔

گھر میں داخل ہونے کے بعد اس نے سب کے کمروں میں جھانک دیکھا۔ اس کے ماں باپ اور بہنیں بدستور گہری نیند کے مزے لوٹنے میں مصروف تھے...... اس نے یہ سوچ کر سکون کی سانس خارج کی کہ اس کے گھر سے باہر رہنے کے دوران کسی کی نیند نہیں کھلی اور اس کی غیر حاضری کسی کی نگاہوں میں نہیں آنے پائی وہ بے فکری و بے خوفی سے چلتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

تھکن کی انتہائی زیادتی نے اسے بری طرح نڈھال کر ڈالا تھا۔ اس نے اپنے وجود کو اپنے آرام دہ بستر پر گرا سا دیا۔

اسے یہ سوچ کر حیرت سی ہو رہی تھی کہ جب وہ گھر سے برگد والے بابا سے ملنے کے لئے نکلا تو گھر سے بابا کے ٹھکانے تک پہنچنے کی دو گھنٹے کی پیدل مسافت لمحوں کے اندر اس قدر سہولت سے طے ہو گئی جیسے اس نے فضا میں اڑتے ہوئے وہ مسافت چند لمحوں کے اندر طے کر لی ہو لیکن......؟ یہی مسافت اس وقت شیطان کی آنت محسوس ہونے لگی جب وہ خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اف خدایا! بھاگ بھاگ کر اس کی ٹانگیں درد کرنے لگی تھیں...... اس کی سانسوں کی غیر معمولی آمد و رفت کے باعث اس کے نتھنوں سے گویا آگ سی خارج ہو رہی تھی لیکن راستہ تھا کہ کٹنے کا نام تک نہیں لے رہا تھا...... عجیب بات یہ تھی کہ وہ جتنا تیزی سے بھاگتے ہوئے راستہ طے کر رہا تھا اسے اپنی نگاہوں کے سامنے کا راستہ مزید لمبا ہوتا محسوس ہو رہا تھا...... بے تحاشہ بھاگتے ہوئے اب اس کی پنڈلیاں بھی درد سے کراہ اٹھی تھیں۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟ کیا واقعی ایسا ہوا یا یہ محض اس کے محسوسات تھے؟ اپنے ذہن میں چکراتے ان سوالوں کا جواب اس کے دماغ کی جانب سے کیا حاصل ہوتا؟ یہ سننے کا اس کے پاس وقت ہی نہیں تھا کیونکہ شدید تھکن کے باعث اس پر لمحے بھر کے اندر نیند کی دیوی کا ایسا سحر چڑھا کہ وہ گہری نیند کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

''ارے بدبخت! اب تو اٹھ جا...... دیکھ کس قدر دن چڑھ آیا ہے۔'' عبداللہ کی چبھتی ہوئی آواز سماعتوں سے ٹکراتے ہی اس کے دماغ میں ایسا ارتعاش سا برپا کر گئی کہ وہ ایک دم سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

بستر سے اٹھتے ہی وہ ہوا کے بگولے کی مانند غسل خانے میں جا گھسا۔ تازہ دم ہونے کے بعد اس نے حسب عادت ڈٹ کر کڑک چائے، گھی والے پراٹھے اور انڈوں کے آملیٹ سے ناشتہ کر کے اپنی جسمانی مشینری کو ایندھن فراہم کیا اور سکون و اطمینان سے بیٹھ کر کل رات والے انوکھے حیرت انگیز اور ناقابل یقین واقعات پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور فرمانے لگا۔

رات کے وقت اس کے کمرے میں اچانک سے ایک غائب ہستی کی آمد، اس غائب ہستی کا خود کو اس کا سچا خیر خواہ بتا کر برگد والے بابا کے متعلق بتانا، اس کا برگد والے بابا سے ملنے جانا اور لمحوں کے اندر مطلوبہ جگہ پر پہنچ کر برگد والے بابا سے شرف ملاقات حاصل کرنا اور پھر ایک دم سے بابا اور ان کے عقیدت مندوں کو غائب ہوتے دیکھ کر اس کا ہراساں ہو کر بھاگ کھڑے ہونا اور ایک بار پھر غائب وجود ہستی سے ہم کلام ہونا، کیا یہ ایسی باتیں تھیں کہ جن پر یقین کیا جا سکتا؟ ایسی انہونی باتوں کو خواب تو کہا جا سکتا ہے لیکن حقیقت تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کسی کو یقین دلایا جا سکتا ہے؟ لیکن سب سے حیرت انگیز بات ہی یہی تھی کہ گزشتہ رات وقوع پذیر ہونے والی ایک ایک بات حقیقت پر مبنی تھی اور بذات خود بابو گزشتہ رات والی حیرت اور ناقابل یقین باتوں کو محض اس لئے سچائی تسلیم کرنے پر مجبور تھا کہ ان تمام حیرت انگیز واقعات کا چشم دید گواہ وہ خود تھا...... بلکہ گواہ کہنا تو سراسر غلط تھا وہ تو ان واقعات کا ایک اہم کردار تھا۔ ان سب باتوں سے وہ کیا نتیجہ اخذ کرے؟ کیا یہ اشارہ اس بات کا نہیں تھا کہ قدرت بھی اس کا ساتھ پوری طرح دینے پر آمادہ دکھائی دے رہی تھی...... اس کا مکمل ساتھ دینے کا اعلان یا اظہار فرما رہی تھی۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو کوئی غائب وجود ہستی اس کی خیر خواہ بن کر اس کے کمرے میں از خود کیسے آن وارد ہوتی؟ اسے برگد والے بابا کا کیسے پتہ ٹھکانہ معلوم ہو پاتا؟ ان تمام باتوں کا صاف مطلب یہی تھا کہ کامیابی اس کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔ اب معصومہ کو اس کی زندگی کا ساتھی بننے سے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی تھی۔

''ہائے معصومہ!'' معصومہ کے قیامت خیز حسن کا تصور کر کے ہی وہ بے اختیار اپنا دل تھام کر رہ گیا اس کے دل کی دھڑکنیں بھی خوشی کے مدھر گیت الاپنے لگیں وہ چشم تصور میں معصومہ کو اپنی دلہن کے روپ میں دیکھنے لگا بے اختیار اس کے چہرے پر خوشی و مسرت کے کئی رنگوں نے آن کر بسیرا کر لیا۔

''میرا انتظار کرنا معصومہ! میں بہت جلد آؤں گا اور اپنے دامن میں صرف بیس لاکھ روپے لے کر ہی نہیں بلکہ تمہارے لئے دنیا جہاں کی خوشیاں بھی بھر کر آؤں گا جو میں تمہارے حسین قدموں تلے پھول کی پتیوں کی مانند بکھیر کر رکھ دوں گا۔'' اس نے بے اختیار کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈال کر وقت دیکھا پانچ بج کر بیس منٹ کا وقت دیکھ کر اس کے اپنے چہرے پر بارہ بج کر رہ گئے ابھی تو کئی گھنٹے پڑے تھے یہ کم بخت وقت بھی آج چیونٹی کی سی چال سے گزر رہا تھا...... ایک ایک لمحہ کسی جانی دشمن کی موت کی خبر کی مانند ترسا ترسا کر گزر رہا تھا...... بلکہ گزر کہنا بھی سراسر غلط تھا بلکہ رینگ رہا تھا...... یا...... سرک رہا تھا بابو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ وقت کو دھکیل کر جلد از جلد آگے بڑھنے پر مجبور کر دے۔

لیکن وقت کی نمایاں خوبی ہی یہی ہے کہ یہ کسی کی خوشی غمی کی پرواہ کئے بغیر اپنی مخصوص چال سے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے یہ کسی کے آنسو دیکھ کر ٹھہرتا ہے نا کسی کی ہنسی کا ساتھ دینے کے لئے رکتا ہے اس کا کام آگے اور آگے اور آگے ہی بڑھتے رہنا ہے اسے کسی کی ہنسی خوشی یا غم و آنسوؤں سے کوئی سروکار، کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔

وقت کے گزرنے میں ہی انسان کی بھلائی پوشیدہ ہے کیونکہ اگر وقت کے بڑھتے ہوئے قدم ٹھہر گئے تو کہیں دکھ ٹھہرے رہ جائیں گے اور کہیں خوشیاں! وقت کے گزرنے یا آگے بڑھنے ہی میں انسان کا سکھ چین پنہاں ہے کیونکہ یہ وقت ہی تو ہے جو اپنوں کے لگائے گئے زخموں پر مرہم لگا کر ٹوٹے اور بکھرے ہوئے انسان میں جینے کی کچھ کرنے کی امنگ جگاتا ہے اور یہی وقت ہوتا ہے جو خوشیوں کے لمحات کو یاد کروا کر انسان کو دوبارہ

خوش ہونے کا موقعہ فراہم کرتا ہے۔

بابو نے وقت گزارنے کے لئے لٹو سے ملنے کا ارادہ کرلیا۔ گھر میں بیٹھ کر وہ اس قدر لمبا وقت نہیں کاٹ سکتا تھا بعض اوقات وقت کاٹنا بھی کسی سزا سے کم نہیں لگتا اور سزا بھی ایسی جو کوئی گناہ یا جرم کئے بغیر جبری بھگتنی پڑ جاتی ہے۔

لٹو اسے اپنے مخصوص ٹھکانے یعنی ہوٹل میں بیٹھا ہوا مل گیا۔

''شکر ہے میرے اللہ! یہ چاند تو نظر آیا۔'' لٹو نے اس کی صورت دیکھتے ہی دونوں ہاتھ اٹھا کر آسمان کی جانب چہرہ اٹھا کر باقاعدہ اشارے سے اللہ میاں کا اس طرح شکر ادا کیا جیسے وہ بابو کے دیدار کو ترس رہا ہو۔

''کیا بات ہے میرے یار؟ خیر خیریت تو ہے؟ اس دن کے بعد سے تو ایسے غائب ہو کر رہ گیا جیسے گدھے کے سر سے سینگ...... بلکہ سینگوں کے نیچے پورا گدھا...... کیا میری باتیں اتنی ہی بری لگیں کہ میری شکل دیکھنا بھی تو نے گوارہ نہ کیا؟'' لٹو نے اسے دیکھتے ہی سوالات کے پتھر برسا کر اسے سٹپٹا کر رکھ دیا۔

''نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے...... سچ کہتا ہوں میں نے تیری کسی بات کو اپنے دل و دماغ کے کسی کونے میں ذرا سی بھی جگہ نہیں دی ہے...... اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں آج بھی تجھ سے ملنے نہیں آتا۔'' بابو نے ایک کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''پھر اتنے دن کہاں غائب رہے؟'' لٹو نے پوچھا۔

''بس یونہی ادھر ادھر پھرتا رہا۔ تو سنا دھندے سب ٹھیک چل رہے ہیں۔'' بابو نے بات گھما ڈالی۔

''دھندے سارے اے ون چل رہے ہیں...... ارے ہاں دھندے سے یاد آیا ایک بہت مشہور لیڈر کے بہت بڑے جلسے میں خوف و ہراس پھیلا کر عوام کو بھاگنے پر مجبور کر دینے پر خان نے خوش ہو کر ہمارے گروپ کے تمام لڑکوں کو دس دس ہزار روپے نقد انعام پیش کیا...... خان نے تیری غیر حاضری کو بھی شدت سے محسوس کیا بہر حال میں نے تیری طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر بات سنبھال لی ہے...... لیکن تیری صورت دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے جیسے میرا بہانہ بالکل جھوٹا نہیں تھا...... مجھے تیری طبیعت واقعی کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی......'' لٹو نے بغور اس کی صورت دیکھ کر کہا جہاں کل رات کی بے خوابی کی تھکن اپنی کہانی آپ بیان کرتی واضح دکھائی دے رہی تھی۔

''نہیں طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے۔ بس کل رات ٹھیک طرح سے سو نہیں سکا۔'' بابو نے جواب دیا۔

''دو دودھ پتی ملائی مار کر۔'' لٹو نے بیرے کے آتے ہی چائے کا آرڈر دے کر اسے فوراً پلٹنے پر مجبور کر دیا اور ایک بار پھر بابو کی جانب متوجہ ہوا۔

''خان بہت خطرناک آدمی ہے اس کے دشمن تو کیا دوست بھی اس سے اس قدر لرزتے ہیں کہ کوئی بات اس کے مزاج سے ہٹ کر کہنے کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتے...... اور میرے کو جانے کیوں ایسا لگ رہا ہے کہ دھندے میں تیری غیر دلچسپی اسے ذرا چوکنا کر گئی ہے۔'' لٹو کی اس بات نے بابو کو گھبرا کر رکھ دیا۔

''تو نے کیسے اندازہ لگایا'' بابو نے پوچھا۔

''اپنے گروپ کے ہر لڑکے سے الگ الگ تیری مسلسل غیر حاضری سے متعلق پوچھ چکا ہے...... اپنا سکندر ٹری فیٹر بتا رہا تھا کہ کل خان نے اس سے بھی تیرے بارے میں کرید کی۔'' لٹو نے کہا۔

''ٹری فیٹر نے کیا جواب دیا؟'' بابو بے حد متفکر ہوا تھا۔

''فکر مت کر ہم میں سے کسی نے بھی خان کو تیری پریم کہانی نہیں سنائی ہے..... ٹری فیٹر نے جواب دیا کہ چاچا یعنی تیرے باپ کو تیرے برے کام پسند نہیں ہیں اس لئے تو نے اپنے باپ کو خوش کرنے کی خاطر چند دنوں کے لئے اپنے سارے برے کام بند کر دیئے ہیں لیکن تو آئے گا ضرور۔'' لٹو نے جواب دیا۔

''اور خان نے اس بات پر یقین کر لیا؟'' بابو نے حیرت سے دریافت کیا۔

''کیا کہا جا سکتا ہے ہم نے تو اپنے طور پر اسے مطمئن کرنے کی اپنی سی ہر ممکن کوشش کی ہے..... ایک بات میں تجھے بول دیتا ہوں جب تک تو دھندے پر نہیں آئے گا خان مطمئن نہیں بیٹھنے والا...... تو فضول میں اسے اپنی طرف سے مشکوک کیے جا رہا ہے دھندے پر آ کر اس کا دماغ ہٹانے کی کر۔'' لٹو نے مشورہ دیا۔

''نہیں ابھی نہیں! ایک دو دن کے بعد میں کوئی جواب دوں گا۔'' بابو نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

''ہاں یاد آیا! تیری پریم کہانی کہاں تک پہنچی؟ کہانی میں کوئی دلچسپ موڑ آیا...... یا...... اب تک یونہی یار کی ایک جھلک پر گزارہ کیے بیٹھے ہیں محترم؟'' لٹو نے مسکرا کر دریافت کیا۔

''کیا بتاؤں یار؟ ایک بہت ہی خوب صورت رومانٹک اور دل و دماغ پر سحر ساطاری کر دینے والا لمحہ آندھی کی طرح آیا اور طوفان کی مانند میرے جذبات کو تہہ و بالا کرتا ہوا گزر گیا..... لیکن اس ایک لمحے نے تیرے اس یار کی زندگی بدل کر رکھ دی ہے۔ اب تو بس یہی دل چاہتا ہے جس قدر بھی جلد ممکن ہو میں اپنی محبت کو حاصل کر کے اپنی زندگی میں شامل کر لوں۔'' بابو نے ایک حسرت سے کہا۔

''تو مسئلہ کیا ہے؟'' لٹو نے پوچھا۔

''بیس لاکھ روپے۔'' بابو نے مسکراہٹ بکھیری۔

''کیا مطلب؟'' لٹو کے لہجے میں حیرت در آئی۔

''کس چیز کا مطلب پوچھ رہا ہے بیس لاکھ کا یا لاکھ کا؟'' بابو نے ہنس کر پوچھا۔

''یہ تیری سیدھی سادی پریم کہانی میں بیس لاکھ روپے کا لفڑا کہاں سے آن ٹپکا؟'' لٹو نے کہا۔

''ولن کا رول ادا کرنے..... تو تو جانتا ہے کہ جب تک کسی محبت کی کہانی میں سماج کی دیوار یا کوئی ولن نہ ہو تو کہانی مکمل رہتی ہے اور نا ہی کہانی میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے آسان لفظوں میں تو یہ سمجھ لے کہ قدرت نے میری محبت کی اس کہانی کو ہپی اینڈ (Happy End) دینے کے لئے

بیس لاکھ روپے کو بطور ولن کہانی میں شامل کر دیا ہے۔'' بابو کی بات لٹو کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔

''تجھے معلوم ہے میری عقل ذرا موٹی ہے صرف سیدھی سادی بات اس کھوپڑی میں گھستی ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ تو سادہ لفظوں میں وہ بات کر جو مجھے آسانی سے سمجھ آ سکے۔'' لٹو نے بے زاری کا برملا اظہار فرما دیا۔'' بابو نے اپنے چھوٹے قد کے کم عقل دوست کو زیادہ الجھانا مناسب نہیں سمجھا اور معصومہ سے آخری ملاقات کی تمام تفصیل لٹو کے گوش گزار کر دی۔

''یہ تو تیری آنٹی صاحبہ نے بڑا رولا پا تا اے۔۔۔۔۔ہن تو کی کرے گا؟۔۔۔۔'' تفصیل سن کر لٹو کے چہرے پر بھی فکر مندی دوڑ لگانے لگی۔

''کہیں یہ معصومہ باجی کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں نہیں دینے کا کوئی بہانہ تو نہیں؟ کیونکہ بیس دن کے اندر بیس لاکھ روپے کا انتظام کرنا کوئی مذاق نہیں ہے اور ایک ایسے شخص کے لئے جس نے زندگی میں کبھی ایک لاکھ روپے بھی اکٹھے دیکھے ہوں اور نا ہی ہاتھ میں لئے ہوں۔'' لٹو نے کہا۔

''لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔'' بابو نے کہا۔

''پاگل ہوا ہے کیا؟ ایک لڑکی کو حاصل کرنے کے لئے تو بیس لاکھ روپے کہاں سے لائے گا؟'' لٹو چیخ پڑا۔

''وہ صرف ایک لڑکی نہیں ہے وہ تیرے یار کی زندگی ہے اگر میں اسے حاصل نہ کر سکا تو میں اپنی جان دے دوں گا کیونکہ اس کے بغیر جینا کسی نا کردہ گناہ کی کڑی سزا سے بھی بدترین سزا ہوگی میرے لئے۔'' بابو نے کہا۔ لٹو کو اس کی محبت کی شدت حیران کر گئی۔

''تو نے اس سلسلے میں کوئی پیش قدمی کی ہے؟'' کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد لٹو نے دریافت کیا۔

''ہاں! ایک راستہ دکھائی دیا ہے۔۔۔۔۔ یوں سمجھ کہ ایک قدم اٹھا لیا ہے۔'' بابو نے غیر واضح بات کر کے چپ اختیار کر لی جبکہ لٹو اس کے لب کھولنے کا منتظر اس کی صورت تکتا رہ گیا۔ ایک ایک کر کے جب کئی لحات آگے کی جانب سرکتے چلے گئے اور بابو نے پھر سے زبان کھولنے کی زحمت گوارہ نہ کی اور کسی انجانی سوچوں کے صحرا میں بھٹکنے لگا تو لٹو کا ضبط جواب دے گیا۔ اس دوران بیرا دو کپ بھاپ اڑاتی چائے ان کے درمیان میز پر رکھ کر چلا گیا۔

''او میرے بھائی! کیا تو مجھے اس لائق سمجھتا ہے کہ یہ بتا سکے کہ تو نے وہ کون سا قدم اٹھایا ہے کہ تجھے بیس لاکھ روپے ملنے کی امید پیدا ہو گئی ہے۔'' لٹو نے اس کی پرسوچ نگاہوں کے سامنے چٹکی بجا کر اسے حواسوں کی حقیقی دنیا میں لوٹ آنے پر مجبور کیا۔

''میرے ایک خیر خواہ نے مجھے ایک ایسی ہستی کے بارے میں بتایا ہے جو مجھے میری محبت دلانے کا وعدہ کر رہا ہے۔'' بابو نے ایک بار پھر گول مول بات کر کے لٹو کے ضبط کا امتحان لیا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں وہ عظیم ہستی کون ہے جو بنا کسی اپنی ذاتی غرض یا مفاد کے تجھے بیس لاکھ روپے دے کر حاتم طائی کی قبر پر لات مارنے جیسا عظیم کارنامہ انجام دے رہا ہے۔'' لٹو نے حیرت سے دریافت کیا۔

''میں نے یہ کب کہا ہے کہ وہ مجھے بیس لاکھ روپے دے رہا ہے؟'' بابو نے مسکرا کر کہا اور لٹو کے چہرے پر برستی حماقت سے لطف اندوز ہونے لگا۔

''پھر وہ تجھے تیری محبت کس طرح دلانے کا وعدہ کررہا ہے؟'' لٹو نے کہا۔

''کوشش تو میری اپنی ہوگی وہ تو مجھے صرف ایک راستہ دکھائے گا'' بابو نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن وہ ہستی کون ہے؟ اس کا کوئی نام، کوئی پہچان تو یقیناً ہوگی؟'' لٹو نے کہا اور ایک ہی سانس میں چائے سے بھرا کپ خالی کر کے میز پر رکھ دیا۔

''میرے خیر خواہ نے مجھے ''برگد والے بابا'' سے ملنے کا مشورہ دیا اور برگد والے بابا ہی وہ ہستی ہیں جو مجھے میری محبت دلانے میں میری مدد کریں گے۔'' بابو کے لبوں سے ادا ہونے والے ''برگد والے بابا'' کے الفاظ نے لٹو کو اس طرح بے حس و حرکت کر ڈالا جیسے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی روح نے اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔

''کیا؟ کیا تو نے برگد والے بابا کا ہی کہا ہے نا؟'' اس نے اپنی سماعتوں کا شک دور کرنے کے لئے بابو کے لبوں سے ادا ہونے والی ہستی کا نام دہرا کر تصدیق چاہی۔

''ہاں! میں نے برگد والے بابا ہی کا نام لیا ہے لیکن تیرے چہرے کی سرخی کیوں اڑ کر رہ گئی ہے؟''

''میرے چہرے کی تو صرف سرخی اڑی ہے جب تجھے برگد والے بابا کے بارے میں سچائی کا علم ہوگا تو تیرے ہوش اڑ جائیں گے۔'' لٹو نے کہا۔

''اس سے پہلے کہ تو کوئی حیرت انگیز بات کر کے میرے ہوش اڑا کر رکھ دے ایک بات میں اپنے پورے ہوش و حواس میں کہنا چاہتا ہوں کہ میں کل رات برگد والے بابا سے ملاقات بھی کر آیا ہوں۔'' بابو کی یہ بات سن کر جانے کیوں لمحے بھر کے لئے لٹو کا وجود کانپ کر رہ گیا اور نا معلوم سا خوف اس کی آنکھوں کی سیاہ پتلیوں میں لہرانے لگا۔

''تو تو میرے ہوش اڑانے والا تھا تیرے تو اپنے ہوش اڑ کر رہ گئے ہیں آخر بات کیا ہے؟'' بابو کو اس کی بدلتی حالت حیران سا کر گئی۔ لٹو کسی بے جان مجسمے کی مانند ساکت و جامد بیٹھا بدستور خوف اور غیر یقینی نگاہوں سے بابو کی صورت تکتا رہ گیا۔

''کیا مرگی کا حملہ ہوا ہے...... ابے منہ کھول کچھ پھوٹ تو سہی بات کیا ہے؟ کیوں برگد والے بابا کا نام سنتے ہی تجھے بخار چڑھ گیا ہے؟ تیری بولتی بند ہو کر رہ گئی ہے؟'' بابو کو غصے نے آن گھیرا۔

''تو اپنے محلے کے پیش امام اور ایک بے حد معتبر و محترم بزرگ ہستی الحاج سید غلام رسول شاہ قادری صاحب کے نام و شخصیت سے تو واقف ہے نا؟'' لٹو نے دریافت کیا۔ بابو نے اقرار میں گردن ہلا دی لیکن لٹو کا یہ سوال پوچھنا اس کی عقل سے باہر تھا۔

''میرا ایک مشورہ ہے...... بے حد مخلصانہ اور بالکل مفت، تو پہلی فرصت میں سید رسول شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے اپنی جان کی حفاظت کے لئے ایک تعویذ بنوا کر اپنے گلے میں پہن لے۔'' لٹو نے اپنے سر کو اس طرح جھٹکا جیسے کسی نادیدہ جانور کی گرفت سے اپنے سر کو آزاد کیا ہو۔

''دیکھ لٹو! اگر تجھے اپنے دانتوں سے محبت ہے اور تو نہیں چاہتا کہ تیرا ایک بھی دانت ٹوٹ کر تجھے داغ جدائی دے جائے تو انتہائی شرافت سے بتادے کہ بات کیا ہے...... ورنہ اس دو کلو وزنی ہاتھ کا ایک بھی مکا میں نے تیرے جبڑے پر رسید کردیا نا تو باقی کی تمام عمر تجھے نقلی بتیسی کے سہارے کاٹنی پڑجائے گی...... اور تجھے اتنا علم ضرور ہوگا کہ نقلی بتیسی والوں کی خوراک میں گوشت شامل نہیں ہوتا کیونکہ نقلی دانت گوشت چبانے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں...... گویا زندگی بھر پتلی کھچڑی کھانا مجبوری بن جائے گی۔'' بابو نے کچھ اس خوف ناک انداز سے مستقبل کی جھلک دکھائی کہ لٹو نے بے اختیار اپنے ہونٹوں پر اپنا ایک ہاتھ رکھ کر اپنے دانت چھپا لئے۔

''بات یہ ہے میرے یار کہ تجھے بدروحوں نے گھیر لیا ہے...... بری آتمائیں تیرے اطراف منڈلا رہی ہیں بلکہ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تیرے گرد ایک ایسا جال سا بن رہی ہیں جسے شیطانی جال کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔'' لٹو نے غیر واضح بات کہی۔

''کیا مطلب؟'' بابو چونکنا سا ہو گیا۔

''مطلب یہ کہ تیرے جس سچے خیر خواہ نے تجھے برگد والے بابا کا پتہ دیا ہے یا اس سے ملنے پر اصرار کیا ہے وہ تیرا سچا خیر خواہ تو کیا خیر خواہ ہی نہیں ہو سکتا ہے۔'' لٹو نے گول مول بات کر کے اس کے غصے کو ہوا دی۔

''لگتا ہے تجھے واقعی اپنے دانتوں سے پیار نہیں ہے۔'' بابو نے فولادی مکا تان کر دانت پیستے ہوئے کہا۔

''مم میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ برگد والے بابا کسی زندہ ہستی کا نام نہیں ہے اسے تو قتل...... میرا مطلب ہے مرے ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں شاید اتنے سال کہ تیرے میرے پیدا ہونے کا تصور بھی ہمارے ماں باپ کے ذہنوں میں کہیں نہیں ہوگا۔'' لٹو کی یہ اطلاع یا انکشاف بابو کے لئے حد درجہ حیرت کا باعث بنی وہ غیر یقینی سے لٹو کی صورت تکتا رہ گیا۔

''میں نہیں مانتا...... تو سنی سنائی بتا رہا ہے جبکہ میں اپنی آنکھوں دیکھی سچائی بیان کر رہا ہوں۔ میں نے کل رات اپنے مکمل ہوش وحواس میں برگد والے بابا سے ملاقات کی ہے اور میرے علاوہ وہاں ان کے اور بہت سے عقیدت مند پہلے سے موجود تھے۔'' بابو نے اپنے لہجے میں پختگی پیدا کی۔

''ہوسکتا ہے وہ عقیدت مند بھی بدروحیں یعنی بری آتمائیں ہوں؟'' لٹو اپنی روانی میں بے اختیار کہہ گیا۔ لیکن اس کے ان الفاظ نے بابو کو بری طرح چونکنے پر مجبور کردیا...... لمحے بھر کے لئے کئی باتیں اس کے دماغ کے تاریک گوشوں کو منور سا کرتی گزر گئیں۔

سب سے پہلے وہ بے شمار دیئے یاد آ گئے جو تیز ہوائیں چلنے کے باوجود بدستور روشن تھے یا جل رہے تھے اور جن کی لو یا شعلے اس طرح بے حس وحرکت کھڑے تھے جیسے وہ دیئے قطعی اصلی نہ ہوں لیکن اس کے باوجود ان دیوں سے پھوٹنے والی روشنی ناقابل یقین حد تک بے حد و دھیائی اور سورج کی روشنی سے مشابہ تھی اسی لئے تو اسے کافی دور سے ہی برگد کے درخت تلے بیٹھے بابا اور ان کے عقیدت مند صاف دکھائی دیئے۔

اور عقیدت مندوں کا کیا کہنا؟ جنہوں نے اس کے سلام کا جواب تک دینا گوارہ نہ فرمایا اور ان سب کے چہروں پر برستی وحشت او رآنکھوں میں بسی لہو رنگ سرخی انہیں عام انسانوں سے قطعی مختلف ظاہر کر رہی تھی...... ان کا مشینی انداز میں بیک وقت ایک ساتھ حرکت کرنا اور بیک وقت اکٹھے ایک جیسے انداز اور آواز سے رونا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟

اور سب سے بڑھ کر برگد والے بابا کا وجود تھا جو برف کی کسی ٹھوس سل کی مانند ٹھنڈا پڑا ہوا تھا جیسے بابا کے وجود میں زندگی کی معمولی سی حرارت بھی موجود نہیں ہو۔

اس نے اپنی زندگی میں کئی مردہ وجود چھو کر دیکھے تھے اور اس کے نانا جان بھی کہا کرتے تھے کہ۔

''انسانی جسم گوشت پوست کا ایسا مجموعہ ہے جس میں حرارت روح کے دم سے ہے جس دن یہ روح انسانی جسم سے کھینچ لی جاتی ہے اس دن گوشت پوست کا وجود بے حرارت و بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔''

اس کے والد کا بھی یہی کہنا تھا ٹھنڈے جسم مرے ہوئے انسانوں کے ہوتے ہیں۔ یہ روح ہی ہوتی ہے جو گوشت پوست کے بنے انسانوں اور دیگر تمام جانداروں کو متحرک کئے رکھتی ہے۔ بنا روح کے جسم حرکت کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں ان باتوں کی روشنی میں اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ بابا اور ان کے عقیدت مند زندہ وجود نہیں بلکہ محض روحیں ہیں؟ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان کے وجود کس طرح متحرک تھے؟ اگر وہ صرف روحیں تھیں تو بابا اور ان کے عقیدت مندوں کے جسم ٹھوس کیوں دکھائی دے رہے تھے؟ وہ دھویں کے مرغولوں کی شکل میں کیوں نہیں چکرا رہے تھے؟ اس کے نانا جان کا یہ کہنا تھا کہ روحیں دھویں کی مانند ہوتی ہیں جو پکڑ میں آتی ہے اور نا ہی جسمانی تختی کی مالک ہوتی ہیں۔ روحوں کے دھویں سے مشابہ وجود کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے اور ایک زندہ انسان ان کے وجود کے اندر سے با آسانی گزر کر اس پار ہو سکتا ہے نانا جان کی باتوں کی روشنی میں اس نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ برگد والے بابا اور ان کے عقیدت مند قطعاً روحیں نہیں تھیں یہ سب اس کی ہمت و بہادری کا امتحان تھیں جو بابا نے لیا تھا اور سچ بھی یہی تھا کیونکہ اس کے سچے خیر خواہ نے بھی یہی کہا تھا۔

''کیا سوچ رہا ہے؟'' لٹو نے ایک بار پھر چٹکی بجا کر اس کی سوچوں کے بت کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔

''یہی کہ تو مجھے برگد والے بابا سے بدظن کرنے کی اپنی سی ناکام کوشش مت کر تو اچھا ہے میں نے ناکام کوشش اس لئے کہی ہے کہ میں تیری باتوں میں آ کر قدم پیچھے ہٹانے والا نہیں...... تو تو جانتا ہی ہے کہ تیرا یہ یار اپنے ارادوں کا کس قدر پکا ہے۔'' بابو نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''کیا تو سچ مچ برگد والے بابا کی کہانی سے انجان ہے؟ اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا ہے؟'' لٹو کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔

''میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ روحوں کے جسم ٹھوس نہیں ہوا کرتے...... مرنے کے بعد انسان تمام دنیاوی تکالیف سے آزاد ہو جاتا ہے اسے دنیا میں ہونے والی کسی خوشی یا غم سے کوئی سروکار نہیں رہتا پھر بابا کے عقیدت مند اپنے مسائل کے لئے بابا کی خدمت میں کیوں حاضر ہوئے تھے جو خالصتاً زندہ انسانوں سے متعلق تھے؟'' بابو نے بھرپور لہجے میں دفاع کیا۔

''میں نے کہا نا کہ شیطان تجھ پر اپنا جال پھینک رہا ہے...... شیطان کی یہ صفت ہے کہ وہ کسی بھی انسان کی کمزوری کو پکڑ کر پھر اس پر اپنا جال پھینک کر اسے پھانسنے کی کوشش کرتا ہے اور تو تو وہ انسان ہے جو اپنی کمزوری کا لاؤڈ اسپیکر میں اعلان نشر کرتا پھر رہا ہے۔'' لٹو نے کہا۔

''تو کچھ بھی کہہ لے میں اپنے ارادے سے باز آنے والا نہیں، آگے قدم بڑھا لینے کے بعد پیچھے ہٹنا مجھے پسند نہیں بلکہ میری نظر میں یہ سراسر بزدلانہ فعل ہے۔'' بابو نے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تو ایک بار برگد والے بابا کے ماضی کے کارنامے کسی سے ضرور سن لے اس کی کہانی سے واقف ہونے کے بعد تجھے جو

قدم بھی اٹھانا ہوا اٹھا لینا یہ میرا وعدہ ہے کہ میں پھر تجھے روکنے کی کوشش نہیں کروں گا۔'' لٹو نے التجا کی۔

''کسی سے کیوں؟'' تو ہی سنا دے مجھے برگد والے بابا کی کہانی! میں یقین دلاتا ہوں کہ میں دوران کہانی کوئی سوال نہیں کروں گا اور نہایت صبر وسکون سے تمام کہانی سنوں گا۔'' بابو نے مسکرا کر کہا۔

''مجھے حیرت اس بات پر ہو رہی ہے کہ تو برگد والے بابا کی کہانی سے انجان کیسے ہے؟ ہمارے بعد پیدا ہونے والے بچوں کو بھی برگد والے بابا کی کہانی کا علم ہے اور تو اب تک اتنا لاعلم ہے؟'' لٹو کی حیرت کم ہو کے نہ دے رہی تھی۔

''تو کہانی سناتا ہے یا میں جاؤں؟'' بابو نے بیزاری کا مظاہرہ کیا۔

''برگد والے بابا کی کہانی ویسی ہی ایک کہانی ہے جیسی عموماً خیر وشر کی کہانیاں ہوتی ہیں۔ یعنی ایک ایسی کہانی جس میں ایک ہیرو ہوتا ہے جو ''خیر'' کی نمائندگی کرتا اور ''شر'' کی عکاسی کرنے کے لئے بطور خاص ایک شیطان صفت ولن رکھا جاتا ہے۔ ''برگد والے بابا'' کی کہانی میں ''شر'' کا کردار خود برگد والا بابا ہے جبکہ خیر ایک نیک جن کے روپ میں نظر آئے گا...... ویسے ایک بات ہے تمہارے برگد والے بابا کی کہانی صرف سنگین ہی نہیں بے حد رنگین بھی ہے تجھے سننے میں بہت مزہ آئے گا، یہ سب اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مجھے تو سن کر بہت لطف آیا تھا۔'' لٹو نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔

''تو سنی سنائی بیان کرنے والوں میں شمار ہوتا ہے اور میں آنکھوں دیکھی سچائی پر یقین کرنے کا عادی ہوں اور جو سچائی میں نے کل رات اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے وہ صرف یہ ہے کہ میں نے برگد والے بابا کے جیتے جاگتے وجود سے ملاقات کی ہے اور آج کی رات پھر ان سے ملنے کا ارادہ ہے اگر برگد والے بابا بقول تمہارے ایک بدروح...... یا ایک بری آتما ہیں تو یونہی سہی...... میرے پیش نظر صرف میرے مسئلے کا حل ہے اگر میرا یہ مسئلہ کوئی بدروح یا بری آتما حل کر سکتی ہے تو میں کسی بھی بری آتما کے حضور پیش ہونے کو تیار ہوں...... معصومہ کو پانے کے لئے اگر مجھے صدیوں پرانی قبر میں دفن کسی مردے کو بھی باہر نکالنا پڑ جائے تو میں قبر کشائی کر کے مردے کو باہر نکالنے سے پیچھے نہیں ہٹوں گا اور اس کے سینے میں بند اپنے مسئلے کا حل نوچ کر حاصل کر لوں گا لہٰذا تم شیطان بن کر میرے نیک کام میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی ناکام کوششیں مت کرو میں کسی بھی قیمت پر اب پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔'' بابو کے لہجے میں بسا عزم لٹو کو متاثر کر گیا۔

''میرا مقصد تجھے باز رکھنا ہرگز نہیں ہے میں بھی جو سنی سنائی بتا رہا ہوں ہمارے بزرگوں کی جوانی کے ایام میں وہ بھی ایک حقیقت رہی ہے جو آج ایک کہانی کی حیثیت اختیار کر گئی ہے تو کیا ہوا؟'' لٹو کی بات پر بابو نے بے زاری سے گہرا سانس خارج کیا اور کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ برگد والے بابا سے ملنے کا وقت ابھی بہت دور تھا وقت گزاری کے لئے لٹو کی بکواس جسے وہ برگد والے بابا کی کہانی سے تعبیر کر رہا تھا سننے میں کوئی ہرج نہ تھا ویسے بھی اسے دوسرا کوئی کام بھی نہ تھا اس لئے اس نے مزید دو کپ چائے اور نمکین بسکٹ کا آرڈر دے دیا۔

''سنا! میرے یار برگد والے بابا کی رنگین وسنگین کہانی...... ذرا میں بھی تو سنوں کہ میرا واسطہ کہیں کسی غلط آتما سے تو نہیں پڑ گیا ہے۔'' بابو کے لہجے میں بسا تمسخر اگرچہ لٹو کو بے حد ناگوار گزرا لیکن وہ صبر کا گھونٹ پی کر رہ گیا اور برگد والے بابا کی وہ کہانی بیان کرنے لگا جو اس نے اپنے دادا حضور اور اس کے دادا حضور نے اپنے بزرگوں سے سن کر بیان کی تھی۔

☆......☆......☆

لوگوں کا ایسا کہنا تھا کہ اس روئے زمین پر برگد والے بابا کے نام سے مشہور ہونے والا وہ انسان اگر شیطان نہیں تھا تو شیطان کا ایک خاص چیلا ضرور تھا۔

پہلے وہ ایک مسلمان تھا پھر خدا جانے کیا خناس دماغ میں آن کر سمایا کہ اس نے اپنا مذہب بدل کر بت پرستوں کا مذہب اختیار کر کے بت پرست بن کر رہ گیا۔

اس کے نیک و پارساماں باپ نے اس کا نام جانے کیا سوچ کر یا...... شاید یہ سوچ کر شرافت رکھا تھا کہ وہ اپنے نام کی طرح اپنی زندگی بھی شرافت کا منہ بولتا شاہکار بن کر بسر کرے لیکن اس کے نیک و معصوم والدین نے اس کی تعلیم و تربیت میں خدا جانے کہاں کوئی کسر چھوڑ دی تھی کہ ان کا اکلوتا بیٹا شرافت بجائے ''شرافت'' کی عملی تصویر بننے کے ''شر'' اور ''آفت'' کی تشریح بن کر ابھرنے لگا۔

خدا کے فضل و کرم سے اسلام ایک ایسا پاکیزہ مذہب ہے جو ہر سچے مسلمان کو برائی کے راستوں پر جانے سے نا صرف روکتا ہے بلکہ ان پر کچھ ایسی اخلاقی و شرعی پابندیاں عائد کرتا ہے جن کی حدود میں رہتے ہوئے کبھی کوئی سچا مسلمان برائیوں کی جانب قدم بڑھانا تو دور کی بات ان برائیوں کی جانب دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتا اور انہی حدود میں رہ کر اپنی تمام زندگی بہت صاف ستھری گزار کر آخرت میں جنت کا حق دار ٹھہرتا ہے۔

لیکن اچھے برے انسان ہر مذہب و قوم میں پائے جاتے ہیں انہی برے انسانوں میں شرافت بھی ایک ایسا کمزور ایمان مسلمان تھا جو اسلام کی عائد کردہ شرعی و اخلاقی پابندیوں میں رہتے ہوئے نا صرف عاجز آ چکا تھا بلکہ وہ زندگی بھر ان پابندیوں میں رہ کر اپنی جوانی کے خوب صورت ترین ایام کو یونہی بے کار گزار دینے کے حق میں نہ تھا اور اس کی باغیانہ سوچ کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ اس کی دوستی جن لوگوں سے تھی ان میں اکثریت ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور نہایت آزادانہ اور عیاشانہ زندگی بسر کر رہے تھے شراب و شباب سے لطف اندوز ہونا ہی گویا ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔

ایمان کمزور ہو تو شیطان کے راستے میں دوسری کسی رکاوٹ کی کوئی خاص اہمیت نہیں رہتی شرافت کے اندر کا مسلمان بھی کمزور اور باغی طبیعت کا مالک تھا اسی لئے شیطان کو اسے راہ راست سے ہٹانے کے لئے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی وہ غیر محسوس طور پر برائیوں کے دلدل کی جانب بڑھتا رہا اور اپنے ماں باپ کے علم میں لائے بغیر یا انہیں اپنی ظاہری شرافت کے دھوکے میں رکھ کر برائیوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

اس کے خیال سے برائی، اچھائی کی نسبت زیادہ پرکشش تھی۔

وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ'' کائنات کی ہر خوب صورت چیز خصوصاً عورت! جب مرد کے لئے ہی یہ سوچ کر تخلیق کی گئی ہے کہ مرد ان کو تسخیر کرے یا ان سے لطف اندوز ہوں تو پھر مرد پر حدود و قیود کی سختی کیوں؟ آخر وہ شراب کیوں نہیں پی سکتا؟ کسی حسین عورت کے حسن و شباب سے سیراب کیوں نہیں ہو سکتا؟ وہ جوا نہیں کھیل سکتا تھا، وہ جھوٹ نہیں بول سکتا تھا کسی حسین و جوان عورت کو نظر بھر کر دیکھ نہیں سکتا تھا؟ کیا ایک مرد کی زندگی ان چیزوں کے بغیر اچھی گزر سکتی ہے؟ ایسی بدمزہ زندگی بھی کوئی زندگی کہی جا سکتی ہے؟ زندگی تو اس کے دوست گزار رہے تھے ان کی زندگی کے دن رات ان کے اپنے تھے جو وہ کلی طور پر اپنی پسند سے بسر کر رہے...... ان کی نسبت شرافت کو اپنی زندگی ایک بدترین سزا محسوس ہوتی تھی ایک ایسی سزا جو

محض مسلمان ہونے کی پاداش میں اسے بھگتنی پڑ رہی تھی۔

وہ یہ سوچ کر اداس ہو جایا کرتا کہ ”اگر وہ مسلمان گھرانے یا مسلمان والدین کے ہاں پیدا ہونے کی بجائے کسی ہندو کے ہاں پیدا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا؟ اس عمر میں وہ بجائے روزے اور نمازوں میں الجھنے کے اپنی پسند کی زندگی جی رہا ہوتا۔

اس کے ہندو دوست ٹھیک ہی کہا کرتے تھے کہ ”بے چارے مسلمان مردوں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے صبح سے رات تک بس نظر نہ آنے والے خدا کو سجدے ہی کیے جاؤ...... نا شراب نا شباب۔“ ان کی یہی باتیں شرافت کی ذہنی رو کو بہکا کر رکھ دیتیں اور اس لمحے وہ خود کو دنیا کا سب سے ”بے چارا“ انسان محسوس کرنے لگتا جس کی زندگی ہر قسم کی ”تفریح“ سے قطعی خالی تھی۔

ایک دن اس کا ضبط اس قدر جواب دے گیا کہ دوستوں کی باتوں کے تیر برداشت نہ کر کے اس نے ایک دوست سے شراب کی بوتل چھین کر ایک ہی سانس میں ساری شراب غڑپ غڑپ کر کے پی گیا اور شراب کے نشے میں دھت لڑکھڑاتے ہوئے گھر میں داخل ہوا۔

اتفاق سے شرافت کا باپ اس وقت گھر پر نہیں تھا اور ماں ایک کمرے میں نماز ظہر کی ادائیگی میں مصروف تھی۔

اس کی ماں کے پاس محلے کی کچھ لڑکیاں قرآن پاک کا درس لینے کے لئے دوپہر کے ہی اوقات میں آیا کرتی تھیں۔ ان میں ایک سولہ برس کی لڑکی ایسی بھی تھی جو درس قرآن سے فارغ ہونے کے بعد اپنی استانی کی تنہائی کے خیال سے گھر کے کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹانے کے لئے شام تک ان کے گھر میں ہی رہا کرتی تھی۔

نشے میں دھت شرافت جب لڑکھڑاتے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اس لمحے وہ لڑکی اسی کے کمرے میں موجود اس کے کمرے کی صفائی ستھرائی میں مصروف تھی...... اس نے لمحے بھر کی تاخیر کے بغیر اسے دبوچ لیا اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کی عزت کی چادر کو بڑی بے رحمی وسفاکی سے تار تار کر ڈالا۔

ہوش اسے اس وقت آیا جب اس کی درندگی برداشت نہ کر کے لڑکی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی وہ بری طرح گھبرا گیا اور گھر سے فرار ہونے میں ہی اپنی عافیت جان کر بھاگ کھڑا ہوا۔

اس کے ایک دوست راجندر کمار نے اسے اپنے گھر میں پناہ دی اور زنا و قتل جیسے سنگین جرائم کا ارتکاب کرنے کے باوجود اس کی حوصلہ افزائی کی۔

”یہ ہوئی نا مردوں والی بات! تجھے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے میرے گرو دیو کے ہوتے ہوئے پولیس تیرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔“

اس کے دوست نے اس دیدہ دلیری پر اسے اتنی بار دل کھول کر داد پیش کی کہ اس کے دل سے گناہ کا احساس مٹ کر رہ گیا۔

پھر اس کے اسی دوست نے اسے اپنے شکتی شالی گرو شکتی رام سے ملوایا۔

شکتی رام کالے جادو کا ماہر تھا اس کے ساتھ اس کے گھر میں رہتے ہوئے اور کالا جادو کے حیرت انگیز کمالات دیکھ کر شرافت کے دل میں بھی کالے جادو سیکھنے کا شوق بیدار ہونے لگا۔

ان دنوں ہندو مسلمان سب مل کر رہ رہے تھے ہاں البتہ اتنا ضرور تھا کہ بعض علاقوں میں مسلمان اکثریت سے آباد تھے اور بعض جگہوں پر ہندوؤں کی آبادی تھی جہاں شرافت نے زنا وقتل جیسا سنگین جرم کر کے اپنے ماں باپ اور پولیس کے ڈر سے پناہ حاصل کی تھی وہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی اس لئے اس کے ماں باپ یا پولیس کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ شرافت کو کسی ہندو نے اپنے گھر میں پناہ دی ہوگی۔ یا اس نے چھپنے کے لئے کسی ہندو کے گھر کا انتخاب کیا ہوگا۔

اور شرافت کے ماں باپ یا پولیس ایسا سوچنے یا سمجھنے پر اس لئے حق بہ جانب تھے کہ اول شرافت نے اپنے ہندو دوستوں کے بارے میں کبھی کسی کو نہیں بتایا تھا اور دوسرے یہ کہ جس علاقے میں شرافت نے پناہ حاصل کی تھی وہاں ہندوؤں کے بڑے بڑے مہان پنڈت اور شکتی شالی تانترکوں کی رہائش تھی جو کسی بھی مسلمان کے لئے اپنے دل میں اس قدر نفرت رکھتے تھے کہ اپنے دل میں اور گھر میں کبھی کسی مسلمان کو جگہ نہیں دے سکتے تھے یہی وجہ تھی کہ شرافت بیک وقت دو جرم کرنے کے باوجود معمولی سی سزا سے بھی محفوظ رہا۔

''یہ سب کالی ماں کی کرپا ہے جو کالی ماں کی شرن میں آ جائے دنیا کی کوئی طاقت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔''

شکتی رام کی یہ باتیں اس کے دل و دماغ کو بدلنے کا سبب بنیں۔ پھر جس طرح وہ غیر محسوس انداز سے ہندو دوستوں کی بری صحبت کا شکار ہو کر گناہ کے دلدل میں اترتا چلا گیا بالکل اسی طرح وہ شکتی رام کی باتوں کے جال میں الجھ کر کالی ماتا کی عظمت کا بھی قائل ہوتا چلا گیا۔

''کالی شکتیوں کی ملکہ ہے کالی ماتا، ایک ناقابل شکست طاقت کا نام ہے کالی ماں! جسے کالی ماں کا آشیرباد مل جائے وہ دنیا کا سب سے شکتی شالی انسان بن جاتا ہے...... وہ جو چاہے بہت آسانی سے حاصل کر لیتا ہے۔''

شکتی رام ہر بار کالی ماتا کی شکتیوں کا ذکر کچھ اس قدر دل پذیر انداز میں کیا کرتا تھا کہ شرافت کا دل کالی ماتا کی کالی شکتیوں یا جنتر منتر کو سیکھنے کا پختہ ارادہ کر لیتا اور ایک دن شکتی رام کے ہی ساتھ وہ اپنا شہر چھوڑ کر کہیں غائب ہو گیا۔

شرافت کے ماں باپ اور پولیس ہفتوں شرافت کو کھوجتے پھرتے رہے لیکن وہ تو ایسے غائب ہو چکا تھا جیسے آسمان کھا گیا ہو یا زمین نگل چکی ہو پولیس کو تو کیا اس کے ماں باپ کو بھی اس کی کوئی خیر خبر نہ مل سکی۔

دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے رہے اس کے ماں باپ اس کے آنے کی راہ تکتے تکتے بالآخر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

پندرہ طویل برس گزر جانے کے بعد جب وہ اپنے چھوٹے سے شہر میں لوٹ کر آیا تو یہ دیکھ کر اسے بے حد خوشی ہوئی کہ اس کا چھوٹا سا، کم آبادی والا شہر پھیل کر بہت بڑا ہو گیا تھا اور آبادی میں بھی خاطر خواہ اضافہ دکھائی دے رہا تھا۔

شرافت جو کالی ماتا کا بھگت بننے کے بعد کٹر ہندو ہو چکا تھا اس نے صرف اپنا نام ہی نہیں اپنا حلیہ بھی مکمل طور پر تبدیل کر لیا تھا اسے یقین تھا کہ مسلمان والدین کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے کوئی اسے شناخت نہیں کر پائے گا وہ اپنے مسلمان ہونے کا ہر نقش، ہر شناخت مٹا چکا تھا اب وہ شرافت نہیں بدھا رام تھا۔

بڑھی ہوئی داڑھی، لمبے بال، نارنجی چوغہ، پیشانی پر سفید لکیریں، گلے میں انواع واقسام کی مالائیں، ایک ہاتھ کی کلائی میں بے شمار موتیوں

والی رنگ برنگی تسبیحیں لپٹی ہوئیں دوسرے ہاتھ میں ناگ کی شکل اور جسامت سے مشابہہ ساگوان کی لکڑی سے بنا عصا اور زبان پر کسی نامعلوم زبان کے مقدس یا جادوئی کلمات کا ورد۔

اسے یقین تھا کہ اس کے مسلمان ماں باپ اب تک حیات نہ ہوں گے اور یقین کی وجہ اس کی پراسرار گمشدگی کے سوا دوسری کوئی اور نہ تھی کیونکہ اکلوتا ہونے کی وجہ سے وہ اپنے ماں باپ کی زندگی تھا جب زندگی ہی نہ رہی تو وہ کیسے زیادہ عرصے تک زندہ رہ سکتے تھے یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے ماں باپ کے متعلق جاننے کی ذراسی بھی کوشش نہ کی اور وقتی طور پر ایک برگد کے سائے تلے بیٹھ کر یا سکونت اختیار کر کے اپنے اطراف بسنے والے لوگوں کا جائزہ لینے لگا وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اب اس علاقے میں زیادہ آبادی کس مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی تھی؟ پندرہ برس قبل اس علاقے میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی تو کیا آج بھی یہاں مسلمانوں کا ہی زور ہے؟

اور سب سے اہم بات اس کے مسلمان والدین کا وہ مکان تھا جوان کی موت کے بعد یقیناً اب اسی کی ملکیت تھا لیکن بے شمار نئے مکانات کی تعمیر کے باعث اسے فی الحال دو کمروں پر مشتمل چھوٹا سا مکان کہیں دکھائی نہ دے رہا تھا۔

پہلے پہل تو علاقے کے لوگوں نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی اور اسے کوئی فقیر کوئی ملنگ قسم کی ہستی جان کر اس کے وجود کو نظرانداز کئے گزرتے رہے لیکن ایک دن ایک ایسا ناقابل یقین اور انوکھا واقعہ رونما ہوا کہ جس نے اس کی ہستی کو ایک دم سے وہ اہمیت عطا کر دی جس کی خواہش لئے وہ یہاں آیا تھا۔

''بچاؤ بچاؤ......کوئی مجھے بچائے مجھے سانپ نے کاٹ لیا ہے۔'' ایک نوجوان بہت زور سے یہ الفاظ ادا کئے چیختا چلاتا ہوا بھاگے چلا آ رہا تھا لوگ اس کی چیخ و پکار سن کر اس کی مدد کے لئے اس کی جانب دوڑنے لگے۔

برگد کے درخت سے کچھ فاصلے پر نوجوان لڑکھڑا کر گر پڑا اور شاخ بریدہ کی مانند لرزتے ہوئے وہ ایک ایک کے آگے ہاتھ جوڑ کر اپنی زندگی کی بھیک طلب کرنے لگا۔

''میں مرنا نہیں چاہتا......بھگوان کے لئے مجھے بچالو'' وہ ماہی بے آب کی مانند تڑپ رہا تھا اس کے اطراف لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا لیکن اس ہجوم میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو سانپ کے کاٹے کا کوئی تریاق پیش کرتا سب بے بسی کی تصویر بنے نوجوان کو تڑپتے سسکتے ہوئے موت کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھتے رہے۔

''ہٹو......ہٹ جاؤ......برگد والے بابا آ رہے ہیں۔'' ایک مردانہ آواز ابھری اور اگلے ہی لمحے لوگوں کے ہجوم کو چیرتے ہوئے وہ نوجوان کے تڑپتے ہوئے وجود کی جانب بڑھا۔

''مجھے بچالو بابا......میں مرنا نہیں چاہتا۔ بب بھگوان کے لئے مجھے......'' اس سے پہلے کہ نوجوان اپنی بات پوری کر پاتا بدھا رام نے جانے کیا پڑھ کر اس پر پھونکا کہ نا صرف نوجوان کا تڑپنا سسکنا موقوف ہو کر رہ گیا بلکہ وہ اس قدر پرسکون دکھائی دینے لگا جیسے زندگی میں کبھی اس پر کوئی تکلیف نہ آئی ہو......ابھی لوگ نوجوان کے سکون کے متعلق کوئی رائے بھی قائم نہ کر پائے تھے کہ ایک اور ناقابل یقین اور حیرت انگیز نظارے نے

انہیں پتھر کے بے جان مجسموں کی مانند قطعی بے حس وحرکت کر ڈالا۔

انہوں نے اپنی آنکھوں اور اپنے تمام تر ہوش وحواس کے ساتھ یہ منظر دیکھا کہ ہجوم کے قدموں کے درمیان سے جگہ بناتا ہوا ایک کالے رنگ کا سانپ نوجوان کی جانب بڑھا اور نوجوان کی متاثرہ ٹانگ پر اپنا پھن مار کر اس کی ٹانگ سے اپنا تمام زہر چوس لیا اور زہر چوسنے کے بعد اس طرح اس کے سامنے کھڑا ہو گیا جیسے اپنی غلطی کی سزا پانے کا منتظر ہو اور وہ سزا اس ناگ کے لئے بابا ہی تجویز کرے گا یہ بات ایسی نہ تھی جسے آسانی سے نظرانداز کیا جاتا اسی وجہ سے ہجوم میں شامل ہر شخص کا دل انجانے، بابا کے لئے عقیدت واحترام کے جذبے سے سرشار ہوتا رہا۔

''آج میں تجھے معاف کرتا ہوں آئندہ ایسی کوئی حرکت دوبارہ کرنے کی گستاخی کی تو تجھے جلا کر بھسم کر ڈالوں گا...... جا چلا جا یہاں سے۔'' بابا نے سانپ کو مخاطب کر کے اس قدر قہر وغضب بھرے لہجے میں کہا کہ سانپ زمین پر بیٹھتے ہی رینگتے ہوئے جس طرح وارد ہوا تھا اسی طرح لوٹ گیا۔

''آپ مہان ہیں بابا...... آپ بھگوان کا اوتار ہیں۔'' نوجوان نئی زندگی ملتے ہی بابا کے قدموں پر اپنا ماتھا ٹیک کر نہایت عقیدت واحترام کے جذبات بھرے لہجے میں بولا۔

بابا نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے قدم بہ قدم چلتے ہوئے اپنے ٹھکانے یعنی برگد کے درخت تلے جا کر بیٹھ گیا۔

اس واقعے کے بعد جہاں لوگوں کے دل ونگاہوں میں اس کے لئے عقیدت واحترام در آیا وہیں لوگ اسے اہمیت اور توجہ بھی دینے لگے۔

اور ایک دن جب اس نے ایک غریب ماں باپ کے اکلوتے بیٹے کو اپنے جنتر منتر یا کرامات سے اس لمحے نئی زندگی سے آشنا کیا جب شہر کے اکثر نامور ڈاکٹروں نے مایوس ہو کر اپنا علاج بند کر دیا تھا تو اس دوسرے حیرت انگیز واقعے نے راتوں رات اس کی شہرت کا ڈنکا بجا کر رکھ دیا۔

اور جب مہینوں سے بیمار اور موت کے خار دار میں الجھے ہوئے لوگ اس کے جادو یا جنتر منتر سے بستر سے اٹھ کر چلنے پھرنے لگے اور ان کے جسموں سے بیماریوں کا نام ونشان تک مٹ کر رہ گیا تو اس کی شہرت کو مزید چار چاند لگ گئے اور صحت حاصل ہونے والے لوگوں کی زبان سے اس کی شہرت دور دور تک پھیل کر رہ گئی۔

وہ شرافت سے بدھارام اور بدھارام ''برگد والے بابا'' کی شخصیت میں ڈھل کر رہ گیا اور یہی نام اس کی شناخت بن کر ابھرا۔

''لوگوں کو تو تو نے بے وقوف بنا لیا مجھ سے اپنی اصلیت کیسے چھپائے گا۔'' ایک رات وہ اپنے کالے جادو میں مصروف تھا کہ ایک مترنم سی نسوانی آواز نے اسے بری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا۔

''کون؟ کون ہے تو؟ سامنے آ کر بات کر!'' بابا نے اپنے اطراف میں نگاہیں دوڑائیں لیکن کہیں بھی آواز کے وجود کو نہ پا کر اس نے بے حد غصے سے کہا۔

اور یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اندھیرے کا سینہ چیرتا ہوا وجود اس کے سامنے آن کر براجمان ہو گیا وہ کسی انسان کا نسوانی پیکر نہیں بلکہ ایک جانور کا وجود تھا...... جی ہاں وہ وجود ایک ایسی کالی بلی کا تھا جو اپنی ہری ہری آنکھوں سے اسے ایسی غضب ناک نگاہوں سے گھور

رہی تھی جیسے کسی بھی لمحے اس پر جھپٹ پڑے گی اور اس کے پاپی شریر کو بری طرح چیر پھاڑ کر رکھ دے گی۔

''تجھے شرافت کہوں یا بدھا رام؟ یا پھر برگد والے بابا؟ تو کوئی بھی چولا پہن لے مجھ سے اپنی اصلیت چھپا نہیں سکتا اور تیری اصلیت یہ ہے کہ تو نے دولت اور شراب وشباب کے حصول کے لئے شکتی رام سے کالے جادو سیکھے ہیں اور یہاں تو صرف اس لئے لوٹ کر آیا ہے کہ اس علاقے میں بسنے والے سادہ طبیعت ہندو مسلمانوں کو بے وقوف بنا کر اپنی شیطانی خواہشات کی تکمیل کر سکے..... کیوں ہے نا یہی بات؟'' کالی بلی کے لبوں سے انسانی آواز میں اپنے ماضی کے بارے میں اور مستقبل کے ارادوں کے متعلق سن کر اس کے لبوں پر شیطانی تبسم بکھر کر رہ گیا۔

''میرے بارے میں تو تو نے بہت کچھ بتا دیا جو شاید سچ بھی ہو سکتا ہے لیکن تو نے اپنا تعارف نہیں کروایا؟'' برگد والے بابا نے بلی کی نگاہوں میں اپنی نگاہیں پیوست کر کے ایک رعب سے دریافت کیا۔

''تو کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ میرے بارے میں اتنا کیسے جانتی ہے؟ اور یہ کہ مجھ سے کیا چاہتی ہے؟'' بابا نے اپنی الجھن بیان کی۔

''کالے جادو کا بادشاہ ہے نا تو؟ اپنے علم کو کام میں لا کر میری کھوج کر لے میں کون ہوں؟ اور تیرے متعلق اتنا کچھ کیسے جانتی ہوں؟ میں یہاں صرف تجھے خبردار کرنے آئی ہوں کہ اگر تو نے کسی شریف گھرانے کی ناری کی جانب میلی نگاہ سے دیکھا..... یا..... کسی کنواری کنیا کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' بلی کے لہجے کی غضب ناکی لمحے بھر کے لئے اسے ہراساں کر گئی لیکن اگلے ہی لمحے وہ خوش دلی سے قہقہہ اگل کر رہ گیا۔

''گویا تو یہاں بسنے والی شریف اور کنواری کنیاؤں کی عزت کی محافظ بن کر آئی ہے..... جب تو نے مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دی تو میں اسی وقت یہ بات جان گیا کہ تو اس بات سے یقیناً انجان ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے جان سے نہیں مار سکتی میں نے اپنے شریر پر ایک ایسا منتر پھونک رکھا ہے کہ موت میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی اور صدیوں تک جینے اور جوان رہنے کا یہ منتر کالی ماتا ہزاروں میں سے اپنے کسی ایک سچے بھگت کو ہی دان کرتی ہے اور یہ میری خوش نصیبی ہے کہ اس نے یہ اعزاز مجھے بخشا..... اور صدیوں تک جینے کے لئے شریف گھرانوں کی کنواری لڑکیوں کی عزت سے کھیلنا میری مجبوری ہے اور تو تو کیا دنیا کی کوئی طاقت مجھے میری مجبوری سے باز نہیں رکھ سکتی.....''

بابا نے شیطانی مسکراہٹ سجا کر اپنی لمبی سی کالی داڑھی پر خباثت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا لیکن اسے اپنی خباثت دکھانے کا زیادہ دیر تک موقعہ نہ مل سکا بے اختیار اس کے لبوں سے ایک دلخراش چیخ آزاد ہو کر رہ گئی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی حفاظت کے لئے اپنے چہرے کے سامنے کر لئے تاکہ کالی بلی کے اچانک حملے سے خود کو محفوظ کر سکے جو قطعی غیر متوقع طور پر بندوق سے نکلی گولی کی مانند اس پر حملہ آور ہو چکی تھی اگر اس نے بروقت اپنے ہاتھ بلند نہ کر لئے ہوتے تو خونخوار درندگی سے حملہ آور ہونے والی وہ بلی اس کی آنکھیں نوچ چکی ہوتی۔ وہ بری طرح ہراساں ہو کر رہ گیا اور اپنے سر کے اوپر سے ہوا کے بگولے کی مانند گزر جانے والی کالی بلی کو خوف زدہ نگاہوں سے دیکھ کر رہ گیا..... دیکھا ہی تھا کہ بلی کے لبوں سے خارج ہونے والی بھیانک ترین غراہٹ نے اس کا دل دہلا کر رکھ دیا۔

کالی بلی نے خوف ناک ترین غراہٹ خارج کی اور کھڑے ہی کھڑے اپنی جگہ سے از خود غائب ہو کر رہ گئی۔

برگدوالے بابا نے کالی بالی کے غائب ہوتے ہی سکون کا سانس خارج کیا اور اپنے حواس بحال کرتے ہی کالی بلی کے متعلق نہایت سنجیدگی سے سوچنے لگا بس ایک یہی سوال اس کے دماغ کے خالی ایوانوں میں چکرا کرا سے پاگل کیئے دے رہا تھا۔ ''آخر یہ کالی بلی کون تھی؟ کالی بلی کا انسانی آواز میں بات کرنا اور اس کے ماضی کے بارے میں بتانے سے یہ تو ثابت ہو چکا کہ وہ بلی کوئی عام سی بے ضرر بلی نہیں تھی اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر بلی کے روپ میں بھگوان کی کون سی ایسی پوشیدہ مخلوق تھی جو اس کے صدیوں تک زندہ اور جوان رہنے کے عمل میں روڑے اٹکانے کے لئے وارد ہوئی تھی؟''

اس نے فوراً سے بھی پہلے ایک جاپ کیا اور اپنے گرو دیو شکتی رام کی آتما کو طلب کیا۔

''تو نے زندگی میں بھی مجھے پریشان کر رکھا تھا اور مرنے کے بعد میری آتما کو بھی چین سے رہنے نہیں دیتا...... بتا کیا مشکل آن پڑی ہے؟ کیوں مجھے بلایا ہے؟'' اس کے گرو دیو شکتی رام کی آتما نے بے حد غصے کا اظہار کیا۔

''ایک کالی بلی میرے عمل میں رکاوٹ بننے کے لئے بھگوان جانے کہاں سے آن وارد ہوئی ہے؟ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ بلی کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ اور کتنی شکتی شالی ہے؟''

برگدوالے بابا نے فکرمندی سے اپنے گرو دیو کی روح سے دریافت کیا حقیقت یہ ہے کہ کالی مائی کا شکتی شالی بھگت ہونے کے باوجود وہ اس کالی بلی سے کچھ ڈر سا گیا تھا۔

''تجھے ڈرنے یا خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں...... وہ بلی کتنی ہی شکتی شالی کیوں نہ ہو کالی مائی کے کسی بھگت کا کچھ بگاڑ نہیں پائے گی...... کالی مائی زمین پر بسنے والی ہر اس طاقت سے اپنے بھگتوں کی خود حفاظت فرماتی ہے جو اس کے بھگتوں کو کسی بھی قسم کا نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں یا ان کے کسی بھی عمل میں بے جا دخل اندازی فرماتے ہیں۔'' گرو دیو کی آتما نے اسے اطمینان دلانے کی ناکام کوشش کی ناکام اس لئے کہ گرو دیو کے تسلی آمیز الفاظ بھی اس کے چہرے پر چھائے خوف کو دور نہ کر سکے۔

''لیکن میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ وہ بلی کون ہے؟ اور میرے ماضی کے بارے میں وہ اور کیا جانتی ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ سولہ سترہ سال پہلے کیئے گئے گناہ کی مجھے اب سزا بھگتنی پڑ جائے۔'' بابا ایک ڈر سے بولا۔

''میں ابھی اس کالی بلی کے بارے میں پتہ کر کے آتا ہوں۔'' گرو دیو شکتی رام کی آتما نے کہا اور غائب ہو گئی۔

اور پھر گرو دیو شکتی رام کی آتما نے کئی لمحات کے صبر آزما انتظار کے بعد وارد ہو کر بتایا۔

''وہ کالی بلی دراصل ایک جن زادی ہے جو کالی بلی کے روپ میں ایک برسوں سے بند پڑے مکان میں سکونت اختیار کیئے ہوئے ہے...... علاقے میں رہنے والا کوئی بھی فرد اس کالی بلی کی اصلیت سے آگاہ نہیں ہے تاہم ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والے اس کالی بلی کو دیوی کا روپ اور مسلمان اسے خدا کی کوئی نیک مخلوق خیال کرتے ہیں اور ایسا وہ لوگ اس لئے کرتے ہیں کہ اس کالی بلی نے کئی موقعوں پر کچھ حیرت انگیز کمالات دکھا کر اس علاقے میں بسنے والوں کو مشکلات سے باہر نکالا ہے۔'' گرو دیو کی بات سن کر وہ تھوڑا سا متفکر دکھائی دینے لگا۔

''تو کیا میں صدیوں تک زندہ اور جوان رہنے کا جاپ کبھی مکمل نہیں کر پاؤں گا؟'' بابا نے اپنی الجھن بیان کی۔

''اس درخت کے تلے بیٹھ کر اپنا جاپ مکمل کرنا تو واقعی تیرے لئے خطرناک ہے اگر تو اس علاقے میں کوئی ایسا مکان حاصل کر لے جس میں بری آتماؤں کا بسیرا ہو تو تیری مشکل حل ہو سکتی ہے۔'' گرو دیو نے کہا۔

''اس سے کیا ہو گا؟'' اس نے حیرت سے دریافت کیا۔

''اگر ایسا کوئی مکان تجھے مل جاتا ہے جو برسوں سے بند پڑا ہو اور جہاں بری آتماؤں نے بسیرا ڈال رکھا ہو تو پہلی فرصت میں اس مکان میں رہائش اختیار کر کے اس میں بسیرا کرنے والی آتماؤں کو اپنے وش میں کر لینا اور ان تمام آتماؤں کو اپنی حفاظت پر مامور کر کے تو اپنا صدیوں تک زندہ اور جوان رہنے کا جاپ مکمل کرتے رہنا...... تیری غلام اور محافظ آتمائیں اس کالی بلی کو تو کیا کسی بھی طاقت کو تیرے قریب آنے نہیں دیں گی...... لیکن صرف ایک بار تو اپنے عمل میں کامیاب ہو گیا تو پھر ایک تو کیا ہزاروں شکتی شالی کالی بلیاں آن وارد ہوں کوئی تیرا کچھ بگاڑ نہیں پائے گی۔'' گرو دیو شکتی رام نے کہا اور غائب ہو گیا۔

اس نے دوسرے ہی دن سے ایک ایسے مکان کی تلاش شروع کر دی جس میں بری آتماؤں نے بسیرا ڈال رکھا ہو اور ساتھ ساتھ وہ اپنے جادو ٹونے سے لوگوں کو بے وقوف بنانے کا کام بھی انجام دیتا رہا۔

لوگ دور دور سے اس کے پاس آنے لگے تھے اس کے عقیدت مندوں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ اپنی زندگی کے تحفظ کے علاوہ کچھ خفیہ عملیات کرنے کے لئے بھی ایک مکان کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ مکانات تو بہت سے خالی اور بند پڑے تھے لیکن جیسے مکان کی اسے ضرورت تھی ویسا مکان مل کے نہیں دے رہا تھا۔

اور پھر کئی دنوں کی خواری کے بعد اسے اپنے مطلب کا ایک مکان دکھائی دیا۔

وہ ایک ایسا مکان تھا جو گزشتہ کئی برسوں سے نا صرف بند پڑا تھا بلکہ قطعی غیر آباد اور ویران پڑا تھا اس مکان کا کوئی مالک یا دعویدار بھی نہ تھا۔ عموماً خالی پلاٹوں یا مکانوں پر کوئی نہ کوئی قبضہ گروپ ضرور آنکھ لگائے بیٹھا ہوتا ہے لیکن اس خالی مکان پر کوئی قبضہ گروپ بھی قبضہ کرنے کے حق میں نہ تھا اور اس کی سب سے اہم وجہ یہ بتائی جاتی تھی کہ۔

''اس مکان میں پہلے ہی سے آتمائیں آباد ہیں اور وہ آتمائیں زندہ انسانوں کو لمحے بھر کے لئے بھی اس مکان میں ٹکنے نہیں دیتی ہیں۔''

رات تو رات ہوتی ہے کوئی دن کے اجالے میں بھی اس خالی مکان کے قریب سے گزرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا تھا اور اس مکان کے قرب و جوار سے گزرتے ہوئے ڈرتا یا خوف کھاتا تھا۔

مسلمانوں کا یہ کہنا تھا کہ اس خالی مکان میں جنات بسیرا کئے ہوئے تھے جو دن رات اپنی شرارتوں کے باعث زندہ انسانوں کو ہراساں کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتے تھے جبکہ ہندوؤں کا یہ ماننا تھا کہ اس مکان میں بری آتماؤں کا بسیرا تھا جو رات ہوتے ہی اپنی کارستانیوں کا آغاز کر دیا کرتیں۔

دن کا اجالا اگر زندہ انسانوں کی نقل وحرکت کی پہچان ہے تو رات کی تاریکی ارواح خبیثہ کے لئے آزادانہ گشت کی علامت ہے۔

علاقے کے اکثر رہائشیوں نے اس خالی مکان کے اندر سے بڑی عجیب وغریب اور دل دہلا کر رکھ دینے والی دہشت ناک آوازیں بلند ہوتی سنی تھیں۔ کئی لوگوں نے اپنے مکمل ہوش وحواس کے ساتھ اس خالی مکان کے بند اور برسوں سے مقفل دروازے سے انسانوں کے روپ میں مکان کے اندر بسنے والے آسیب یا بری آتماؤں کو مکان سے باہر آتے یا اندر جاتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

جب برگد والے بابا نے اس خالی مکان کی دہشت انگیزیوں کی عجیب وغریب کہانیاں سنیں تو اس کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ نے بسیرا کرلیا اور اس کے دل نے کہا۔ ''یہی وہ مکان ہے جس کی اسے تلاش تھی۔''

''میں اس مکان کو آباد کروں گا۔'' بابا کے ان الفاظ نے اس کے عقیدت مندوں یا بھگتوں کو پریشان سا کر کے رکھ دیا۔

''بابا! اس مکان میں بری آتماؤں کا بسیرا ہے اور ہم آپ کو کسی بری آتما کا شکار بنتے نہیں دیکھ سکتے۔'' بابا کے ہندو اور مسلمان عقیدت مندوں نے انہیں ہر ممکن طریقے سے اس آسیبی مکان میں رہائش اختیار کرنے سے روکنے کی اپنی سی ہر ممکن کوشش کر ڈالی لیکن وہ بابا کو اس کے ارادے سے باز رکھنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ ہندو لوگ بابا کو ہندو سمجھتے تھے اور بابا کے مسلمان عقیدت مندوں کا یہ کہنا تھا کہ بابا مسلمان ہیں اس میں لوگوں کی سمجھ کا کوئی قصور نہ تھا بابا اپنے ہر عقیدت مند سے اسی کے ہم زبان وہم مذہب بن کر بات کرتے تھے تاہم بابا کے عملیات کی زبان مسلمان وہندو دونوں کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ خدا جانے وہ کون سی ایسی زبان میں عمل پڑھا کرتا تھا جو نہ مسلمانوں کی سمجھ میں آتی اور نہ جس سے ہندو واقف تھے۔ اس نے مسلمان عقیدت مندوں سے ملاقات کے دن واوقات ہندو عقیدت مندوں سے مختلف رکھے ہوئے تھے۔

''باباجی! آپ اس منحوس مکان میں رہنے کا خیال اپنے دل سے نکال دیجئے...... کہتے ہیں کہ اس منحوس مکان میں کسی عورت کے ساتھ یقیناً کوئی افسوسناک زیادتی کی گئی ہوگی جبھی اس مکان کے اندر سے کسی عورت کی دلخراش چیخوں اور کلیجہ پھاڑ کر رکھ دینے والی سسکیوں و آہوں کی ایسی آوازیں سنائی دیتی ہیں کہ خوف سے ہمیں اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوتا ہے۔'' ایک بھگت کی یہ بات سن کر بابا کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔ ایسی بپھری ہوئی غضب ناک روحیں تو اس کی بہترین محافظ ثابت ہوسکتی تھیں۔

''بابا! آپ ہمارے بھگوان ہیں...... آپ ہماری پریشانیاں، بیماریاں اور دکھ درد کرنے والے بھگوان کے اوتار ہیں اگر آپ کو کچھ ہوگیا تو ہمارا کیا ہوگا؟ ہم کہاں جائیں گے؟ ہم اپنی جانوں پر یہ ظلم نہیں توڑ سکتے۔'' ایک اور بھگت نے روتے ہوئے کہا اور بابا کے قدموں پر اپنا ماتھا ٹیک دیا۔

''ہم آپ کو اس منحوس مکان سے کئی گنا بڑا اس سے بہت اچھا دوسرا مکان خرید کر دیں گے بس آپ اس منحوس مکان میں رہنے کی اپنی ضد ختم کردیں۔'' ایک بھگت نے التجا کی۔

اس رات برگد والے بابا نے پھر وہی جاپ دہرا کر اپنے مہان گرو شکتی رام کی آتما کو حاضر ہونے پر مجبور کیا اور اس سے خالی مکان میں بسیرا کرنے والی آتما کے بارے میں دریافت کیا۔

''بدھارام! میرے خیال سے تیرے لئے اس مکان میں رہنا بہتر ہوگا۔'' شکتی رام کی آتما نے اس کے لبوں سے مکان سے متعلق تمام دہشت انگیز کہانیاں سن کر اپنی رائے پیش کی۔

''وہ کیوں گرودیو؟'' اس نے سوال کیا۔

''وہ اس لئے بالک! کہ اس مکان میں رہنے والی آتما بہت ہی شکتی شالی ہے اگر تو نے اس آتما کو اپنے وش میں کر لیا تو مان لو کہ تو نے اپنی طاقت دگنی کر ڈالی...... پر یہ بھی سچ ہے کہ وہ شکتی شالی آتما آسانی سے تیرے قابو میں آنے والی نہیں...... پرنتو تجھے اس پر ہر حال میں قابو پانا ہے...... کیسے بھی ممکن ہو اسے اپنے وش میں کرنا ہے...... اس آتما کو وش میں کرنے کے بعد ہی تو اس کالی بلی اور اس جیسی ہر شکتی کا آسانی مقابلہ کر پائے گا...... بلکہ تجھے کالی بلی یا کسی بھی اور شکتی کے سامنے خود سے آنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئے گی۔'' شکتی رام کی آتما نے کہا۔

''میں اس مکان میں بسیرا کرنے والی اس شکتی شالی آتما کو اپنے وش میں کرنے کی اپنی سی ہر ممکن کوشش کروں گا...... لیکن میں صرف یہ سوچ کر ڈرتا ہوں کہ ایسی ہی ایک شکتی شالی آتما کو اپنے وش میں کرنے کے چکر میں آپ بھی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور اب ایک بھٹکی ہوئی آتما بن کر رہ گئے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ میں بھی اپنے زندہ شریر سے ہاتھ دھو بیٹھوں اور ایک آتما بن کر دنیا کے انت تک اس دھرتی پر بھٹکتا پھروں؟'' اس نے اپنے دل میں بسے ڈر کو زبان سے ادا کیا۔ اس کی بات سن کر شکتی رام کی آتما بے حد دکھی نظر آنے لگی۔

''موت کے ڈر سے چپ ہو کر یا چھپ کر بیٹھ جانا بھی کوئی مردانگی نہیں...... اور تو یہ بات بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ ہماری طاقت ہی بھٹکی ہوئی شکتی شالی آتماؤں کو اپنے وش میں کر کے انہیں اپنے حکم کے مطابق چلانے میں ہے، ایسے خطرناک کاموں میں دس میں سے کوئی ایک انسان ہی کامیاب ہو پاتا ہے اور میرا دل یہ کہہ رہا ہے کہ تو ضرور کامیابی کا چہرہ دیکھے گا...... صدیوں تک زندہ اور جوان رہنے کا جو مقصد میں حاصل نہیں کر سکا وہ تجھے حاصل کرنا ہی ہوگا، پھر حسین و سندر کنیاؤں کی قربت اور دنیا جہاں کا عیش و آرام پانا تیرے لئے کچھ مشکل نہیں ہوگا۔'' مہان گرو شکتی رام کے آخری الفاظ نے اس کی نگاہوں میں ہیروں کی سی چمک بھر دی۔

سندر کنیائیں تو ویسے بھی اس کی سب سے بڑی کمزوری تھیں، سندر کنیاؤں کی قربت پانے کے لئے ہی تو اس نے نا صرف اپنا مذہب بدل کر بت پرستوں کا مذہب اختیار کیا تھا بلکہ کالے جادو اور عملیات بھی اس نے صرف عورت و دولت پانے کے لئے سیکھ رکھے تھے اور اب صدیوں تک زندہ و جوان رہنے کا ایک بے حد کٹھن عمل بھی وہ اسی وجہ سے کرنے کے لئے بے چین ہو رہا تھا کہ ہر اس عورت کی وہ قربت حاصل کر سکے جو اس کے من کو بھائے یا جس کا شریر جذبات کے ساکن دریا میں تلاطم سا برپا کر کے رکھ دینے والا ہو۔

اور ویسے بھی صدیوں تک جوان اور زندہ رہنے کا جاپ کرنے اور جاپ میں کامیابی کی صورت میں ہر پورن ماشی کی رات ایک نوعمر کنواری کنیا کی قربت پانا اس کی مجبوری بن کر رہ جاتا۔ ''آپ بالکل چنتا نہ کریں مہا گرودیو! آپ کا یہ بھگت وہ مقصد حاصل کر کے رہے گا جو آپ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔'' اس نے ایک عزم سے کہا۔

''ہم نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ چاہے اس خالی مکان میں بسیرا کرنے والی بری آتمائیں یا جنات ہماری جان ہی کیوں نہ

لے لیں ہم اس مکان کو آباد کر کے رہیں گے ہم زندہ انسان جب ان کے ٹھکانوں سے دور رہتے ہیں تو انہیں بھی زندہ انسانوں کے ٹھکانوں سے دور رہنا ہوگا......" بابا نے اپنے عقیدت مندوں کو یہ جواب دے کر ان کے دلوں کو مزید اپنی ہستی کا گرویدہ کر لیا۔

دوسرے ہی دن سے بابا نے آسیب زدہ مکان میں سکونت اختیار کر لی۔ لوگوں کو دکھانے کے لئے اس نے مکان کی جھاڑ جھنک اور صفائی ودھلائی بھی خود اکیلے کی۔

دن تو سارا اسی چکر میں بیت گیا رات ہوتے ہی بابا کے عقیدت مندوں کے دلوں میں وسوسے سے آتے رہے کہ کہیں صبح اس آسیبی مکان سے بابا کا مردہ شریر برآمد نہ ہو؟ کیونکہ اب تک تو یہی ہوتا آ رہا تھا جن لوگوں نے بھی جانے انجانے میں آسیبی مکان میں رات گزاری صبح مکان کے دروازے کی چوکھٹ پر ان کی لاشیں ہی پڑی ہوئی ملیں اور ان لاشوں کی حالت ایسی تھی جیسے پوری رات انہوں نے کسی خوف میں بسر کی ہو یا مکان میں بسیرا کرنے والے آسیبوں نے ان پر بے رحمانہ تشدد کر کے ان کی جان لے لی ہو۔

مکان کی جھاڑ جھنک اور صفائی ودھلائی نے بابا کو اس قدر تھکا دیا کہ اس نے اپنا بستر بچھایا اور لیٹ گیا تھکن کے باعث لیٹتے ہی اس پر نیند غالب آ گئی اور وہ گہری نیند کی آغوش میں جا سویا۔

جونہی ماحول پر رات کی تاریکی نے اپنے پنکھ پھیلائے مکان میں بسیرا کرنے والی ایک عورت کی آتما اپنی تمام تر شکتیوں اور غضب ناکی سمیت ظاہر ہوگئی اور آتما نے گہری نیند میں غرق بابا پر اپنی قہر آلود نگاہیں گاڑ دیں۔

بابا کے ماتھے پر پڑنے والی لکیروں سے وہ آتما لمحے کے ہزارویں حصے میں بابا کے ماضی، حال اور مستقبل کے ادوار سے واقف ہوگئی۔ اس کی ازلی غضب ناکی عود کر آئی نگاہوں میں نفرت کے شعلے پھنکنے لگے اس نے فوراً سے بھی پہلے اپنے دھواں وجود کو ٹھوس شکل میں تبدیل کیا اور آگے بڑھ کر گہری نیند کے مزے لوٹنے والے بابا کو گریبان سے پکڑ کر زمین پر کھڑا کر دیا۔

"ک ک کون؟ کون ہے تو۔" بابا نے نیند سے آنکھ کھلتے ہی حیرت سے دریافت کیا۔ صورت حال کو سمجھنے اور اپنے حواس بحال کرنے میں بابا کو چند لمحے لگ گئے۔

"میرے گھر میں گھس کر مجھے ہی قابو کرنے کے لئے آیا ہے، بہت ہمت والا ہے رے تو؟" آتما نے کہا اور بابا کو سنبھلنے کا موقعہ دیئے بغیر اس کے چہرے پر اپنے الٹے ہاتھ کا پنجہ اس بری طرح دے مارا کہ بابا اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور زمین کی دھول چاٹنے پر مجبور ہو گیا۔ تھپڑ کی شدت نے بابا کا دماغ تک ہلا کر رکھ دیا۔

اس لمحے بابا کو اپنی غفلت و غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ جب اس کے گرو دیو نے کہا تھا کہ آتما بہت شکتی شالی ہے پھر اسے اس طرح لاپرواہ ہو کر سونا نہیں چاہئے تھا اور سونے سے پہلے اپنی جان کی حفاظت کا کوئی معقول بندوبست ضرور کرنا چاہئے تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر کھڑا ہو پاتا اور بپھری ہوئی شکتی شالی آتما سے بچنے کا کوئی راستہ نکال پاتا آتما نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر آٹے سے بھری بوری کی طرح زمین پر دے مارا وہ بھونچکا سا ہو کر خوف زدہ نظروں سے آتما کو دیکھنے لگا۔ دو ہی حملوں سے اسے آتما کی شکتی کا

بخوبی اندازہ ہو گیا تاہم خوف زدہ ہونے کے باوجود وہ یہ سوچ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر اس نے اس آتما کو اپنے وش میں کر لیا تو کالی بلی سے اسے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔

"مجھے اپنے وش میں کرنے کے سپنے دیکھنا چھوڑ دے کیونکہ تیرا یہ سپنا کبھی پورا نہیں ہوگا۔" آتما نے ایک بار پھر اسے کسی پلاسٹک کے گڈے کی طرح نہایت سہولت سے اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا اور کمرے میں چاروں طرف اس قدر تیزی سے چکر دینے لگی کہ اس کے لبوں سے چیخیں خارج ہونے لگیں...... آتما کے لبوں سے آزاد ہونے والے قہقہوں نے اس کی رہی سہی ہمت بھی نچوڑ ڈالی اس کی آنکھوں میں ہی نہیں چہرے پر بھی خوف کی پیلاہٹ بکھر کر رہ گئی۔ چند لمحوں تک اس کے وجود کو چکر دینے کے بعد آتما نے اس کا وجود ایک دیوار کی جانب اچھال دیا دیوار سے ٹکرانے کے بعد "دھپ" سے اس کا وجود زمین پر آن گرا، زمین کا سینہ بھی اس پاپی وجود کے بوجھ سے تھرا اٹھا۔

"تو کیسی شکتی شالی آتما ہے جو بنا للکارے ایک دم سے حملہ آور ہو جاتی ہے اور مخالف کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر حملے کئے جاتی ہے کیا یہی ہیں تیری شکتیاں؟" اسے اس بپھری ہوئی آتما سے بچنے کی اس سے بہتر تدبیر کوئی سمجھ نہیں آسکی فوری طور پر اس کے پیش نظر اپنی جان کی سلامتی اہم تھی اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوتا اگر آتما کے غصے کو ٹھنڈا کیا جاتا اور اس نے دیکھا کہ اس کے الفاظوں نے آتما پر مثبت اثر ڈالا تھا اس نے تیسرا حملہ کرنے کی قطعی کوشش نہ کی ورنہ عین ممکن تھا کہ آتما کا تیسرا حملہ اس کی زندگی کا چراغ بجھا کر رکھ دیتا کیونکہ دو شدید حملوں نے اس کے شریر کی تمام ہڈیاں ہلا کر رکھ دی تھیں۔

"چل اٹھ! اس بار حملہ کرنے کی باری تیری۔" آتما کی غراہٹ سے مشابہہ آواز نے اس کے بدن پر کپکپی سی طاری کر ڈالی اس نے سوچا کہ واقعی حفاظتی منڈل کے بغیر ساری شکتیاں بس نام ہی کی ہوتی ہیں یہ حفاظتی منڈل ہی ہوتا ہے جس میں بیٹھ کر کوئی بھی سادھو یا تانترک کسی بھی پوشیدہ طاقت کو للکار سکتا ہے، ڈرا دھمکا سکتا ہے بلکہ بے بس کر کے اپنے وش میں بھی کر سکتا ہے۔

"میں کیا خاک حملہ کروں؟ تیرے حملوں نے میری ہڈیوں کے تمام جوڑ ہلا کر رکھ دیئے ہیں مجھ میں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی سکت نہیں رہی حملے کی سکت کیسے پیدا کروں؟" بابا نے درد و تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا۔

"مجھے ایک موقع دے۔ کل رات اسی مکان میں ہمارا پھر آمنا سامنا ہوگا اور میں یقین سے کہتا ہوں کہ کل کی رات میں تجھے اپنے وش میں کر کے رہوں گا۔" بابا کے لہجے میں سے عزم جھلک رہا تھا۔

"ہاں......" آتما حقارت سے چیخ اٹھی۔

"تو ابھی اسی وقت مجھ سے وعدہ کر کہ اگر میں نے تجھے اپنے وش میں کر لیا تو تو میرا ہر حکم مانے گی اور ہر اس شکتی سے میری حفاظت کرے گی جو مجھے ختم کرنے کے لئے میری جانب بڑھے گی۔" بابا نے آتما پر نفسیاتی دباؤ ڈالا۔

"ٹھیک ہے میں وعدہ کرتی ہوں جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں تیری زندگی کی حفاظت کروں گی پرنتو اتنا جان لے کہ تیری مرتیو اٹل ہے اور تیری موت بھی ایک ناری کے ہاتھوں لکھی ہے۔" آتما نے کہا اور دھواں سا وجود اختیار کئے اس کی نگاہوں سے غائب ہو گئی۔

آتما کے غائب ہوتے ہی جونہی اس نے ایک جھٹکے سے اٹھنا چاہا اس کے جسم کا جوڑ جوڑ درد کی انتہائی زیادتی سے بلبلا اٹھا وہ دیوار کا سہارا لے کر بڑی مشکل سے اپنے پیروں پر کھڑا ہوا اور لڑکھڑاتے ہوئے اپنے بستر کی جانب بڑھا۔

صبح جب بابا اس آسیب زدہ مکان سے باہر آیا تو اسے زندہ سلامت پا کر اس کے عقیدت مندوں کے چہرے مسرت کی زیادتی سے کھل اٹھے۔

''بابا! کیا مکان کے اندر بسیرا کرنے والی آتما فرار ہوگئی۔'' صبح جب بابا برگد کے درخت تلے آ کر بیٹھا تو اس کے منتظر عقیدت مندوں نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

''میں اسے فرار نہیں ہونے دوں گا اسے اپنے وش میں کر کے ایسی کڑی سزائیں دوں گا کہ اس کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔'' اس نے اپنی عزت کا بھرم رکھنے کے لئے یہ الفاظ ادا کئے۔

''جھوٹ کیوں بول رہا ہے غلیظ انسان...... ہمت ہے تو سچ بول! اور بتا ان بے وقوف و نادان لوگوں کو کہ اس آتما نے کل رات تیری کیسی درگت بنائی ہے؟'' ایک تمسخرانہ نسوانی آواز عقب سے ابھری اس نے برق رفتاری سے جونہی اپنے عقبی سمت دیکھا اسی کالی بلی کو ایک شان بے نیازی سے براجمان پا کر وہ لمحے بھر کے لئے سٹپٹا کر رہ گیا۔

''تو کیا مکان میں آتما اب بھی موجود ہے؟'' ایک عورت کی آواز نے بابا کی توجہ کالی بلی کی جانب سے ہٹا کر رکھ دی۔

''ہاں وہ مکان میں اب تک رہائش پذیر ہے ظاہر ہے وہ مکان اس کا گھر ہے...... آتما کا یہی کہنا ہے...... اور اپنا گھر چھوڑنے پر وہ کسی طور راضی ہو کے نہیں دے رہی اور وہ بہت شکتی شالی بھی ہے تاہم گزشتہ رات میں نے اس کی آدھی شکتیوں کا خاتمہ کر کے رکھ دیا ہے...... آج رات اس کی کہانی ختم ہو جائے گی اور اس کا مکان میرے قبضے میں آ جائے گا۔'' بابا نے جھوٹ کا سہارا لے کر اپنے عقیدت مندوں پر اپنی بہادری کی دھاک بٹھائی۔

''دیکھتے ہیں آج رات کس کی جیت ہوتی ہے۔ تیری یا اس شکتی شالی آتما کی؟'' عقب سے پھر نسوانی آواز ابھری لیکن اس بار بابا نے گردن گھما کر اپنی عقبی جانب نہیں دیکھا۔

عقیدت مندوں کو فارغ کرنے کے بعد بابا نے خالی مکان میں جانے سے قبل ایک بار پھر اپنے گرو دیو کی آتما کو طلب کیا اور اسے شکتی شالی آتما کو بے بس کرنے کا کوئی آسان طریقہ بتانے کی التجا کی کیونکہ آتما سے مقابلہ کرنے کی ہمت وہ اپنے شریر میں نہیں پاتا تھا۔

''میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ اس شکتی شالی آتما کو قابو کرنا اتنا آسان نہیں ہے...... اگرچہ اسے بے بس کرنا آسان ہے لیکن تیرے لئے اسے بے بس کرنا بھی آسان نہیں ہوگا اس کام کے لئے تجھے ایک مسلمان شخص کو چوری کرنے پر آمادہ کرنا ہوگا۔'' شکتی رام کی آتما کے الفاظ اسے غریق حیرت کر گئے۔

''چوری؟ اور کسی مسلمان شخص کو ہی کیوں؟'' اس نے اپنی حیرت لفظوں میں بیان کی۔

''کیونکہ کوئی ہندو درگا دیوی کی مورتی کے گلے میں پڑی کالے موتیوں والی وہ مالا کبھی چوری کرنے پر راضی نہیں ہوگا جس مالا کی تجھے

ضرورت ہے اور جسے شکتی شالی آتما کے گلے میں پہنا کر تو اس آتما کو با آسانی بے بس کر کے اپنے وش میں کر سکتا ہے۔'' شکتی رام کی آتما کے لبوں سے شکتی شالی آتما کو اس قدر آسانی سے بے بس کرنے کا طریقہ سن کر وہ خوشی سے جھوم اٹھا۔

''خبردار! تو درگاہ دیوی کے گلے سے مالا اتارنے کا خیال اپنے دل میں ہرگز مت لانا کیونکہ درگا دیوی کی مورتی کو چھوتے ہی تیری ساری شکتیوں کا خاتمہ ہو کر رہ جائے گا۔'' شکتی رام کی آتما نے کہا۔

''اس مالا میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ وہ شکتی شالی آتما میرے سامنے بے بس ہو کر رہ جائے گی۔'' اس نے اپنی الجھن بیان کی۔

''اپنی زندگی میں وہ آتما درگا دیوی کی سچی پجارن رہ چکی ہے وہ کالے موتیوں والی مالا جو اب درگا دیوی کی مورتی کے گلے میں جھول رہی ہے کبھی اس آتما کے پتی کے گلے کی زینت تھی اس آتما کو اپنے پتی سے اس قدر شدید محبت تھی کہ وہ اپنے پتی کے قدموں کی دھول سندور کی جگہ اپنی مانگ میں سجایا کرتی تھی یہی وجہ تھی کہ جب اس کے پتی کا دیہانت ہوا تو اس نے اپنے پتی کی یہ نشانی درگا دیوی کی مورتی کے گلے میں پہنا دی کیونکہ پتی سے پہلے اور پتی کے بعد اس کی سچی محبت صرف درگا دیوی کے لئے ہی تھی...... اس آتما کے غصے کو ٹھنڈا کرنے اور اسے اپنے آگے جھکانے کا ایک راستہ وہ کالے موتیوں والی مالا ہے اور دوسرا درگا دیوی کی مورتی ہے...... چونکہ درگا دیوی کی مورتی کو چھونے سے تیری ساری شکتیاں اور کالے جادو ختم ہو سکتے ہیں اس لئے بہتر یہی ہے کہ تو درگاہ دیوی کی مورتی کے گلے میں پڑی اس آتما کے پتی کی مالا حاصل کر لے۔'' شکتی رام کی آتما نے اسے تفصیل سے آگاہ کیا اور کچھ اور خاص نصیحتیں کر کے چلی گئی۔

اس رات بابا آسیبی مکان میں نہیں گیا اس نے سب سے پہلے درگا دیوی کے گلے میں پڑی کالے موتیوں والی مالا ایک ماہر چور کی مدد سے چوری کروائی اور پھر اس آسیبی مکان کا رخ کیا۔

رات کو جب آتما ٹھوس وجود اختیار کئے اس کے سامنے ظاہر ہوئی اور اسے پہلے وار کرنے کی دعوت دی تو اس نے بجائے حملہ یا وار کرنے کے اس کے پتی کی آخری نشانی کالے موتیوں والی مالا اس کی نگاہوں کے سامنے لہرا دی اور فاتحانہ تبسم چہرے پر سجا کر آتما کے چہرے کی جانب تکنے لگا۔

اپنے پیارے محبوب پتی کی آخری نشانی ایک پاپی کے ہاتھوں میں دیکھ کر پہلے تو آتما کو بے حد حیرت نے آن گھیرا لیکن اگلے ہی لمحے یہ سوچ کر وہ اپنی حیرت پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئی کہ ایسے پاپی جب اپنے سواد کے لئے کالے وگندے علوم سیکھتے ہیں تو ایسے انسانوں کے لئے اس مالا کو حاصل کرنا کیا مشکل ہو سکتا ہے۔

''یہ مالا مجھے دے دے میں وعدہ کرتی ہوں کہ تیرا ہر حکم مانوں گی اور تیری زندگی کی حفاظت بھی کروں گی۔'' آتما نے اس کے لب کھولنے سے پہلے اس کے سامنے از خود گھٹنے ٹیک دیئے۔

''یہ مالا تیرے پتی کی آخری نشانی ہے جو آج بھی تجھے بے حد عزیز ہے...... میرے لئے یہ مالا قطعی بے کار سی ایک چیز ہے یہ مالا تجھے اس وقت دوں گا جب میں صدیوں تک زندہ و جوان رہنے کا ایک کٹھن جاپ مکمل کر کے صدیوں زندہ و جوان رہنے کا راز پانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ مجھے اس عمل سے روکنے اور میری جان کی دشمن ایک کالی بلی میرے راستے میں حائل ہونے کی دھمکی دے گئی ہے...... تجھے اس کالی بلی کو اس وقت تک

روکے رکھنا ہے جب تک میں اپنا مقصد حاصل نہیں کر لیتا، یہ میرا تجھ سے وعدہ ہے کہ اپنے جاپ میں کامیاب ہوتے ہی تیرے پتی کی یہ مالا تجھے واپس کر دوں گا...... بول منظور ہے۔'' بابا نے اپنی شرط پیش کی۔

''تیری ہر بات ماننا اب میری مجبوری ہے۔'' آتما کے جواب نے بابا کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑا دی۔

جبکہ مکان کے باہر کھڑی ایک عورت مکان کے اندر سے آتی بابا اور آتما کی باتیں سن کر ایک دم سے بے حد پریشان سی ہو اٹھی۔

عورت کے چہرے پر بے شمار تفکرات کا جال سا پھیل کر رہ گیا اور بے اختیار اس کے تصور کے پردے پر اپنے پیر و مرشد آغا رحمانی کا پرنور چہرہ ابھر آیا اب ان کی ہستی ہی ایک ایسی تھی جو اس مسئلے کا کوئی مناسب حل پیش کر سکتی تھی۔

یہ عورت دراصل وہی کالی بلی تھی، جو قطعی یہ نہیں چاہتی تھی کہ شرافت یا بدھا رام کسی بھی طرح صدیوں تک زندہ و جوان رہنے کا راز حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے اس لئے وہ پہلی فرصت میں اپنے پیر و مرشد آغا رحمانی کی خدمت میں حاضر ہو گئی اور ان کے سامنے اپنا مسئلہ بیان کیا جو درحقیقت ہر ناری کی عزت و آبرو کی حفاظت کا بھی معاملہ تھا۔

''جس طرح دن کے اختتام پر رات کی آمد، نیکی کے ساتھ بدی، اچھائی کے ساتھ برائی اور جوانی کے بعد بڑھاپا آنا قدرت کے قوانین کا اٹوٹ حصہ رہا ہے بالکل اسی طرح زندگی کے سنگ موت بھی ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا...... صدیوں تک کوئی ذی روح جوان نہ تو زندہ رہا ہے اور نا ہی ایسا کوئی راز کسی مخلوق کے سینے میں بند ہے جسے حاصل کرنے یا پانے کے لئے کچھ بے وقوف خطرناک قسم کے چلے کاٹ کر اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں...... اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔'' اس سے زیادہ اب میں اور کیا کہوں؟'' پیر و مرشد آغا رحمانی کے اس جواب نے جنی کا دل سکون و اطمینان سے لبریز کر دیا۔ ادھر برگد والے بابا نے شکتی شالی آتما کو اپنی جان کی حفاظت پر مامور کر کے صدیوں تک زندہ و جوان رہنے کے کٹھن جاپ کا آغاز کر دیا۔

جبکہ کالی بلی کا روپ بھر کر انسانوں کے درمیان آزادانہ گھومنے پھرنے والی وہ جنی دوبارہ برگد والے بابا کی راہ میں حائل نہ ہوئی۔ اب اسے بھی اسی دن کا انتظار تھا جب برگد والا بابا اپنا جاپ مکمل کرنے کے بعد اپنی کمینگی کا آغاز کرے گا۔

کیونکہ اس کے پیر و مرشد آغا رحمانی نے کہا تھا ایسے شیطانوں کو اسی وقت موت سے ہمکنار کیا جا سکتا ہے جب وہ کسی گناہ کی انجام دہی میں مصروف ہو۔

مختصر یہ کہ برگد والا بابا دن بھر اپنے عقیدت مندوں میں گھرا رہتا، ان کے مسائل سن کر اپنے جادو ٹونوں یا غلام روحوں کی مدد سے ان کا حل پیش کر کے داد و دولت حاصل کرتا اور رات کو خالی مکان میں بند ہو کر اپنا جاپ کرتا۔

اسے یہ دیکھ کر قدرے خوشی ہوتی کہ اس کے ہندو و مسلمان عقیدت مندوں میں نا صرف دن بہ دن اضافہ ہو رہا تھا بلکہ اس کے عقیدت مندوں میں عورتوں کی تعداد مردوں کی نسبت کہیں زیادہ تھی، یہاں تک کہ پڑھی لکھی اور امیر گھرانوں کی لڑکیاں بھی اپنے مسائل لے کر اس کی خدمت میں حاضر ہونے لگی تھیں۔

حسین وجمیل اور دلکش عورتوں کا سمندر اپنی نگاہوں کے سامنے ٹھاٹھیں مارتے دیکھ کر وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتا۔ایک دن ایک شادی شدہ عورت بابا کے پاس آئی اور روتے ہوئے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

''بابا! شادی کو پانچ برس گزر چکے ہیں لیکن اب تک اولاد کی نعمت سے محروم ہی ہوں تمام ڈاکٹری علاج کروائے، حکیموں کے مطب کے چکر لگائے، ویدوں کے پاس گئی اور پیروں فقیروں کے آستانوں کی خاک بھی چھانی لیکن کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا...... آپ کے نام کا شہرہ سن کر آئی ہوں، آپ کی تعریف زدعام ہے؟ اپنے دل کی پکار پر آپ کے حضور دوڑی چلی آئی ہوں میرا دل یہ کہتا ہے کہ میری پریشانی کا حل آپ کے پاس ہے...... ہر طرف سے بہت مایوس ہو چکی ہوں یوں سمجھ لیجئے کہ مایوسی کی آکاس بیل نے مجھے پوری طرح اپنی گرفت میں کس رکھا ہے مجھے کہیں کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے گھٹا ٹوپ اندھیروں نے میری ہستی کو نگل رکھا ہے...... مجھے مایوسی کے اندھیروں سے باہر نکال لیجئے بابا! کوئی جھوٹا دلاسہ مت دینا ورنہ ٹوٹ کر بکھر جاؤں گی۔'' عورت کی حسین آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

جوان العمر برگد والا بابا عورت کی جھیل جیسی گہری آنکھوں میں ڈوبتا چلا گیا عورت کیا تھی؟ ایک چلتی پھرتی قیامت تھی۔اس کے حسن کی چکا چوند نے بابا کی آنکھیں خیرہ کر ڈالیں وہ سانس تک لینا فراموش کر بیٹھا اور گوشت پوست کا بت سا بنا اس حسین عورت کے حسن کو اپنی نگاہوں میں جذب کر کے اپنی پیاسی نگاہوں کی پیاس بجھاتا رہا لیکن جانے یہ کیسی پیاس تھی کہ بجائے بجھنے کے مزید بھڑکتی ہی جا رہی تھی اس غمزدہ عورت کا سوگوار حسن اور حسین جسم کی فتنہ انگیزیاں دیکھ دیکھ کر اس کے جذبات کے سمندر میں لہریں سی اٹھنی شروع ہو گئیں۔

بابا نے اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری اور اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر حسین عورت کے چہرے کو چھوا اپنے ہاتھ کی کپکپاہٹ خود اسے بھی شدت سے محسوس ہوئی اس نے عورت کا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور اپنے دل وجذبات پر قابو رکھتے ہوئے بولا۔

''رونا بند کر اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ۔'' بابا کے حکم پر عورت نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کئے اور بابا کی موٹی موٹی سرخ آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

بابا نے اپنی لہو رنگ نگاہیں اس غمزدہ عورت کی حسین واداس آنکھوں میں پیوست کر دیں اس کے جسم میں دوڑنے والے لہو کی گردش ایک دم سے تیز ہو گئی حسین عورت کی قربت اور اس کے قیامت خیز سینے کا زیروبم اسے بری طرح جھلسائے دے رہا تھا حسن کا ایک دہکتا ہوا آتش فشاں اس کے بے حد قریب موجود تھا وہ بھلا کیسے خود کو جھلنے سے محفوظ رکھ پاتا؟ یہی وجہ تھی کہ بابا کی آنکھوں کے سرخ ڈورے مزید سرخ ہونے لگے اس کی آنکھوں کے نچلے پپوٹے بری طرح تھر کنے لگے۔آہستہ آہستہ یہی تھرتھراہٹ بابا کے پورے وجود پر حاوی ہوتی چلی گئی وہ اس بری طرح تھرتھرانے لگا جیسے اسے بے تحاشہ سردی لگ رہی ہو یا ملیریا بخار کا حملہ ہو گیا ہو۔

بابا کی یہی بدلی حالت اور نگاہوں میں بسی لہو رنگ سرخی حسین وغمزدہ عورت کو اس قدر خوف زدہ کر گئی کہ وہ زیادہ دیر تک بابا کی آنکھوں میں جھانکنے کی ہمت اپنے اندر نہ پا سکی اور ایک دم سے نگاہیں جھکا کر رہ گئی۔

''پکڑی گئی سالی۔'' بابا کی گرجدار آواز نے عورت کو سر تا پاؤں لرزا کر رکھ دیا۔اس نے ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کے باوجود بابا کو چہرہ

اٹھا کر دیکھا۔

''جس بات کا مجھے شک تھا آخر وہی بات سامنے آئی۔'' بابا نے نہایت کمال پھرتی سے اپنی جسمانی حالت پر قابو پا کر غضب ناک لہجے میں کہا۔ عورت اپنی حسین آنکھوں میں کئی سوال چھپائے بابا کی صورت تکتی رہ گئی۔

''اری بدبخت عورت! تیرے جسم پر ایک چڑیل قابض ہے۔'' بابا کے لبوں سے ادا ہوتے ان الفاظ یا انکشاف نے عورت کے چہرے پر دوڑتی سرخی کو خوف کی زردی میں بدل کر رکھ دیا۔

''چڑیل؟'' وہ ہکلا کر رہ گئی۔

''ہاں! چڑیل اور جب تک وہ چڑیل تیرے وجود میں گھسی رہے گی تو کبھی حاملہ نہیں ہو پائے گی کیونکہ وہ چڑیل تجھے کبھی ماں بننے نہیں دے گی۔'' بابا کے لبوں سے ادا ہونے والے الفاظ اسے غریق حیرت کیے دے رہے تھے۔

''پھر؟ پھر میں کیا کروں بابا......؟'' عورت کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

''تو کیا کرے گی؟ تو کچھ بھی نہیں کر سکتی وہ بہت طاقتور چڑیل ہے۔'' بابا نے عورت کے چہرے پر دوڑتے خوف کو بھانپ کر اپنی باتوں سے مزید اسے ہراساں کیا اور بابا کا یہ حربہ سو فیصد کامیابی سے ہمکنار ہوا عورت خوف زدہ کے ساتھ ساتھ متفکر بھی دکھائی دینے لگی۔

''اس چڑیل نے میرے جسم میں ہی کیوں سکونت اختیار کی؟ وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے؟ کیا وہ اب بھی میرے جسم کے اندر چھپی بیٹھی ہے؟ اس نے کب میرے جسم پر قبضہ کیا؟ آج تک مجھے اپنے جسم میں اس کی موجودگی کا احساس کیوں نہیں ہوا؟'' عورت نے اجنبی نگاہوں سے اپنے جسم کی جانب دیکھا۔

''تیرے جسم کے خول میں چھپی ہوئی وہ چڑیل دراصل تیرے شوہر کی عاشق ہے۔ اسے صرف تیرے جسم کی ضرورت تھی اور وہ تیرے شوہر کے جسم میں داخل ہو کر تیرے گھر تک پہنچی ہے بعد میں اس نے تیرے جسم میں سکونت اختیار کر لی وہ جسم تو تیرا استعمال کر رہی ہے لیکن آسودگی خود حاصل کر رہی ہے تو میری بات کا مطلب سمجھ رہی ہے نا؟'' بابا نے ایک اور تیر چھوڑا جو اس کی توقع کے عین مطابق سیدھا نشانے پر جا کر لگا عورت انتہا سے زیادہ بے چین دکھائی دینے لگی۔

''کیا تو نے محسوس نہیں کیا کہ وہ کم بخت مجھ سے زیادہ دیر تک نگاہیں نہ ملا سکی اور مجھے غضب ناک ہوتے دیکھ کر تیرے جسم سے فرار ہو گئی۔'' بابا نے کہا۔

''کیا؟ فرار ہو گئی؟ مطلب کہ اس نے میرا جسم چھوڑ دیا ہے؟'' عورت خوش ہو گئی۔

''خوش ہونے کی ضرورت نہیں وہ ہمیشہ کے لئے فرار نہیں ہوئی ہے مجھ سے ڈر کر بھاگی ہے دوبارہ لوٹ کر تیرے جسم میں ہی آن کر سکونت اختیار کرے گی......اور میرا علم یہ کہتا ہے کہ اس وقت وہ چڑیل تیرے وجود سے نکل کر تیرے گھر کی جانب گئی ہے جہاں وہ تیرا رنگ و روپ دھارن کر کے تیرے شوہر کو پیار و محبت سے رجھا کر اپنے وش میں کرنے کی کوشش کرے گی اسی لئے تجھے ابھی اسی وقت ایک فیصلہ کرنا ہوگا؟'' بابا نے

ایک دم سے یہ الفاظ ادا کر کے اسے ہٹپٹا کر رکھ دیا۔

''فف فیصلہ؟'' عورت کچھ سمجھ نہ سکی۔

''کیا تو اپنے شوہر کی زندگی چاہتی ہے؟'' بابا نے ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں جھانکنا شروع کر دیا۔

''ہاں! ہاں بابا! ہاں۔'' عورت تڑپ اٹھی۔ ''کیا تو اپنے خاوند کو صرف اور صرف اپنا ہی دیکھنا چاہتی ہے؟'' بابا نے فوراً سے بھی پہلے دوسرا سوال داغ دیا۔

''ہاں...... '' اس کی حسین آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''ظاہر ہے پھر تو ماں بھی بننا چاہتی ہے اور یہ بھی چاہتی ہے کہ اس چڑیل سے تجھے اور تیرے خاوند کو عمر بھر کے لئے نجات حاصل ہو جائے؟'' بابا نے ایک ہی سانس میں اپنی بات بہت روانی سے بیان کر دی۔

''ہاں...... '' عورت نمکین پانی حلق سے اتارتے ہوئے بولی۔

''بس! فیصلہ ہو گیا۔'' بابا نے ایک ہاتھ اٹھا کر دوٹوک لہجے میں کہا۔

''اس چڑیل کا خاتمہ ہو گا۔ تیرا شوہر صرف تیرا ہو کر رہے گا صرف تجھ سے محبت کرے گا اور تو ماں بننے جیسا عظیم رتبہ بھی پائے گی۔'' بابا کے ان الفاظ نے اسے دنیا جہاں کی مسرتیں سونپ دیں اس کا حسین چہرہ تازہ گلاب کی مانند کھل اٹھا جس نے اسے وہ خوب صورتی عطا کر دی کہ بابا اپنا دل تھام کر رہ گیا۔

''سچ بابا؟ کیا میں ماں بن پاؤں گی؟ کیا میری گود میں میرا بچہ ہو گا؟'' وہ بولی۔

''سولہ آنے ایسا ہو گا...... مجھے ایک بہت کٹھن جاپ انجام دینا ہو گا اور میں تیری خاطر وہ عمل آج رات ہی کو انجام دے ڈالوں گا اس عمل کے ذریعے مجھے اس چڑیل کو تیرے جسم سے باہر لانا...... یا پھر تیرے جسم کے اندر ہی جلا کر ختم کر دینا شامل ہے میرے لئے اسے پکڑنا یا جلا کر مار دینا کوئی مشکل کام نہیں لیکن......؟ وہ چڑیل بہت طاقتور ہے میرے عمل کے دوران اگر وہ ہوشیار ہو گئی یا اسے اپنے خاتمے کا احساس ہو گیا تو مزید غضب ناک ہو جائے گی وہ میرا تو کچھ بگاڑ نہیں پائے گی لیکن یہ ممکن ہے کہ تجھے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش ضرور کرے گی...... بلکہ صاف بات تو یہ ہے کہ وہ تیری جان بھی لے سکتی ہے۔'' بابا نے دیکھا کہ یہ بات سن کر عورت کا جسم بے جان سا ہونے لگا۔

''تو کیا......؟'' اس سے پہلے کہ عورت کی زبان پر مایوسی کے کلمات آن کر ٹھہرتے بابا ایک دم سے کہہ اٹھا۔

''مایوس ہونے کی ضرورت نہیں! تو میرے پاس آئی ہے برگد والے بابا کے پاس...... جس کے پاس مردے بھی آ جائیں تو جی اٹھتے ہیں پھر چڑیل کی کیا مجال جو میرے کسی وار کا جواب دے سکے یا میرے کسی عمل کے مقابل کھڑی ہو سکے...... سب سے پہلے تو یہ شالی شکتی دھاگہ اپنے گلے میں ڈال لے۔'' بابا نے اپنے گلے سے ایک کالی ڈوری اتار کر غمزدہ عورت کی جانب بڑھا دی۔

''یہ ڈوری بہت شکتی شالی ہے اس کی موجودگی میں وہ چڑیل تیرے جسم میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کر پائے گی...... آج رات میں

تیرے بدن پر ایک ایسا جاپ کروں گا یا ایسا سحر پھونکوں گا کہ تیرے بدن کے اندر سے اس چڑیل کی ساری نحوست پسینہ بن کر خارج ہو جائے گی اور تو بہت جلد ماں بننے جیسا عظیم رتبہ پا لے گی۔" بابا نے اسے اپنی باتوں کے جال میں بری طرح کس لیا۔

"تو کیا آج رات مجھے یہیں قیام کرنا پڑے گا کیونکہ میں اس شہر کی باسی نہیں ہوں میں ایک دوسرے شہر سے سولہ گھنٹے کا سفر طے کر کے بڑی مشکلوں سے یہاں آئی ہوں۔" عورت کے لبوں سے یہ بات سن کر بابا کی آنکھیں ہیروں کی مانند جگمگا اٹھیں یہ تو بھگوان نے بن مانگے ہی اس کے دامن میں حسن کی دولت ڈال دی تھی گویا وہ حسن کے اس سمندر میں جی بھر کر ڈبکیاں لگا سکتا تھا اس عورت کا اس شہر میں کون تھا جو اس کی خیر خبر لینے کے لئے وارد ہوتا؟ اور یہ بھی عین ممکن تھا کہ یہ عورت چوری چھپے یا کسی کو بتائے بغیر یہاں آئی ہو۔

"وہ چڑیل اس وقت تیرا جسم چھوڑ کر جا چکی ہے اور یہی تیرے لئے سنہرا موقعہ ہے اس کی نحوست سے نجات حاصل کرنے کا! اگر اس نے دوبارہ تیرے جسم میں سکونت اختیار کر لی تو تیری یا تیرے شوہر کی جان کے لالے پڑ جائیں گے۔"

غرضیکہ بابا نے اس حسین عورت کو اس قدر ڈرا کر رکھ دیا کہ اس نے رات بابا کے ساتھ خالی مکان میں اور اپنے وجود کے اندر سے چڑیل کی نحوست نکالنے کے شوق میں بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس عورت اور بابا کے اطراف ہوا کی مانند چکراتی ہوئی جنی، بابا کی شیطانیت پر صرف بھڑتی رہ گئی۔ اسے اس غمزدہ عورت کی بے وقوفی اور کم عقلی پر بھی بہت غصہ آ رہا تھا جو ایسے شیطان مردوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر ان پر آنکھ بند کر کے اعتماد کرنے لگتی ہے اور پھر اپنی عزت کا انمول موتی کھو بیٹھتی ہیں۔"

کالی بلی کے روپ میں رہنے والی وہ جن زادی جو وہاں اپنے غائب وجود کے ساتھ ان کے ارد گرد ہوا بن کر منڈلا رہی تھی۔ اس لمحے اس کا شدت سے یہ دل چاہ رہا تھا کہ وہ انسانی روپ میں ظاہر ہو کر اس عورت کے چہرے پر ایک ایسا تھپڑ رسید کرے کہ اس عورت کی عقل ٹھکانے آ جائے۔

لیکن وہ لاکھ چاہنے کے باوجود ایسا اس لئے بھی نہ کر پائی کہ اس کے پیر و مرشد آغا رحمانی نے اسے ایسی کوئی بھی حماقت کرنے سے سختی سے منع فرماتے ہوئے کہا تھا۔

"وہ خود غلطی کرے گا...... اسے اس کی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی ہی لے ڈوبے گی اور تجھے اس کی غلطی کا ہی فائدہ اٹھانا ہے آئی سمجھ۔" آغا رحمانی کے یہ الفاظ اس نے اپنے دل و دماغ میں بسا لئے اور بڑی بے صبری سے اس لمحے کا انتظار کرنے لگی جب وہ خبیث کسی ایسی غلطی کا مرتکب ہو کہ اسے اس دھرتی کو اس کے ناپاک و نجس وجود سے نجات دلانے میں کوئی دشواری پیش نہ آ سکے۔

غمزدہ عورت کے حسن اور حسین جسم کے نشیب و فراز نے اس خبیث کے دل میں ہوس کی ایسی آگ بھڑکا کر رکھ دی تھی جو اس عورت کے حسن کے سمندر میں اتر کر ہی بجھائی جا سکتی تھی۔

"اری نادان! کیوں اس شیطان پر بھروسہ کر کے اس کے ساتھ جا رہی ہے؟ یاد رکھ! کوئی غیر مرد تیری عزت کا کبھی محافظ نہیں ہو سکتا ہے یہ لٹیرے ہوتے ہیں لٹیرے، تیری عزت کے سچے رکھوالے صرف تیرے اپنے سگے ہی ہو سکتے ہیں اگر تو بیٹی ہے تو تیری عزت کا پہلا رکھوالا تیرا باپ

ہے اگر تو بہن ہے تو بھائی کی غیرت ہے اگر تو بیوی ہے تو شوہر کی آبرو ہے اور اگر تو ماں ہے تو بیٹوں کا غرور ہے کیوں اتنے رشتوں کی حرمت کو پامال کرنے پر تلی بیٹھی ہے۔'' جن زادی ہوا بن کر اس کے کان میں سرگوشی کرتی گزر گئی۔

عورت نے چونک کر اپنے اطراف نگاہیں دوڑائیں لیکن کسی نسوانی پیکر کو اپنے قریب نہ پا کر نسوانی سرگوشی کو اپنا وہم جان کر بابا کے پیچھے پیچھے چلتی رہی، جو اسے آسیبی مکان کی جانب لے جا رہا تھا۔

''تو اس مکان میں بیٹھ کر میرے آنے کا انتظار کر...... میں جاپ کی تیاری کر کے رات بارہ بجے کے بعد آؤں گا۔'' بابا نے اسے آسیبی مکان میں بند کر دیا مارے خوشی کے بابا کے دل کی دھڑکنیں قابو سے باہر ہوئی جا رہی تھیں۔

''میں ذرا اپنے کچھ عقیدت مندوں کو فارغ کر کے آتا ہوں۔'' مکان کے دروازے کی باہر سے کنڈی لگاتے ہوئے بابا نے شکتی شالی آتما کے دھواں سے وجود کو مخاطب کر کے تحکم بھرے لہجے میں کہا، بے بس آتما نے اس کے حکم پر سر جھکا دیا۔

رات بارہ بجے کے بعد بابا نے آسیبی مکان کے دروازے کی کنڈی کھولی اور اندر داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کر دیا۔

اس نے سوچا کہ آج کی رات وہ اس عورت کی قربت سے لطف اندوز ہونے کی خاطر صدیوں تک زندہ و جوان رہنے کا عمل ایک رات کے لئے موقوف کر دے گا۔ اس کے خیال کے مطابق ایک رات کا وقفہ کرنے سے اس کے عمل میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ ویسے بھی وہ نصف سے زائد عمل نہایت کامیابی سے انجام دے چکا تھا نا تو شکتی شالی آتما نے اس کے عمل کے دوران کوئی مداخلت فرمائی تھی اور نا ہی اس آتما نے کالی بلی کو کسی قسم کی مداخلت کرنے دی تھی یہ اس کا خیال ہی نہیں یقین تھا کہ کالی بلی کو اسی شکتی شالی آتما نے ہی روکے رکھا ہوگا بہر حال یہی وہ غلطی تھی جو اس سے سرزد ہوئی۔

جونہی وہ دروازے کی کنڈی اندر سے لگا کر پلٹا چند لمحوں بعد خاموشی و سناٹے کے سینے میں شگاف ڈالتی ایک بے حد کرب انگیز مردانہ چیخ کی آواز بلند ہوئی اور علاقے کے طول و ارض میں گونج سی پیدا کرتی معدوم پڑ گئی۔

☆......☆......☆

لٹو نے چائے کا پانچواں کپ خالی کر کے میز پر رکھتے ہوئے اپنی بات ختم کی۔

''پھر؟ پھر کیا ہوا؟'' بابو بے اختیار سوال کر بیٹھا نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کہانی میں دلچسپی لئے بنا نہ رہ سکا اور بابا کا انجام جاننے کے لئے وہ حد درجہ بے چین و بے قرار سا دکھائی دینے لگا۔

''بابا کی اچانک گمشدگی نے جہاں اس کے ہندو مسلم عقیدت مندوں کو ہلا کر رکھ دیا وہیں یہ سوال بھی قابل غور تھا کہ آخر بابا کہاں غائب ہو گیا؟ اور اسی سوال نے قیاس آرائیوں اور اندازوں کو جنم دیا۔

کچھ لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ بابا جس عورت کے وجود سے چڑیل یا چڑیل کی نحوست کو اتارنے کا عمل کرنے گیا تھا وہ عورت بابا کے دشمنوں میں سے تھی اور اسی نے بابا کا قتل کرنے کے بعد راہ فرار اختیار کر لی تھی۔ اگر اس بات پر یقین کر لیا جائے تب بھی سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ بابا کی لاش کہاں گئی؟

کچھ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ اس رات کالی بلی نے بابا کے مکان میں داخل ہونے کے بعد خود کو انسانی روپ میں لا کر مکان کے باہر پہرہ دیتی شکتی شالی آتما سے کہا۔

''تیری مجبوری وہی کالی موتیوں والی مالا ہے نا جو تیرے پتی کی آخری نشانی ہے اور جو اس شیطان کے پاس ہے..... تو مجھے اندر جانے دے میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں چند لمحوں کے اندر تیری امانت، تیرے پتی کی آخری نشانی وہ کالے موتیوں والی مالا تجھے لا کر دے جاؤں گی بول کیا کہتی ہے سے تیزی سے بیتا جا رہا ہے اگر وہ شیطان اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو میں تجھے بھی معاف نہیں کروں گی۔'' جن زادی نے بے صبری سے دریافت کیا۔

''ٹھیک ہے میں تجھے دس سیکنڈ کا وقت دیتی ہوں اگر اس دوران تو نے مجھے میرے پتی کی آخری نشانی باحفاظت لا کر دے دی تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی اگر دس سیکنڈ تک تو لوٹ کر نہیں آئی تو میں اس بابا کی رکشک بن کر اندر آ جاؤں گی۔'' آتما کی بات پر جن زادی نے اقرار میں گردن ہلائی اور لمحے کے ہزارویں حصے میں مکان میں داخل ہو گئی۔

مکان میں پھیلی تاریکی کے باوجود اس نے بآسانی یہ دیکھ لیا کہ غمزدہ عورت زمین پر بچھی چٹائی پر لیٹی اپنی بدنصیبی پر آنسو بہا رہی تھی اس نے دروازے کی جانب پیٹھ کی ہوئی تھی اس لئے وہ یہ نہ دیکھ سکی کہ شیطان بابا دبے پاؤں مکان میں داخل ہو کر کوئی آواز پیدا کئے بغیر دروازہ اندر سے بند کر چکا ہے۔

بابا نے اپنی کلائیوں پر لپٹی رنگ برنگی مالا اور گلے میں جھولتی مالائیں اتار کر ایک کھونٹی پر لٹکا دیں اور حسین عورت کی پیٹھ کو تکتے ہوئے اپنے وجود کو کپڑوں کی قید سے آزاد کرنے لگا۔

جن زادی جو غائب وجود اختیار کئے ہوئے تھی اس نے بجلی کی سی رفتار سے مالاؤں میں گھری کالے موتیوں والی مالا اٹھائی اور دیوار پار کرتی ہوئی آتما کے پاس آئی جو آٹھ تک گنتی مکمل کر چکی تھی۔

''شکریہ! میری دوست میں تیرا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔'' شکتی شالی آتما کے یہ الفاظ سننے کے لئے جن زادی رکی نہیں اور اسے مالا دیتے ہی دیوار کے راستے ہی دوبارہ میں میں داخل ہوگئی۔

اس سے پہلے کہ بابا عورت کے وجود تک پہنچ پاتا لمحے کے ہزارویں حصے میں جن زادی اس عورت کے وجود میں داخل ہوگئی بابا اس جن زادی کے وجود کو اس لئے نہیں دیکھ پایا کہ اول تو ہوس کی بھوک نے اسے اندھا کر کے رکھ دیا تھا اسے سوائے حسین عورت کے قیامت خیز جسم کے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا اور دوم یہ کہ وہ اپنے گلے سے وہ تمام مالائیں اتار کر ایک کونے میں رکھ چکا تھا جس میں اس کی تمام شکتیاں محفوظ تھیں۔

جن زادی جونہی عورت کے جسم میں داخل ہوئی اس کے جسم کو ایک جھٹکا سا آیا جن زادی نے اس کے جسم کے ساتھ ساتھ اس کے دماغ کو بھی اپنی گرفت میں کس لیا اور بابا کے چھونے سے پہلے ہی ایک دم سے پلٹ کر بابا کی جانب دیکھا۔

خدا جانے اس کے دیکھنے کے انداز میں ایسی کیا خاص بات تھی کہ بابا کے بڑھتے قدم از خود ٹھہر سے گئے اور وہ گوشت پوست کا مجسمہ بنا عورت کی حسین آنکھوں میں دیکھتا رہ گیا جن میں انگارے سے سلگ رہے تھے اور چہرے پر ایسی وحشت و بربریت سی چھا چکی تھی کہ بابا کی چھٹی حس اسے انجانے خطرے سے آگاہ کرنے لگی اور اس سے پہلے کہ بابا مکان کے دروازے کی جانب دوڑ لگا پاتا عورت آسمانی بجلی کی مانند اس کی طرف لپکی اور بھرپور قوت کی ایک ہی ضرب سے بابا کی کھوپڑی ناریل کی طرح چٹخا کر رکھ دی۔

ایک انتہائی کرب انگیز چیخ بابا کے لبوں سے آزاد ہوئی اور اگلے ہی لمحے اس کا وجود بے جان سا ہو کر ''دھب'' سے زمین بوس ہوگیا۔

عورت یا جن زادی نے بے انتہا نفرت وحقارت سے بابا کے بے حس وحرکت پڑے وجود کی جانب دیکھا۔

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے بابا کے وجود سے اس کی آتما باہر آئی اور عورت یا جن زادی کے سامنے کھڑی ہو کر اس کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں پیوست کیے حقارت سے ہنسنے لگی۔

''تو کیا سمجھتی ہے؟ میرے شریر کو مار کر تو نے میرا خاتمہ کر دیا؟ اری نادان ہزاروں برس تک زندہ وجوان رہنے کا آدھا جاپ میں کر چکا ہوں اور اس جاپ سے مجھے یہ قوت ملی ہے کہ میں جب چاہے اپنے مردہ شریر میں دوبارہ داخل ہو سکتا ہوں بس اس مقصد کے لئے مجھے تھوڑا سا کشٹ یہ اٹھانا پڑے گا کہ کسی بالک کی گردن کاٹ کر اس کا پوتر خون اپنے مردہ وجود کے منہ کے اندر ٹپکانا ہوگا اور تو جانتی ہے کہ ایسا کرنا میرے لئے کچھ مشکل نہیں ہے۔'' بابا کی آتما اور قہقہے لگانے لگی۔

''ہاں جانتی ہوں! اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ ہر جگہ تو یہ گھناؤنا عمل انجام نہیں دے سکتا...... اس عمل کو انجام دینے کے لئے تیرے پاس صرف چند مخصوص جگہیں ہیں جبکہ میں تیرے ناپاک شریر کو کسی بھی ایسی جگہ بآسانی پھینک کر آ سکتی ہوں جہاں تو لاکھ چاہنے کے باوجود اپنے شریر کو دوبارہ حاصل نہیں کر پائے گا۔'' جن زادی کی باتوں نے بابا کی آتما کو بے چین کر کے رکھ دیا۔

اور اس سے پہلے کہ بابا کی آتما اپنے شریر کی حفاظت کی کوئی تدبیر کر پاتی جن زادی نے حسین عورت کا وجود چھوڑ دیا اور عورت بے ہوش ہوگئی۔

جن زادی نے ایک سحر پھونک کر بابا کی آتما کے گرد ایک حصار قائم کر کے اسے حصار میں قید کر لیا اور اس کے مردہ شریر کو اٹھائے مکان

سے نکل گئی بابا کی آتما بے بسی کی تصویر بنی کھڑی جن زادی کو اپنا شریر لے جاتے دیکھتی رہ گئی۔

بابا نے اپنی زندگی میں جتنے جاپ کیے تھے ان کے نتیجے میں حاصل ہونے والی شکتیاں بابا کی آتما میں اپنا شریر چھوڑنے کے چند لمحوں بعد منتقل ہوئی تھی اور ان شکتیوں کے حاصل ہوتے ہی بابا کی آتما بھی ایک شکتی شالی آتما کہلاتی لیکن ایسا کوئی لمحہ آنے سے پہلے جن زادی اس کی آتما کو چند لمحوں کے لئے اپنے حصار میں قید کر کے اس کے مردہ شریر کو ایک گہری کھائی میں پھینک آئی۔

''میں نے تیرا شریر ایک ایسی گہری کھائی میں گرا دیا ہے جہاں سے دنیا کی کوئی طاقت سوائے ایک طاقت کے تیرا شریر تجھے لا کر نہیں دے سکتی اگر یقین نہیں آتا تو بے شک اپنی تمام شکتیوں کا استعمال کر کے دیکھ لے تجھے ناکامی کا ہی سامنا کرنا پڑے گا''

جن زادی کی باتوں نے بابا کی آتما کو پریشانیاں سونپ دیں۔

''میں اس عورت کو اس کے شہر، اس کے گھر بلکہ اس کی خواب گاہ میں چھوڑ کر آنے کے بعد یہ بتاؤں گی کہ وہ کون سی طاقت ہے جو تجھے تیرا شریر اس گہری کھائی سے نکال کر لا کر دے سکتی ہے۔'' جن زادی نے کہا اور عورت کے بے ہوش وجود کو اٹھائے وہاں سے غائب ہوگئی۔

اس نے عورت کا بے ہوش وجود اس کی خواب گاہ میں سجے آرام دہ گدے والے پلنگ پر لا کر رکھ دیا اور مسکرا کر عورت کے شوہر کی جانب دیکھا جو اسی پلنگ پر سویا گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔

جن زادی جانتی تھی کہ جب اس عورت پر طاری بے ہوشی کی نیند ٹوٹے گی تو چوری چھپے گھر سے نکل کر برگد والے بابا سے ملنا اسے صرف ایک خواب سا لگے گا کیونکہ بابا نے جو الفاظ اس کے دماغ کی سلیٹ پر تحریر کیے تھے جن زادی نے وہ تمام تحریر صاف کر ڈالی تھی۔

''یقیناً تو یہ جاننے کے لئے بے چین ہوگا کہ وہ کون سی طاقت ہے؟ جو تیرے شریر کو اس گہری کھائی سے نکال کر تیرے پاس لا سکتی ہے۔''

جن زادی لوٹ کر آسیبی مکان میں آئی اور بابا کی آتما سے مخاطب ہو کر بولی۔ بابا کی آتما کی بے بسی اسے لطف پہنچا رہی تھی۔

''وہ طاقت قوم جنات سے تعلق رکھنے والے ایک بہت طاقت ور جن کی طاقت ہے صرف وہی جن اس ہزاروں فٹ گہری کھائی میں پڑا تیرا مردہ شریر وہاں سے نکال سکتا ہے...... لیکن تیری بدنصیبی کہ تو اس جن کو قابو نہیں کر سکتا کیونکہ وہ جن کوئی جیتا جاگتا زندہ انسان ہی قابو کر سکتا ہے اور یہ بھی جان لے کہ ہر انسان اور خاص طور پر کوئی بت پرست اسے قابو میں نہیں کر سکتا اس مقصد کے لئے تجھے ایک ایسے بہادر اور ہمت والے مسلمان نوجوان کی تلاش کرنی پڑے گی جو قوم جنات سے ٹکر لے سکے اور ان کی طاقت کو اپنی مٹھی میں کر سکے۔'' جن زادی نے کہا اور اپنی جیت پر قہقہے بکھیرنے لگی۔

''میں نے تیرے شریر پر ایک ایسا سحر پھونک دیا ہے کہ کوئی بھی مردار خور جانور پرندے یا کیڑے مکوڑے تیرے شریر کا گوشت کھانے کی ہمت نہیں کریں گے بلکہ کوئی تیرے شریر کے قریب بھی نہیں پھٹکے گا اب اگر تجھے اپنی شکتیوں پر غرور ہے تو اپنے شریر کو حاصل کر کے اور دوبارہ اپنے شریر میں داخل ہو کر بتا؟'' جن زادی نے اسے دھمکی دی اور غائب ہوگئی۔

''کہتے ہیں کہ اسی دن سے برگد والے بابا کی آتما ایک ایسے بہادر و باہمت نوجوان کی تلاش میں بھٹک رہی ہے جو طاقتور جن کو اپنے قابو

میں کرنے کی ہمت وجذبہ رکھتا ہو۔" لٹو نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"اور ہمارے بزرگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان سرپھروں کو برگد والے بابا کی آتما ضرور دکھائی دیتی ہے جو بابا کی طرح عورت کے حصول کو اپنے جینے کا مقصد بنا لیتے ہیں...... عورت کو پانے کے لئے پاگل ہو جاتے ہیں اور عورت کو حاصل کرنے کے لئے ہر حد پھلانگنے کو تیار بیٹھے ہوتے ہیں...... شاید تجھے بھی برگد والے بابا کی آتما اسی لیے دکھائی دی ہوگی۔" لٹو کے لہجے کی شرارت پر وہ بری صورت بنا کر رہ گیا۔

☆......☆......☆

رات نو بجے کے بعد بابو اپنے گھر میں داخل ہوا اور کسی سے کچھ کہے بنا اپنے کمرے میں جا گھسا اور پلنگ پر آنکھیں بند کئے لیٹ گیا۔

''کیا بات ہے بیٹا؟ آج کھانا بھی نہیں کھایا تو نے تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' ماں کی آواز پر وہ بے دلی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''سر میں درد ہے..... سونے سے آرام آ جائے گا اس لئے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔''

اس نے ماں کی گھسی پٹی باتوں سے بچنے کے لئے بہانہ تراشا۔ ''ٹھیک ہے تو آرام کر میں صبح بات کروں گی۔'' زلفاں بیگم نے کہا اور جانے کے ارادے سے پلٹ گئیں اس نے اخلاقاً بھی ماں کو بیٹھنے کے لئے نہیں کہا اور ماں کے جاتے ہی دوبارہ آنکھیں بند کئے لیٹ گیا۔

جونہی دیوار گیر گھڑی نے رات کے بارہ بجنے کا اعلان کیا وہ چھلانگ لگا کر اپنے بستر سے اٹھا اور دبے قدموں چلتا ہوا گھر سے باہر آ گیا۔

اطراف پر سرسری نگاہیں دوڑاتے ہوئے اس نے الٹے ہاتھ کی سمت چہرے کا رخ پھیرا اور اپنی دانست میں اپنی منزل کی جانب چل پڑا۔

ابھی اس نے بمشکل تمام چند قدم ہی چلنے کی زحمت فرمائی ہوگی کہ ایک بار پھر کسی نادیدہ قوت نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا بلکہ یہ کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا کہ اس کے وجود کو کسی بچے کی طرح اپنی گود میں بھر کر نہایت برق رفتاری سے طویل مسافت لمحوں کے اندر طے کر کے اسے اس کی مطلوبہ جگہ پر لا کھڑا کیا۔

اس نے دیکھا کہ اس کی ناک کی سیدھ میں برگد کا درخت بے شمار جلتے ہوئے دیوں کی روشنی میں دن کے اجالے کی طرح روشن اور واضح دکھائی دے رہا تھا۔

درخت کے موٹے تنے سے پیٹھ ٹیکے اس کی ہری بھری بھاری بھرکم شاخوں تلے بابا آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے ان کے ایک ہاتھ میں تسبیح تھی اور وہ تسبیح کے دانے گھمائے کچھ پڑھنے میں مصروف تھے۔

''السلام علیکم بابا۔'' قریب پہنچ کر بابو نے پر جوش سلام پیش کیا۔

بابا نے ایک دم سے بند آنکھیں کھول لیں اور چہرہ اٹھا کر ایسی غضب ناک نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا جیسے اس نے بابا پر سلامتی بھیج کر یا اسے سلامتی کی دعا دے کر اس کے وجود پر ہنٹر دے مارا ہو۔

بابا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموشی اختیار کر کے ایک جانب بیٹھنے کے لئے کہا۔

اس بار بھی بابا نے اس کے سلام کا جواب دینا گوارہ نہ کیا لیکن بابو نے اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہ دی اور بابا کے اشارے پر خاموشی سے ایک جانب بیٹھ گیا۔ اسے یہ دیکھ کر بہت اطمینان حاصل ہوا کہ آج کی رات بابا کا ایک بھی عقیدت مند موجود نہیں تھا یا پھر بابا نے آج اس کے علاوہ کسی کو طلب نہ کیا تھا بہر حال جو کچھ بھی تھا اسے خوشی ہو رہی تھی کہ آج اسے اپنی باری کے انتظار میں لوگوں کے بے تکے مسائل سننے سے نجات مل گئی تھی۔ لیکن خدا جانے بابا تسبیح کے دانوں پر کیا پڑھنے میں مصروف تھے کہ لمحے ایک کے بعد ایک سرکتے چلے جا رہے تھے لیکن بابا کے پڑھنے کے عمل میں تعطل واقع نہ ہونے پا رہا تھا۔

''بابا! آج آپ نے مجھے بلوایا تھا..... دولت کے حصول کا ایک آسان نسخہ بتانے کے لئے۔'' انتظار کی اذیت سے اکتا کر بالآخر بابو کو ہی

اپنے لبوں کو حرکت دینی پڑی۔

بابا نے مسکرا کر اقرار میں گردن ہلائی اور اپنا سیدھا ہاتھ جس کی کلائی پر موٹے دانوں والی تسبیح لپٹی ہوئی تھی بابو کے سر پر شفقت سے دھرا۔ بابا کے ہاتھ نے اس کے سر کو چھوا ہی تھا کہ ایک یخ بستہ لہر تالو کے راستے اس کے تمام وجود میں سرایت کر گئی اور اس کے وجود کو ایک شدید جھٹکا دے گئی وجہ معقول تھی بابا کا ہاتھ برف کی مانند سرد ہو رہا تھا۔

''ایک بات پوچھوں بابا؟'' بابو نے ہمت مجتمع کرتے ہوئے سوال کیا۔ بابا نے اقرار میں گردن ہلا کر اسے اجازت عنایت فرمائی۔

''آپ کے ہاتھ اس قدر سرد کیوں رہتے ہیں؟ کل بھی میں نے آپ کے پیروں کو چھوا تھا تو آپ کے پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے اور آج بھی جب آپ نے مجھے چھوا تو......؟'' بابو نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

''مجھے معلوم تھا کہ تو یہ سوال ضرور کرے گا کیونکہ کل سے اس سوال نے تیرے دماغ میں کھلبلی سی مچا رکھی ہے۔'' بابا کی یہ بات اسے کچھ حیران کر گئی۔

''ویسے تو یہ ایک راز کی بات ہے لیکن تیری پریشانی کو مدنظر رکھتے ہوئے میں تجھے بتائے دیتا ہوں۔'' بابا نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا اور چند لمحوں کے توقف کے بعد گویا ہوا۔

''زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں مختصراً اتنا جان لے کہ میں نے ایک جاپ کر کے اپنے اندر کے انسان کو اپنے قابو میں کر رکھا ہے میرے اندر کا وہ انسان جو میرا ہم شکل بھی ہے اور جسے تم میرا ہم زاد بھی کہہ سکتے ہو وہ اور میں بیک وقت دو الگ الگ جگہوں پر اپنا اپنا کام انجام دیتے رہتے ہیں......کل بھی اور آج بھی میں یہاں بیٹھا اپنا کام کر رہا ہوں اور وہ کسی اور جگہ میرے ہی رنگ و روپ میں موجود کسی اور ضرورت مند کی مدد کرنے میں مصروف ہے جب میں کسی پریشان حال کی پکار پر اپنے ہم زاد کو اپنے جسم سے باہر آنے کا کہتا ہوں تو اپنے ہم زاد کے باہر آتے ہی میرا جسم ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔'' بابا نے یہ جواب دے کر اس کے دل و دماغ کو ایک بڑی الجھن کی گرفت سے رہائی دلوائی۔

''اب دولت کمانے کا وہ آسان نسخہ بھی بیان فرما دیجیے......میرے پاس وقت کی بہت کمی ہے۔'' بابو نے التجا کی۔

''دولت کمانے کا نہیں! دولت حاصل کرنے کا نسخہ۔'' بابا نے اس کے الفاظ درست کیے۔

''اور صرف دولت ہی نہیں دنیا جہان کا عیش و آرام! وہ نسخہ ایک جاپ ہے ویسے تو وہ چلہ بہت آسان ہے لیکن چلے کی آسانی کی اولین شرط چلہ کاٹنے والے کی ہمت اور بہادری ہے اگر تو میرے بتائے ہوئے چلے کو مکمل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو دولت کے ساتھ ساتھ دنیا کا ہر عیش و آرام تیرے ایک اشارے پر تیرے قدموں میں ہوگا۔'' بابا کے ان الفاظ نے اس کے جوشِ جنوں اور آتشِ شوق کو مزید بھڑکا کر رکھ دیا۔

''آپ مجھے اس جاپ کے طریقہ کار سے متعلق سمجھا دیجیے وہ جاپ چاہے کیسا ہی مشکل یا دشوار گزار کیوں نہ ہو میں ضرور انجام دوں گا۔'' بابو کی انتہا سے زیادہ بے صبری و بے قراری دیکھ کر بابا کے لبوں پر مسکراہٹ آن ٹھہری۔

''میری یہ بات یاد رکھنا جاپ کوئی سا بھی ہو مشکل نہیں ہوتا...... چلے کو مشکل ترین اور بعض اوقات جو چیز ناممکن بنا کر رکھ دیتی ہے وہ چیز

ہے انسان کے اندر بسا ہوا خوف! لہٰذا کوئی بھی چلہ کاٹنے کی نیت کرنے سے پہلے تجھے اپنے دل کے اندر بسے ہوئے ڈر وخوف پر سب سے پہلے قابو پانا ہے۔'' بابا نے کہا۔

''آپ بے فکر رہیے بابا! بابو نے اپنے دل میں ڈر وخوف کو کبھی پھلنے پھولنے نہیں دیا میرا دل بہت مضبوط ہے۔'' بابو نے سینہ تان کر بڑے فخر وغرور سے بھرپور لہجے میں کہا۔

''بڑے بول نہ بول بچہ! میں تیری بہادری کا ایک نظارہ اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرما چکا ہوں۔''

''وہ تو میں کسی ایسے واقعے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا اس لئے کچھ ڈر سا گیا لیکن اب ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔'' بابو نے یقین دلایا وہ ہر قیمت پر بابا سے اس جاپ کا طریقہ کار معلوم کرنا چاہتا تھا جو اس کی زندگی میں ایک نیا موڑ لا سکتا تھا۔

''صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے جو کچھ تیرے سامنے ایک دم سے آیا وہ کسی پہلوان کے سامنے بھی اگر آ جاتا تو اس کی عقل بھی کام نہیں کرتی اور وہ بھی اسی طرح میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو جاتا جیسے کہ تو سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔'' بابا نے اس کی ہمت کو مستحکم کیا۔

''دراصل یہ جو انسان کے اندر بسا ڈر وخوف ہے یہ انسان کا ایک ایسا جانی دشمن ہے جو انسان کو نہتا اور ہراساں پا کر اچانک سے انسان پر حملہ آور ہوتا ہے اور انسان کو ایک دم سے اس بری طرح اپنی گرفت میں کس لیتا ہے کہ انسان اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیتا ہے اس میں مزاحمت کی قوت باقی نہیں رہتی، یہاں تک کہ انسان کی سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں بھی ناکارہ ہو کر رہ جاتی ہیں اور سوائے راہ فرار اختیار کرنے کے انسان کو دوسرا کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا......اس لئے میں پھر اپنی یہ بات دھرا رہا ہوں کہ کسی بھی چلے کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی اولین شرط یہی ہے کہ انسان اپنے اندر کے ڈر وخوف کو پہلے ختم کرے۔'' بابا نے اسے ایک اہم بات ذہن نشین کرائی وہ نہایت توجہ سے بابا کے لبوں سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ سنتا رہا۔

''اور میرا علم وتجربہ یہ کہتا ہے کہ تو ایک مضبوط اعصاب کا مالک بہت بہادر اور ہمت والا نوجوان ہے اور تیری سچی لگن کو دیکھتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تو وہ چلہ کامیابی سے انجام دے گا کیونکہ میں تیری آنکھوں میں اپنی محبت کو حاصل کرنے کا ایک جوش وجذبہ سمندر کی لہروں کی مانند ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔'' بابا کے ان الفاظ نے اس کا دل مضبوط کیا اور ارادوں کو مزید استحکام بخشا۔

''اللہ نے چاہا تو میں آپ کے یقین کی لاج رکھنے میں کامیاب رہوں گا بس آپ میری کامیابی کے لئے دعائیں ضرور کیجئے گا۔'' بابو نے جواب دیا۔

''میری دعائیں ہمیشہ تیرے ساتھ رہیں گی تیری کامیابی میں ہی میری کامیابیاں پوشیدہ ہیں۔'' بابا کی یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آ سکی اور نا ہی اس نے سمجھنے کی کوشش کی۔

''جاپ کا طریقہ کار جاننے سے قبل میری کچھ باتیں نہایت ہی غور اور توجہ سے اپنے دونوں کان کھول کر سن لے پھر نہ کہنا کہ بابا نے اندھیرے میں رکھا یا مجھے دھوکا دیا۔'' بابا کے لہجے میں سختی در آئی۔

''آپ کہیے میں سن رہا ہوں۔'' بابو سر تا پاؤں کان بن کر رہ گیا۔

''جو چلہ میں تجھے بتانے لگا ہوں وہ صرف تین راتوں پر مشتمل ہے......یعنی پوری تین راتوں کا عمل ہے۔ ایک بار پھر میں یہی کہوں گا کہ چلہ بہت آسان ہے صرف تجھے اپنا دل مضبوط رکھنا ہے کیونکہ یہ چلہ تو ایک ہوائی مخلوق کو اپنے قابو میں کرنے کے لئے انجام دے رہا ہے اور جب کوئی بہادر و دلیر انسان کسی ہوائی مخلوق کو اپنے بس میں کرنے کے لئے اس قسم کی چلہ کشی کا ارادہ کرتا ہے اور اپنے عمل کا آغاز کر لیتا ہے تو اتنا جان لو کہ پوشیدہ مخلوق کے سارے قبیلوں میں یہ خبر از خود پھیل کر رہ جاتی ہے اور تمام قبیلوں میں کھلبلی سی مچ جاتی ہے......اگر تو کوئی چلہ کسی مہان شکتی کو اپنے قابو میں کرنے کے لئے انجام دے رہا ہے تو تیرے جاپ کی پہلی رات کے ابتدائی چند لمحوں کے اندر ساری مہان شکتیاں، تمام سردار ایک جگہ اکٹھے ہو کر اس مسئلے کا حل تلاش کرنے میں مصروف ہو جائیں گے کہ تجھے یہ چلہ مکمل کرنے سے کسی بھی حال میں روکا جائے یا چلہ پورا کرنے نہ دیا جائے کیونکہ جنات سردار یہ کبھی نہ چاہیں گے کہ ان کے قبیلے کا کوئی جن کسی انسان کا غلام بن کر رہ جائے قبیلے کے سردار تو سردار کوئی ایک جن زادہ بھی اس بات کو پسند نہیں کرتا ہے کہ ان کے قبیلے کی کوئی طاقت کسی انسان کی غلامی کرے اپنے قبیلے کے کسی بھی مہان شکتی کو انسانی غلامی سے بچانے کے لئے ہی ہوائی مخلوق کے سردار ایک جگہ جمع ہو کر آپس میں صلاح و مشورے کرتے ہیں۔

وہ سب اس سوال پر غور فرماتے ہیں کہ آخر ایسا کون سا طریقہ اختیار کیا جائے کہ وہ جاپ کرنے والے انسان کو روک سکے؟

اس مقصد کے لئے ہوائی قبیلے کے سردار اپنی کچھ طاقتور اور غضب ناک شکتیوں کے ذمے یہ کام سونپ دیتے ہیں کہ وہ چلہ کرنے والے انسان کو ہر ممکن طریقے سے ڈرا، دھمکا کر یا خوف زدہ و ہراساں کر کے چلہ مکمل کرنے سے قبل ہی بھاگنے پر مجبور کر دے۔

جنات اس کائنات کے تخلیق کار کی ایک ایسی خوفناک ترین مخلوق ہے جو ہر جاندار کا روپ دھار سکتے ہیں ان کے پاس ایسے سینکڑوں ہتھیار یا ہتھکنڈے ہوتے ہیں جن کا استعمال کر کے وہ آدم انسان کو پریشان و ہراساں کر سکتے ہیں بے حد خوف زدہ بھی کر سکتے ہیں......انسان ان کی دہشت انگیز شرارتوں سے اس حد تک خوف زدہ ہو کر رہ جاتا ہے کہ یا تو وہ پاگل ہو کر رہ جاتا ہے یا ذہنی مریض بن کر رہ جاتا ہے اور خوف حد سے بڑھ جائے تو اس کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔'' برگد والے بابا نے اتنا کہہ کر چند لمحوں کے لئے چپ اختیار کر لی اور اپنی موٹی موٹی آنکھیں بابو کے چہرے پر گاڑھ کر موت کے ذکر پر اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے لگا لیکن یہ دیکھ کر بابا کے لبوں پر غیر محسوس مسکراہٹ نے آن کر بسیرا کر لیا بابو کے چہرے پر خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔

''جس دن تو بھی جاپ کا آغاز کرے گا تیرے سامنے بھی ہوائی مخلوق کسی بھی جاندار کی شکل یا روپ میں ظاہر ہوں گی ان کا مقصد تیری توجہ ہٹا کر تجھے جاپ سے باز رکھنا یا وظیفے کا عمل بھلانا ہے......یاد رکھ! چلے سے تیری توجہ ہٹانے کے لئے وہ ایسی ایسی عجیب و غریب حرکات کریں گے جو تجھے خوف میں مبتلا کر کے رکھ دے گی۔

کئی دہشت انگیز ڈرامے تیری نظروں کے سامنے رچائے جائیں گے......کئی ایسی خوفناک حرکات کی جائیں گی کہ تو فرار ہونے کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جائے گا یا بے اختیار اٹھ کر بھاگنے لگے گا لیکن......؟ تجھے اپنے دل و جذبات پر قابو رکھنا ہو گا اپنا دل مضبوط کرنا ہو گا کسی بھی لمحے

خوف کے آسیب کو اپنے اوپر سوار ہونے مت دینا صرف اتنا یاد رکھنا کہ سوائے تجھے خوف زدہ کرنے کے وہ تیرا کچھ بگاڑنے کی قدرت نہیں رکھتے۔

انسان کو صرف اس کے اندر بسا خوف مارتا ہے جنات انسان کو نہیں مارا کرتے۔

جب کوئی انسان کسی بھی ہوائی مخلوق کو اپنے قابو میں کرنے جیسے کٹھن اور خطرناک کام کا آغاز کرتا ہے تو وہ یونہی منہ اٹھائے نہیں چل پڑتا۔ وہ سب سے پہلے اپنی حفاظت کا سوچتا ہے اب میں تجھے اپنی حفاظت کے طریقہ کار سے سب سے پہلے آگاہ کرتا ہوں۔'' بابا نے کہا۔

''انسان کسی بھی قوم یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہر مذہب انسان کو اپنی زندگی کی حفاظت کے کچھ طریقے یا اصول ضرور بتا تا ہے۔ چلہ کشی کرنے والوں کے لئے بھی اپنی زندگی کی حفاظت ضروری ہے، اور اس کی زندگی کی حفاظت کرتا ہے وہ ایک نادیدہ حصار جو جاپ کرنے والا اپنے وجود کے اطراف ایک دائرے کی صورت میں کچھ مقدس الفاظ کا ورد کرتے ہوئے کھینچتا ہے۔

حصار کے اندر جاپ کرنے والا ہر طرح سے محفوظ رہتا ہے، ہوائی مخلوق مقدس الفاظ کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی اسی لئے وہ اس حصار کے قریب آنے کی حماقت نہیں کرے گی، کیونکہ مقدس الفاظ کی مدد سے کھینچا گیا حصار! اگر ایک جانب انسان کی زندگی کا ضامن ہوتا ہے تو دوسری جانب ہوائی مخلوق کی موت کا کھلا اعلان ہوتا ہے جو حصار انسان کو دکھائی نہیں دیتا وہ انہیں نظر آتا ہے اسی لئے وہ ایسے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں کہ انسان خود حصار سے باہر آنے پر مجبور ہو جائے۔'' یہ کہہ کر بابا نے اسے اپنے اطراف حصار کھینچنے کے طریقے اور عمل کی تفصیل سے وضاحت فرمائی۔

''اب آتے ہیں اس بات کی جانب کہ اگر تو نے جاپ کامیابی سے سرانجام دے دیا تو چلے کی آخری رات کیا ہوگا؟'' بابا نے کہا۔

''اگر تین راتوں پر مشتمل وہ جاپ تو نے کامیابی سے گزار دیا تو چلے کی تیسری اور آخری رات کا جاپ مکمل ہونے کے اگلے ہی لمحے تیرے سامنے ایک مہان شکتی ظاہر ہوگی۔ وہ انسان کے روپ میں بھی وارد ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی اصل شکل وصورت میں حاضر ہو۔ وہ اپنے آقا یعنی تیرے سامنے نہایت ادب واحترام سے ہاتھ باندھے اور سر جھکائے کھڑا ہوگا اور یہ الفاظ ادا کرے گا۔

''میرا نام فلاں ہے آپ نے مجھے طلب کیا اور میں حاضر ہوں اس لمحے سے میں آپ کا غلام اور آپ میرے مالک ہیں آپ کا ہر حکم بجا لانا مجھ پر فرض ہے آپ حکم کیجئے۔''

سب سے پہلے تو اس مہان شکتی سے اپنا ہر حکم ماننے اور اپنی ہر خواہش پوری کرنے کا وعدہ لینا وعدے کی زنجیر گلے میں پڑتے ہی وہ تیرا ہر جائز و ناجائز حکم ماننے پر مجبور ہو جائے گا پھر تو اس سے اپنی ہر وہ خواہش پوری کرنے کا کہنا جو تیری زندگی کی حسرتیں بن کر رہ گئی ہیں مجھے معلوم ہے تو نوکری نہیں کرتا محنت طلب کاموں سے بہت جی چراتا ہے بلکہ تیری جان جاتی ہے صرف ایک ہی خواہش تیرے دل میں پیدا ہوتی ہے کہ تو راتوں رات دولت مند ہو جائے یا رات میں سونے کے بعد صبح جب تو بیدار ہو تو تیرے چاروں طرف دولت بکھری ہوئی ہو۔'' بابا کی اس بات پر وہ صرف مسکرا کر رہ گیا۔ سچائی کو جھٹلانا اسے پسند نہ تھا۔

''اب آپ مجھے اس جاپ کے الفاظ بھی بتا دیجئے مجھ سے اب اور انتظار نہیں ہوتا۔'' بابو نے اپنی بے چینی لفظوں میں بیان کر دی۔

برگد والے بابا نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور اپنا سیدھا ہاتھ بڑھا کر اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور اپنے جاپ کے الفاظ سے آگاہ کرنے لگا

وہ نہایت توجہ اور انہماک سے بابا کے لبوں سے ادا ہونے والے الفاظ سننے کے بعد دہراتا رہا اور ذہن نشین کرتا رہا۔

''یہ عمل تجھے نئے چاند کی تیرہ تاریخ سے شروع کرنا ہے اور اتفاق سے کل چاند کی تیرہویں شب ہے تو چاہے تو کل رات سے اس عمل کا آغاز کر سکتا ہے بصورت دیگر تجھے نئے چاند کا انتظار کرنا ہوگا۔'' بابا نے کہا۔

''میرے پاس وقت بہت کم ہے بابا میں کل رات ہی سے اس جاپ کا آغاز کروں گا۔'' بابو نے جواب دیا۔

''جیسے تیری خوشی! پر اتنا یاد رکھنا یہ جاپ مسلسل تین راتوں کا ہے اس عمل کا اختتام چاند کی پندرہ تاریخ کو شب کے کسی بھی پہر جاپ مکمل کرنے کے بعد ہوگا اور تجھے ہر حال میں اپنا وظیفہ نصف شب سے قبل یا نصف شب تک پورا کر لینا ہوگا اور اس بات کا انحصار تیرے پڑھائی کی رفتار پر ہے جیسا کہ میں نے تجھے وظیفے کی تعداد بتادی ہے اس لئے اگر تو نے پہلی اور دوسری رات زیادہ سے زیادہ تعداد میں پڑھائی کی تو تیسری اور آخری رات تو وقت مقررہ تک یا اس سے پہلے اپنے ہدف کو پالے گا اور تجھے لازمی پہلی اور دوسری رات میں زیادہ سے زیادہ پڑھائی کرنی ہوگی۔'' بابا نے خاص ہدایت فرمائی۔

''ٹھیک ہے بابا! میں سمجھ گیا۔'' بابو نے سعادت مند بچوں کی طرح اقرار میں گردن ہلا کر کہا۔

''اب اس جاپ کی ایک اور اہم بات......؟'' بابا کے لبوں سے نکلنے والے جملے نے بابو کو مزید تن کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

''اس عمل کو انجام دینے کے لئے جگہ کا انتخاب بھی ایک اہم نقطے کی حیثیت رکھتا ہے کسی بھی جگہ بیٹھ کر تو یہ چلہ کاٹ نہیں سکتا اس چلے کو انجام دینے کے لئے ایسی جگہ درکار ہے جہاں تین راستے آن کر ملتے ہوں اور چوتھے راستے پر ایک قبرستان واقع ہو...... قبرستان تیری نظروں کے سامنے ہونا ضروری ہے اس لئے تجھے اس طرح بیٹھنا ہوگا کہ تیرے چہرے کا رخ قبرستان کی جانب ہو کیا تیرے علم میں ایسی کوئی جگہ ہے؟'' بابا کے سوال پر وہ سوچوں میں گم ہو گیا۔

''رہنے دے! شاید تیرے علم میں ایسی کوئی جگہ نہیں؟'' اس کی سوچ طویل ہوتے دیکھ کر بابا نے مداخلت ضروری سمجھی۔ ہمت ہار کر اس نے بھی مایوسی سے انکار میں گردن ہلا دی۔

''کوئی بات نہیں! تیرے علم میں نا سہی لیکن میرے علم میں ایسی ایک جگہ ہے جو یہاں سے کچھ ہی دور واقع ہے۔'' بابا نے مسکراہٹ بکھیری۔

''سچ بابا!'' وہ بے حد خوش ہو کر بولا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اپنے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے ایک خیال اسے چونکا گیا۔

''کیا وہ جگہ بھی اس جگہ کی طرح ویران و غیر آباد ہے؟'' بابو نے اپنے خیال سے آگاہ کیا۔

''تو کیا تو آبادی کے درمیان بیٹھ کر چلہ کاٹے گا۔ نادان لڑکے! ہوائی مخلوق کو قابو کرنے کے تمام عملیات ویران و غیر آباد جگہوں پر ہی انجام دیئے جاتے ہیں جہاں کوئی انسان تیری راہ کی رکاوٹ نہ بنے یا دوران چلہ کشی تجھے پریشان نہ کرے۔'' بابا کو غصے نے آن گھیرا وہ چت سا ہو کر رہ گیا۔

اگر تو نے کل رات سے اس چلے کو انجام دینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے تو ابھی اسی وقت میرے ساتھ چل میں تجھے وہ جگہ دکھادوں۔'' بابا اپنی مخصوص جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ہوا ہی تھا کہ بابا کے پیروں پر نظریں پڑتے ہی بابو چونک سا پڑا۔ خدا جانے یہ بابو کا وہم تھا، فریب نظر تھا کہ حقیقت؟ کہ اسے لگا جیسے برگد والے بابا کے پیر زمین کی سطح کو چھو نہ رہے ہوں...... زمین کی سطح سے چند انچ بلند ہوا میں معلق ہو، یعنی بابا کے پیروں اور زمین کے درمیان چند انچ کی غیر محسوس خلا تھی جو توجہ دینے پر ہی دکھائی دیتی اور بابو کی توجہ اتفاق سے اس خلاء کی جانب مبذول ہو کر رہ گئی تھی۔

اس سے پہلے کہ بابو اس بارے میں بابا سے کوئی سوال کرنے کے لئے اپنے لبوں کو حرکت دے پاتا بابا نے اس کی جانب سے رخ پھیر کر چلنا شروع کر دیا بابو نے اپنے پورے ہوش وحواس کے ساتھ یہ دیکھا کہ بابا کے قدم حرکت نہیں کر رہے تھے لیکن اس کے باوجود وہ آگے ہی آگے اس طرح بڑھے چلے جا رہے تھے جیسے کوئی نادیدہ قوت انہیں اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر اٹھائے چلی جا رہی ہو۔

''میرا ہاتھ پکڑ لے اور اپنی آنکھیں بند کر لے۔'' بابا نے اسے مخاطب کر کے کہا اس نے فوراً سے بھی پہلے بابا کے حکم کی تعمیل کی اور ان کے سرد ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ لیا ویسے بھی تاریکی کے باعث اسے نا تو راستہ دکھائی دے رہا تھا اور نا ہی وہ یہ اندازہ لگا پا رہا تھا کہ وہ کس سمت جا رہا ہے؟ چاند کی روشنی بھی ناکافی تھی۔

بابا کا ہاتھ تھامتے ہی اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کے پیروں کو بھی کسی نادیدہ قوت نے اپنی ہتھیلیوں پر اٹھا لیا ہو آنکھیں بند ہونے کے باوجود وہ اپنی منزل کی جانب نہایت سہولت سے بڑھے چلا جا رہا تھا، اسے وقت کا کچھ اندازہ نہ تھا لیکن اتنا ضرور تھا کہ وہ اپنی مطلوبہ جگہ پر چند لمحوں کے اندر پہنچا دیا گیا تھا۔

''آنکھیں کھول کر اس جگہ کو ذہن نشین کر لے کل تجھے اسی جگہ آ کر چلہ کاٹنا ہے۔'' بابا کی آواز پر اس نے آنکھیں کھول کر اپنے اطراف کا بغور جائزہ لیا۔

بابو نے دیکھا کہ وہ جگہ چلے کے لئے ہر لحاظ سے نا صرف موزوں ومناسب تھی بلکہ چلے کی تمام شرائط پر پوری اترتی تھی۔ اس جگہ کی سب سے اہم اور خاص بات یہ تھی کہ یہاں تاحد نظر کوئی انسانی آبادی نہ تھی بلکہ کسی اور جاندار کا وجود بھی تا حال دکھائی نہ دے رہا تھا۔

بابو کو حیرت نے آن گھیرا کہ ایسی کسی جگہ کا علم اسے کیوں نہیں تھا؟ بہر حال وہ یہ سوچ کر بے حد خوش ہو رہا تھا کہ اس جگہ چلہ کشی کرنے سے وہ کسی کی نظر میں نہیں آئے گا۔

''کیا تو نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ قدرت تیرے راستے میں حائل رکاوٹیں از خود دور کیے دے رہی ہے۔'' بابا کی آواز پر وہ اپنی سوچوں سے دامن چھڑاتے ہوئے بابا کی جانب مڑا۔

مڑا ہی تھا کہ لمحے بھر کے لئے اس کا سانس رک سا گیا اور وہ اپنی جگہ بے جان مجسمے کی مانند کھڑا کا کھڑا رہ کر بابا کے وجود کو گھورتا رہ گیا جو محض ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''ڈرنے کی ضرورت نہیں یہ میں ہی ہوں۔'' ڈھانچے کا جبڑا حرکت میں آیا اور اس کے لبوں سے بابا کی آواز برآمد ہوئی۔

''یہ تیری ایک اور آزمائش تھی...... جس میں تو نوے فیصد کامیاب رہا ایک بار پھر کہے دیتا ہوں اپنا دل مضبوط رکھنا، آگے کا سفر نہایت ہی

پرخطر اور دہشت انگیز ہے۔'' ڈھانچے نے کہا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا ہڈیوں سا وجود گوشت پوست کے وجود میں تبدیل ہونے لگا اب بابو کی نظروں کے سامنے ایک بار پھر برگد والا بابا کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''بابا! یہ جگہ میرے رہائشی علاقے سے کتنی دور واقع ہے؟'' بابو نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔

''شاید پچپن کلومیٹر یا اس سے کچھ کم زیادہ۔'' بابا کے لبوں سے اتنے فاصلے کا سن کر وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا اس کے خیال سے وہ یہاں چند لمحوں کے اندر پہنچا تھا۔

''کل رات گیارہ بجے سے قبل تو اسی جگہ پہنچ جانا اور گیارہ بجتے ہی اس جگہ یعنی چاروں اطراف کے مرکز میں حصار کھینچ کر وظیفے کا آغاز کر دینا۔'' بابا نے حصار کی جگہ کی نشان دہی فرماتے ہوئے کہا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''جب تک تو اپنا تین راتوں کا عمل کامیابی سے انجام نہ دے ڈالے اس چلے سے متعلق کسی کو کچھ نہیں بتانا ہے بلکہ یہ بات بھی اپنی زبان پر نہیں لانا کہ تو اس جگہ بیٹھ کر کوئی چلہ کاٹ رہا ہے کیونکہ اگر یہ بات زبان زد عام ہوگئی تو تجھے اس چلے کو انجام دینے سے روکنے کے لئے تیرے یار دوست تجھے سمجھانے اور ڈرانے کے لئے دوڑے چلے آئیں گے یعنی کہ تیری ہمت و حوصلے کو توڑنے کی کوشش کریں گے اس لئے کسی کو اعتماد میں لینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' بابا نے اسے سختی سے ہدایت کی کہ وہ حسب عادت سعادت مند بچوں کی طرح اقرار میں گردن ہلاتا رہا۔

''میری کامیابی کے لئے دعا کرنا بابا۔'' بابو نے بابا کے قدموں کو چھونے کے لئے جھکتے ہوئے کہا اور اس بار بابو نے بے حد قریب سے یہ دیکھا کہ بابا کے پیر زمین کو نہیں چھو رہے تھے۔

''میری دعائیں تیرے ساتھ ہیں۔'' بابا نے اس کے جھکے ہوئے سر پر دست شفقت رکھا۔

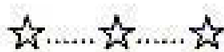
''بابا! چلے میں کامیابی کے بعد میں آپ سے کہاں ملوں؟'' بابو نے سوال کیا۔

''برسوں سے میرا ایک ہی ٹھکانہ ہے۔ برگد کا وہ درخت، وہ درخت ہی میری پہچان ہے اور وہ درخت ہی میرا گھر ہے تیری زندگی رہی اور تو چلہ کاٹنے میں کامیاب رہا تو تین راتوں کے بعد مجھ سے ملنے میرے ٹھکانے یعنی برگد کے درخت والی جگہ پر آ جانا، اب میں چلتا ہوں میرا وقت ہو چلا ہے۔'' بابا نے اپنی بات مکمل ہی کی تھی کہ اگلے ہی لمحے ایک دم سے بابا کا وجود اپنی جگہ کھڑے کھڑے ہی غائب ہو کر رہ گیا۔

وہ حیرت زدہ ہی رہ گیا۔''اب تو اپنے پیروں پر چل کر اپنے گھر تک جا۔'' اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ہوا اس کے کان میں یہ سرگوشی کرتی گزر گئی ہو۔

بہرحال جس جگہ اس وقت وہ کھڑا تھا وہاں سے اپنے گھر تک وہ آسانی ایک ڈیڑھ گھنٹے کی پیدل مسافت طے کر کے پہنچ سکتا تھا۔ اس نے خوشی خوشی اپنے گھر کی سمت قدم بڑھانے شروع کر دیئے۔

بہرحال پسینے سے شرابور جب وہ اپنے گھر پہنچا تو اپنی پیاس بجھانے کے بعد وہ بے دم سا ہو کر اپنے بستر پر جا گرا اور گرتے ہی نیند کے گہرے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔



صبح جب زلفاں بیگم اسے بیدار کرنے اس کے کمرے میں آئی تو اسے ہر غم وفکر سے بے نیاز گہری نیند میں غرق پا کر گہرے دکھ نے آن گھیرا۔ وہ بولی۔

''اب اٹھ جا! ہٹا کٹا اور تندرست وجوان مرد ہو کر سارا دن گھر میں پڑا سوتا رہتا ہے تجھے بے زاری نہیں ہوتی...... ارے اسی نحوست سے گھر کی روزی سوکھتی ہے گھر سے خیر وبرکت اٹھ جاتی ہے۔'' زلفاں بیگم نے اسے کاندھے سے ہلا کر اس کی گہری نیند کو تہس نہس کر ڈالا۔ اس نے ناگواری سے ماں کی جانب دیکھا اور اٹھ کر غسل خانے میں جا گھسا۔

جب وہ غسل خانے سے نکلا تو زلفاں بیگم نے اس کے آگے ناشتہ لگا دیا۔ پھر بولی۔ ''اب بھی وقت تیری مٹھی میں ہے ہمارے لئے نا سہی اپنے لئے ہی کچھ کر لے۔'' زلفاں بیگم کہتی رہی اور وہ سنی ان سنی کئے ماں کے ہاتھوں کے بنے لذیذ پراٹھوں سے انصاف کرتا رہا اس نے ایک بار بھی غلطی سے ماں کی بات پر توجہ دینے کی کوشش نہیں کی۔

''مدیحہ کا کل گاؤں سے فون آیا تھا...... ملک صاحب کے گھر کا ٹیلی فون نمبر تیرے ابا نے اسے دیا تھا تا کہ وہ اپنی خیریت سے ہر دو تین دن بعد آگاہ کرتی رہے اس نے ایک بڑی عجیب بات کل بتا کر ہمیں بھی پریشان سا کر کے رکھ دیا۔'' زلفاں بیگم کو موضوع سے ہٹتے اور اپنے پسندیدہ موضوع کی جانب آتے دیکھ کر وہ بے زاری سے ایک لمبا سانس خارج کر کے رہ گیا۔

''اس نے بتایا کہ ثریا جب سے یہاں سے گئی ہے اس نے چپ اختیار کر رکھی ہے، نا تو کسی سے کوئی بات کرتی ہے اور نا ہی کسی کی کسی بھی بات کا کوئی جواب دیتی ہے...... کھانا بھی برائے نام کھاتی ہے اور سارا دن اپنے کمرے میں لیٹی چھت کو گھورے جاتی ہے گاؤں کے پیش امام کا یہ کہنا ہے کہ اس پر کسی آسیب کا سایہ پڑ گیا ہے جبکہ گاؤں کے حکیم اور ڈاکٹر کا یہ کہنا ہے کہ کسی صدمے نے اس کی قوت گویائی پر اثر ڈالا ہے اللہ رحم کرے! میرا دل جانے کیوں گھبرا رہا ہے؟'' زلفاں بیگم کے لہجے میں بسی پریشانی بابو کے لبوں پر مسکراہٹ سجا گئی۔

''ارے ہاں! یاد آیا مدیحہ فون پر بتا رہی تھی کہ رمضان نے کہا ہے کہ اگر بابو کو کوئی اچھی اور پکی نوکری نہیں مل پا رہی تو وہ بابو کو اپنا ذاتی کاروبار کھول کر دینے یا کاروبار کے لئے پانچ لاکھ روپے نقد دینے کو تیار ہے۔'' زلفاں بیگم کے لہجے میں پوشیدہ خوشی بابو سے چھپی نہ رہ سکی۔

''اچھا! اور اس کی شرائط کیا کیا ہیں؟ کیونکہ بنا کوئی شرط عائد کئے وہ مجھے اپنا بخار تک نہیں دینے والا۔'' بابو جل کر رہ گیا۔

''شرط تو کوئی نہیں بتائی ہے صرف اتنا کہا ہے کہ پانچ لاکھ روپے نقد ثریا کی رخصتی کے وقت اپنے ہاتھوں سے تجھے دے گا۔'' زلفاں بیگم نے بیٹے سے نگاہیں چراتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ شرط نہیں تو اور کیا ہے؟''

''اگر وہ مجھے دو دن کے اندر بیس لاکھ روپے نقد دے سکتا ہے تو میں ثریا کو اپنی بیوی بنانے کو تیار ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ دو دن کے اندر بیس لاکھ روپے نقد مجھے پہلے ادا کرنے ہوں گے کیونکہ پانچ یا دس لاکھ میری ضرورت نہیں ہے میری ضرورت پورے بیس لاکھ روپے ہیں ابھی جا کر اس سے فون پر بات کر کے اسے میری شرط بتا دو اگر اسے منظور ہے تو مجھے بھی ثریا سے شادی کرنے پر کوئی اعتراض نہیں۔'' بابو نے غصے اور روانی میں کہا۔

''وہ اتنی بڑی رقم کہاں سے لا کر تجھے دے گا؟ یہ جو پانچ لاکھ روپے وہ تجھے کاروبار کرنے کے لئے دے رہا ہے وہ بھی اپنی تمام زمینیں اور کھیت گاؤں کے وڈیرے کے پاس ایک سال کے وعدے پر گروی رکھوا کر دے رہا ہے......اور یہ سب وہ اپنی بہن کی محبت میں اور اسے ہمیشہ خوش دیکھنے کے لئے کر رہا ہے۔ ہر بھائی تیری طرح پتھر دل نہیں ہوتا۔'' زلفاں بیگم کو یہی دکھ مارے ڈال رہا تھا۔

''تو کیا سمجھتی ہے ماں؟ کیا میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے کسی آسمانی مدد یا رمضان کی مدد کا منتظر بیٹھا ہوں؟ میں کچھ بھی نہیں کر رہا؟'' بابو نے ماں کی اداس آنکھوں میں اپنی جذبے سے بھرپور آنکھیں ڈال کر کہا۔

''تو کیا کرنے جا رہا ہے بابو؟ تیری باتیں سن کر تو میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔'' زلفاں بیگم اپنے اندیشے کو زبان سے ادا کرنے پر مجبور ہو گئیں حقیقت بھی یہی تھی بابو کی باتیں سن کر اس کی چھٹی حس ایک دم سے بیدار ہو کر کسی آنے والے خطرے سے پیشگی مطلع کرنے کا کام انجام دینے لگی تھی۔

''اماں! اماں کیوں؟ کیوں تم لوگ زبان سے اچھی بات نہیں کرتے ہو...... جب منہ کھولو گے کوئی بری بات ہی منہ سے نکالو گے......لکیر کے فقیر بنے بیٹھے ہو مایوسیوں کے اندھیرے میں رہنے والے مایوس لوگ مایوسی کے انہی اندھیروں نے تم لوگوں کے وجود نگل رکھے ہیں......تم لوگوں کو اپنے اندر جذب کئے رکھا ہے اسی لئے تم لوگوں کی زبان سے صرف مایوسی کی باتیں ادا ہوتی ہے اور اپنی انہی باتوں سے تم لوگ دوسروں کے حوصلے و ہمت کو بھی پست کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہو۔'' بابو کو ایک دم سے شدید غصے نے آن گھیرا وہ زلفاں بیگم کے قریب سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے غصے کا اظہار کرنے لگا۔

''میں نے کہیں چوری کرنے، ڈاکہ ڈالنے یا کسی بینک کو لوٹنے کا پروگرام نہیں بنا رکھا ہے میں جو کچھ کرنے جا رہا ہوں اپنی ہمت کے بل بوتے پر کرنے جا رہا ہوں اور جو حاصل کروں گا اپنی بہادری و ہمت کی وجہ سے ہی حاصل کروں گا۔''

''ارے پاگل! کوئی ماں باپ اپنی اولاد کو بد دعائیں نہیں دیا کرتے......اگر تو کوئی اچھا کام کرنے جا رہا ہے تو یہ ماں کی دعا ہے کہ اللہ تجھے کامیاب کرے۔'' ''آمین'' لیکن اگر تو کوئی غلط کام کرنے جا رہا ہے تو یہ ماں یہی کہہ سکتی ہے کہ ''اللہ تجھے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔'' ''آمین۔'' زلفاں بیگم نے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے بابو کے لئے دعا طلب کی۔

☆......☆......☆

مغرب کی اذان سے چند لمحات قبل بابو نے غسل کر کے سفید رنگ کا بے داغ شلوار قمیض زیب تن کیا اور اپنے وجود پر خوشبو کا چھڑکاؤ کر کے کچھ ضروری چیزیں اٹھائے اپنی منزل کی جانب چل پڑا۔

ہر طرف ویرانی سی چھائی ہوئی تھی، سناٹا چیخ رہا تھا اور دور دور تک اس کے علاوہ کوئی متنفس موجود نہ تھا اس کا دل بری طرح دھڑک اٹھا اپنے اکیلے پن کے خیال سے ہی اس کے دل کی دھڑکنیں منتشر ہونے لگیں اور جب اس نے اپنا وجود گھما کر اپنی نگاہوں کا زاویہ قبرستان کی جانب مرتکز کیا تو اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

''خوف کو کسی بھی صورت میں اپنے اوپر حاوی ہونے مت دینا۔'' برگد والے بابا کے الفاظ یاد آتے ہی اس نے اپنا سر جھٹک کر اپنے آپ کو خوف کے پنجرے سے آزاد کیا اور اپنے دل کو مضبوط کرنے لگا۔

''نہیں! میں خوف کو اپنے اوپر حاوی ہونے نہیں دوں گا یہ خوف میرا دشمن ہے اور بابو کسی دشمن کی گرفت میں نہیں آسکتا۔'' یہی وہ خیالات تھے جو اس کے دل و دماغ کو ہر قسم کے ڈر و خوف ناک نظاروں کے خیال سے آزاد کر گئے۔

اس نے بآواز بلند اللہ کے پاک نام سے اپنے عمل کا آغاز کیا۔ چند لمحات تک تو اس نے اپنی آواز بہت دھیمی رکھی پھر آہستہ آہستہ ہر گزرنے والے لمحے کے ساتھ بالکل غیر محسوس طور پر اس کے پڑھنے کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی اور مزید چند لمحوں کے اندر اس کی آواز گونج کر دور تک پھیلتی چلی گئی۔

جوش جنوں میں وہ پڑھنے میں اس بری طرح مگن ہوتا چلا گیا کہ خوب لہک لہک کر اس طرح پڑھتا رہا جیسے پرائمری کلاس کا کوئی بچہ سزا کے خوف سے پہاڑے رٹے جاتا ہے۔

اپنے اسی انہماک میں اسے وقت گزرنے کا احساس تک ہونے نہیں پا رہا تھا جانے کتنا وقت یا لمحات گزر چکے تھے کہ اس نے ایک بار بھی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈال کر وقت دیکھنے کی زحمت گوارہ نہ تھی۔

شاید وہ اسی طرح اپنے اطراف سے بے نیاز بے خوف و خطر پڑھائی کئے جاتا کہ اس کی آواز کی گونج نے ہوائی مخلوق کی پرسکون زندگی میں ایک انتشار سا برپا کر کے رکھ دیا۔ فضا میں ایک بے چینی سی پھیل کر رہ گئی، نامعلوم سا اضطراب کروٹیں لینے لگا اور ایک غضب ناک آواز نے ماحول کو لرزا کر رکھ دیا۔

''اسے روکو!'' بادل گرجے تھے یا بجلی کڑکی تھی ایک انتہائی دہشت ناک مردانہ آواز بابو کی سماعتوں سے آن کر ٹکرائی اور وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اس طرح ہل کر رہ گیا جیسے کسی نادیدہ قوت نے اسے ایک دم سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہو۔

''یہ آواز کہاں سے بلند ہوئی؟'' اس نے دل میں سوچا اور چند لمحوں کے لئے پڑھائی روک کر اپنے اردگرد نگاہیں دوڑائیں اور حیرت سے آواز کے وجود کی کھوج کرنے لگا۔

آواز کا وجود تو اسے کہیں دکھائی نہ دیا لیکن اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے ایک دم سے اس کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔

بظاہر اس کے ارد گرد وہی سناٹا اور خاموشی سی پھیلی ہوئی جو جانے کتنے برسوں سے اس جگہ کا مقدر بنی ہوئی تھی اور جو زندہ انسانوں کے دل دہلا کر رکھ دینے کی بھرپور صلاحیت سے مالا مال تھی لیکن......؟ اس کے باوجود اسے اپنے اطراف ایک ان دیکھی افراتفری کا احساس شدت سے ہو رہا تھا یوں جیسے ایک دم سے اس کے اطراف زندگی متحرک ہو حالانکہ بظاہر دور دور تک کسی ذی روح کا کوئی وجود نہ تھا۔

اس نے دوبارہ وظیفہ پڑھنے کا آغاز ہی کیا تھا کہ "بابو! ارے او بابو۔"

"بابو! یہ کیا کر رہا ہے کم بخت؟ کیا یہ سب کرنا باقی رہ گیا تھا؟ اٹھ گھر چل میں معصومہ کو اپنی بہو بنانے کے لئے تیار ہوں چل اٹھ! گھر چلیں۔"

اپنے ابا یعنی عبداللہ کی آواز پر جونہی اس نے چہرہ اٹھا کر اپنے سامنے دیکھا عبداللہ کو اپنے سامنے کھڑے پا کر وہ حیرت زدہ رہ گیا اور بنا پلک جھپکے عبداللہ کو دیکھتا رہ گیا۔

"تو میری اولاد ہے...... تیری رگوں میں میرا خون دوڑ رہا ہے میں تجھے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا اگر تیری خوشی کے لئے مجھے جانم کے ہاتھ پاؤں بھی جوڑنے پڑ گئے تو میں ایسا بھی کرنے کو تیار ہوں لیکن یہ سب کر کے تو مجھے دکھ مت پہنچا آجا میرے بچے! میرے پاس آ۔"

عبداللہ کے لہجے سے تو اس کے لئے محبت کی چاشنی ٹپک رہی تھی لیکن نگاہوں میں دہکتے انگارے اور چہرے سے برستی وحشت نے بابو کو اس کے جال میں پھنسنے سے منع ہی رکھا۔

"نہیں! ابا یہاں نہیں پہنچ سکتا یہ میرا ابا نہیں ہو سکتا۔" بابو نے اپنے آپ کو سمجھایا اپنے دل کو مضبوط کیا اور اپنی نگاہوں کا زاویہ سامنے مرکوز کر دیا یہ الگ بات ہے کہ اس کے دل کی دھڑکنیں اپنی معمول کی رفتار سے کچھ زیادہ تیز دھڑک رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے! میں جا رہا ہوں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ تو نے میرے من کو بہت دکھی کیا ہے۔" عبداللہ کی آواز پھر بلند ہوئی لیکن اس نے نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھنا گوارہ نہ کیا تاہم وہ محسوس کر سکتا تھا کہ عبداللہ نے جانے کے ارادے سے اپنا رخ بدل لیا تھا۔

اس نے یونہی لمحے بھر کے لئے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق عبداللہ کا وجود لمحے بھر کے اندر غائب ہو چکا تھا۔

اس نے نگاہیں جھکا کر پڑھائی شروع کر دی اس کی زبان سے وظیفے کے مخصوص الفاظ ادا ہوتے رہے ہاتھوں کی انگلیاں تیزی سے متحرک تسبیح کے دانوں کو آگے بڑھاتی رہیں۔

لمحے ایک کے بعد ایک سست روی سے گزرتے رہے۔ بابو نے سرتاپاؤں خود کو پڑھائی میں الجھا کر رکھ دیا۔

"بابو تو یہاں ہے؟ میں نے تجھے کہاں کہاں تلاش نہیں کیا میرے یار؟" ابھی اس نے خود کو سنبھالا ہی تھا کہ لٹو کی آواز پر ایک بار پھر بے اختیار نگاہیں اٹھا کر دیکھنے پر مجبور ہو گیا اور اپنی نگاہوں کے سامنے اپنے دوست لٹو کو کھڑے پا کر بے اختیار اس کا چہرہ کھل اٹھا اور لبوں پر مسکراہٹ آن ٹھہری۔

"لٹو! میرے یار تو یہاں۔" وہ بولنا چاہتا تھا لیکن جانے کیوں اس کی زبان سے الفاظ ادا نہ ہو سکے۔

"بابو! تجھے سنائی نہیں دے رہا ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ ارے بے رحم تیری ماں اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہے وہ تجھے یاد کر رہی ہے میرے بھائی جلدی چل کہیں تجھے دیکھنے کی حسرت لئے ان کا دم ہی نہ نکل جائے۔" لٹو کے لہجے میں التجائیں چیخ رہی تھیں وہ بابو کے

آ گے اپنے ہاتھ جوڑے رونے لگا۔

''چل بابو چل...... خالہ مرجائے گی وہ تجھے آخری بار دیکھنا چاہتی ہے دیکھ میں نے تیرے آگے اپنے ہاتھ جوڑ رکھے ہیں چل آ میرے ساتھ چل! شاید تجھے دیکھ کر خالہ پھر سے جی اٹھے۔''

لٹو کے لہجے میں بسی التجائیں، اس کے آنسو اور زبان سے ادا ہونے والے کرب انگیز الفاظ نشتر بن کر اس کے دل میں پیوست ہوتے رہے وہ تڑپ کر رہ گیا ماں کی محبت ایک دم سے اس کے دل کو بے قرار کرنے لگی اس کے پورے وجود میں نامعلوم سا اضطراب کروٹیں لینے لگا اور اس سے پہلے کہ جذبات کا منہ زور ریلا اسے حقیر تنکے کی مانند بہا کر اپنے ساتھ لے جاتا لٹو کے چہرے سے نگاہیں ہٹاتے ہی اسے اپنا دماغ ایک دم سے اس طرح ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ از خود سرک سا گیا ہو۔

''یہ لٹو نہیں ہے بابو! یہ لٹو کے بہروپ میں شاید کوئی بدروح ہے۔ تجھے اس کے مکروفریب کے جال میں نہیں پھنسنا ہے برگد والے بابا نے بھی یہی کہا تھا کہ تجھے وظیفہ مکمل کرنے سے روکنے کے لئے آسیب کسی بھی شکل میں وارد ہوتے رہیں گے۔'' بابو کے اندر سے آواز آئی۔

''نہیں میں ان مخلوق کے مکروفریب کے جال میں نہیں پھنسوں گا لٹو کو کیا معلوم کہ میں اس جگہ بیٹھ کر کوئی چلہ کاٹ رہا ہوں؟ مجھے یقین ہے یہ لٹو نہیں ہے میں اب اس کی جانب نہیں دیکھوں گا اور نا ہی اس کی کسی بات پر توجہ دوں گا مجھے اپنی ساری توجہ وظیفے پر دینی چاہئے۔'' وہ اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے علاوہ خود کو خود ہی حوصلہ دیتا رہا۔

''میرے یار میں لٹو ہی ہوں...... خالہ کی طبیعت اچانک سے بگڑ جانے کے باعث میں بابا سے تیرا پتہ پوچھتا ہوا بڑی مشکلوں سے یہاں تک پہنچا ہوں...... اگر تجھے یقین نہیں آتا ہے تو اس طرف دیکھ! وہاں وہ سواری کھڑی ہے جس پر بیٹھ کر میں یہاں تک پہنچا ہوں۔'' لٹو کی آواز پر اس نے گردن اٹھا کر دیکھنا گوارہ نہ کیا اور لٹو کی آواز پر سے اپنی توجہ ہٹانے کے لئے وہ بآواز بلند پڑھائی کرتا رہا۔

''میں تیرے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' ایک دم سے لٹو کا لہجہ انتہا سے زیادہ بھیانک ہو کر رہ گیا وہ باؤلے کتے کی مانند غراتے ہوئے بندوق سے نکلی گولی کی سی رفتار سے اس کی جانب لپکا اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ بابو کا گلا دبانا چاہتا ہو۔

بابو کا پورا وجود اس طرح سن سا ہو کر رہ گیا جیسے کسی نادیدہ قوت نے اسے برف کی سلوں کے درمیان مقید کر ڈالا ہو۔

خوف کے باعث اس کے چہرے کی سرخی پرواز کر گئی اور وہ گوشت پوست کا زندہ انسان ہونے کے باوجود پتھر کے مجسمے کی تصویر بن کر رہ گیا اور اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں کی پتلیوں سے لٹو کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔

اف خدایا! لٹو کے چہرے کا بھیانک پن کسی بھی کمزور دل انسان کی فوری موت کا سبب بن سکتا تھا لیکن بابو پتھر بنا اپنی جگہ بیٹھا اسے اپنی جانب بڑھتے دیکھتا رہا اور اس سے پہلے کہ لٹو کے ہاتھ بابو کی گردن تک پہنچ پاتے؟ بے اختیار اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے کی حفاظت کے لئے اپنے چہرے کے آگے کر لئے اور ایک ڈری ڈری سی گھٹی ہوئی چیخ بابو کے ہونٹوں کا قفل توڑتی اور پھڑپھڑاتی ہوئی آزاد ہو کر رہ گئی اس نے سختی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اور لمحات سرکتے چلے گئے۔ جب کئی لمحات تک کوئی ہاتھ اس کی گردن تک نہیں پہنچا تو اس نے ڈرتے ڈرتے اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنے سامنے کی سمت دیکھا۔

دیکھا ہی تھا کہ حیرت نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا لٹو کا بہروپ بھرنے والا وہ وجود زمین پر گرا کرب واذیت کی انتہائی زیادتی کے باعث ماہی بے آب کی مانند تڑپ رہا تھا اس کے دونوں ہاتھوں کے پنجے کلائی کی جانب سے اس طرح لٹکے ہوئے تھے جیسے کسی قوت نے اس کے دونوں ہاتھوں کی ہڈیاں کلائی کے جوڑ سے توڑ کر رکھ دی ہوں۔

وہ بدستور لٹو ہی کی شکل وصورت میں تھا لیکن اس کے چہرے پر چھائی وحشت وبربریت میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ بابو کے لئے اس کے دہشت ناک چہرے کی جانب دیکھنا مشکل ہو رہا تھا وہ بے آواز تڑپے جا رہا تھا اور اس کی خونخوار نگاہیں بار بار بابو کی جانب اٹھتیں بابو کے دل کو دھڑکائے دے رہی تھیں۔

''میں تجھے نہیں چھوڑوں گا...... تیری وجہ سے میرے ہاتھ ٹوٹے ہیں میں تیرے ہاتھ توڑوں گا۔'' اذیت کے باعث ایسی بھیانک ترین آواز لٹو کے لبوں سے آزاد ہوئی کہ بابو کے دماغ کی رگیں پھڑک اٹھیں۔

لٹو کے لبوں سے آزاد ہونے والی نفرت انگیز اور وحشت انگیز چیخ وپکار نا صرف سناٹے کو مجروح کیے دے رہی تھی بلکہ اس کے اعصاب پر بھی برا اثر مرتب کر رہی تھی اس کی نفرت انگیز چیخ وپکار سے اپنے دماغ کی رگوں اور کانوں کے پردوں کو محفوظ رکھنے کے لئے اس نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے اپنے کان داب لئے مکمل طور پر نا سہی لیکن کچھ تو دماغ کو سکون میسر آیا۔

''میں نے کہا تھا نا کہ زیادہ جذباتی مت ہونا...... غصے کو اپنے اوپر حاوی ہونے نہیں دینا اپنے آپ کو قابو میں رکھنا لیکن تو نے میری بات پر عمل نہیں کیا...... دیکھ لیا نا نتیجہ؟'' ایک دم سے ایک اور انسان کا وجود از خود ظاہر ہوا۔ نو وارد کا مخاطب لٹو کا ہم شکل تھا اس کے لب ولہجے میں بھی بادل سے گرجتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

''چل اٹھ! اس انسان زادے سے ہم بعد میں نمٹ لیں گے۔'' دوسرے وجود نے اپنی دہکتی ہوئی لہو رنگ نگاہوں سے بابو کو نفرت و حقارت سے گھورتے ہوئے بھیانک ترین غراہٹ خارج کرتے ہوئے کہا اور رکوع کے سے انداز میں جھک کر لٹو کے ہم شکل کو اٹھ کر کھڑے ہونے میں مدد دینے لگا۔

''دیکھ لوں گا۔'' لٹو کے ہم شکل نے خوف ناک لہجے میں دھمکی دی۔

اور بابو کے دیکھتے ہی دیکھتے دونوں وجود دھواں سا وجود اختیار کیے فضا میں تحلیل ہو گئے۔

ان کے وجود کا غائب ہونا تھا کہ ماحول میں رچ بس جانے والی دہشت اور شور وہنگامے کا بھی ایک دم سے خاتمہ ہو کر رہ گیا ایک بار پھر گہری خاموشی کا راج قائم ہو گیا لیکن اس سناٹے وخاموشی میں بھی خوف کا عنصر بدستور موجود تھا۔

ایک نہ دو جب پورے پندرہ منٹ تک کسی بدروح کا نزول ہوا اور نا کوئی دہشت ناک آواز یا منظر نمودار ہوا تو بابو کے چہرے پر مسرت سی

ٹھاٹھیں مارنے لگی اور اس نے اپنی پڑھائی کی رفتار بھی بڑھا دی تا کہ جلد از جلد وہ آج کی رات کا وہ عمل اختتام پذیر کر کے اپنے گھر جا سکے اسے گھر کی یاد نے ایک دم سے بے چین کر ڈالا تھا۔

''بابو!'' یہ مترنم، سریلی اور دل کے تاروں کو چھیڑ کر رکھ دینے والی نسوانی آواز وہ سینکڑوں، لاکھوں یا کروڑوں میں تو کیا اربوں آوازوں میں سے بآسانی شناخت کر سکتا تھا۔ جی ہاں! یہ جادوئی آواز اس کی محبت، اس کی زندگی معصومہ کی تھی، یہی وجہ تھی کہ اس نے ایک جھٹکے سے گردن اٹھا کر بلکہ گردن گھما کر آواز کی سمت دیکھا جو اس کے دائیں جانب سے ابھری تھی۔

اسے مایوسی کا منہ نہیں دیکھنا پڑا دائیں جانب واقعی اس کی محبت معصومہ کھڑی اسے محبت لٹاتی نگاہوں سے گھورے جا رہی تھی۔

اس کے قدرتی گلابی ہونٹوں پر سجا تبسم بڑا ہی قاتلانہ محسوس ہو رہا تھا جانے یہ بابو کا فریب نظر تھا یا واقعی ایسی بات تھی؟ بابو کو وہ پہلے سے کئی زیادہ حسین، جاذب نظر اور پرکشش دکھائی دے رہی تھی۔

لیکن......؟ یہ اس کی معصوم پری، شرم و حیا کے لبادے میں رہنے والی معصومہ کو آخر کیا ہو گیا تھا؟ اس نے ایسا بے ہودہ لباس کیوں زیب تن کر رکھا تھا؟ جو اس کے قیامت خیز جسم کے پوشیدہ خزانوں کو ڈھانپے رکھنے کے بجائے نمایاں کر رہا تھا اور معصومہ کے بے مثال حسن کے یہی نظارے اس کے وجود میں ایک دم سے ایک ایسی آگ بھڑکا گئے جو اسے کھلے عام دعوت گناہ دے رہے تھے اسے اکسا رہے تھے کہ وہ حسن کے ان خزانوں کو آن کر لوٹے اور لذت محبت سے آشنا ہو کر اپنی آگ بجھا لے۔

''بابو میرے پیارے بابو'' اگلے ہی لمحے وہ بے حد سنجیدگی اور محبت سے چور چور لہجے میں گویا ہوئی۔

''میں نے تم سے محبت کی ہے بالکل سچی محبت میں صرف تمہاری ہوں اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے تم سے دور نہیں کر سکتی، چھین نہیں سکتی اور نا ہی ہمیں ایک ہونے سے روک سکتی ہے...... ختم کر دو یہ سب اور میرے قریب آؤ...... دیکھو! میں تمہاری محبت میں کھنچی کھنچی یہاں تک آن پہنچی ہوں کیا تم چند قدم چل کر میرے قریب نہیں آ سکتے؟'' معصومہ کے لہجے سے ٹپکتی محبت کی چاشنی اور اظہار محبت کا بے باک انداز مانو بابو کو پاگل کرنے لگے وہ خالی الذہن بیٹھا گم صم نگاہوں سے معصومہ کے حسن کو تکتا رہ گیا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ آؤ قریب آؤ وقت ضائع مت کرو یہ حسین رات اور خوب صورت لمحات اگر بیت گئے تو پھر سے لوٹ کر نہیں آئیں گے آج کی حسین رات مجھے اپنا بنا لو سر سے پاؤں تک میرے وجود پر اپنے لبوں سے مہر محبت ثبت کر ڈالو مجھے اپنی محبت کی بارش میں بری طرح بھگو کر رکھ دو...... یہ میرا وعدہ ہے میں بھی تمہیں ایسی محبت دوں گی کہ تم کبھی بھلا نہیں سکو گے آؤ میرے پیارے بابو آؤ! تمہیں تمہاری محبت کتنی محبت سے بلا رہی ہے آ بھی جاؤ اتنا مت تڑپاؤ'' معصومہ نے ایک دم سے اپنے برہنہ بازو کشادہ کر لئے۔

اس کی قاتل ادائیں، لہجے میں بسی محبت کی گاڑھی چاشنی، محبت کے میٹھے میٹھے بول اور سب سے بڑھ کر لال رنگ کی باریک سی ساڑھی میں ملبوس اس کا ہوشربا بدن! بابو کو دھیرے دھیرے اپنی گرفت میں کسنے لگا۔

وہ اٹھ کر اپنی معصومہ کے پاس جانا چاہتا تھا اس کا حسین سراپا اپنی بانہوں کی گرفت میں لے کر وہ آگ یا پیاس بجھانا چاہتا تھا جو پہلی بار

معصومہ کے بدن کو چھوتے ہی ایک دم سے اس شدت سے بھڑک اٹھی تھی کہ آج تک بجھنے نہ پائی تھی لیکن خدا جانے وہ کون سی قوت تھی جس نے اسے اس بری طرح اپنے شکنجے میں کس رکھا تھا کہ لاکھ چاہنے کے باوجود وہ اپنے وجود کو حرکت نہ دے پا رہا تھا، بس گوشت پوست کا زندہ مجسمہ بنا بیٹھا اپنی معصومہ کو محبت سے تکے جا رہا تھا۔

"آج تمہاری معصومہ تمہیں محبت کے ایک نئے ذائقے سے آشنا کرے گی تم سب کچھ بھول جاؤ گے یاد رہے گی تو صرف میری محبت! جو صرف اور صرف تمہارے لئے ہے۔" یہ کہتے ہی معصومہ نے اپنے وجود سے لپٹی ساڑھی ایک ادا سے اتارنا شروع کر دی۔

بابو کے جسم میں دوڑنے والے لہو کی گردش ایک دم سے تیز ہونے لگی، اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں اور رگ و پے میں سرور سا دوڑ لگانے لگا۔ حالانکہ معصومہ اس سے کئی قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی لیکن اس کے نیم برہنہ وجود کی آنچ بابو کو سر تا پاؤں پسینے میں شرابور کر گئی وہ خود کو کسی آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہوا محسوس کرنے لگا اور اس کے یہ محسوسات کچھ ایسے غلط بھی نہ تھے معصومہ کا حسن اور حسین بدن بھی کسی آتش فشاں سے کم نہ تھا پھر وہ کیسے اپنے آپ کو جھلسنے سے محفوظ رکھ پاتا۔

بابو کے ہوش و حواس بھی معصومہ کے حسن نے بھلا کر رکھ دیئے وہ اس کے حسن کے سحر کی گرفت میں بالآخر پھنس کر رہ گیا اور معصومہ کی محبت کی پکار اور اس کی زرخیز بدن کی چکا چوند میں اندھا ہو کر ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا وہ سحر زدہ سا تھا اس نے اپنا پہلا قدم آگے بڑھایا اس کی نگاہیں بدستور معصومہ کے جسمانی نشیب و فراز میں الجھی ہوئی تھیں اور سینہ کسی دھونکنی کی مانند تیزی سے پھول پھول کر پچک رہا تھا سرور انگیز جذبات کا حملہ بہت شدید تھا اور پھر جیسے ہی اس نے دوسرا قدم آگے بڑھانے کے لئے اپنے پیر متحرک کیا پانی سے بھری ایک پلاسٹک کی بوتل! جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور بیگ سے نکال کر اپنے ایک طرف رکھ لی تھی اس کے پیروں کی زد میں آ کر "دھب" سے زمین پر گر پڑی لمحے بھر کے لئے اس کی توجہ منقسم ہو کر رہ گئی اس نے چہرہ جھکا کر قدموں کی زد میں آئی چیز کی جانب دیکھا۔

دیکھا ہی تھا کہ اس کے دماغ کو شدید جھٹکا لگا...... معصومہ کے سحر کی دیوار کانچ کی دیوار کی مانند ایک چھناکے سے ٹوٹ کر بکھر گئی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا تھا لیکن دو قدم پیچھے ہٹ کر رہ گیا۔

"نن نہیں! یہ عورت معصومہ نہیں ہو سکتی۔" اس خیال کے آتے ہی وہ دوبارہ اپنی مخصوص جگہ پر، قبرستان کی جانب چہرے کا رخ کیے براجمان ہو گیا اس نے ڈوبتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے تسبیح تھامی اور نگاہیں سامنے مرکوز کر دیں لیکن یہ کیا......؟

عمل کے الفاظ اس کے ذہن سے نکل چکے تھے۔ معصومہ کی ہم شکل جنی کی شر انگیزی نے اس کے ذہن سے ہر بات اڑا کر رکھ دی تھی نا تو اسے وظیفے کے الفاظ یاد آ کے دے رہے تھے اور نا ہی یہ یاد آ رہا تھا کہ اس نے کیا پڑھنا ہے۔ حالانکہ اس نے الفاظ ذہن نشین کیے تھے جواب اسے یاد آ کے نہ دے رہا تھا۔

اس نے یونہی ایک سرسری نظر گردن گھما کر دائیں جانب دیکھ لیا دیکھا ہی تھا کہ خوف کی انتہائی زیادتی کے باعث اس کا دل بندر والے کی ڈگڈگی بن کر رہ گیا وجہ معقول تھی۔

معصومہ کا روپ دھار کر وارد ہونے والی مخلوق! اب اپنے اصل روپ میں آ چکی تھی جو اس قدر بھیانک تھا اگر بابو فوراً سے اپنی نگاہیں ہٹانے میں کامیاب نہ ہوتا تو افراط خوف سے اس کا دل بند ہو کر رہ جاتا جو اس کی فوری موت کا سبب بنتا۔

اس کے بال کانٹوں کی مانند کھڑے ہو چکے تھے، رنگت ڈامر کی طرح سیاہ اور ماتھے پر بھیانک و مکروہ ترین لکیروں کا جال سا بچھ کر رہ گیا تھا کہ ایک سالم مرغ نگل لے، آنکھیں چار گنا بڑی اور لہو کی سی سرخی سے لبریز تھیں اور وہ اپنی انہی لہو رنگ نگاہوں سے اسے اس طرح گھورے جا رہی تھی جیسے کسی بھی لمحے اس پر جھپٹ پڑے گی اور اسے زندہ چبا ڈالے گی۔

وہ شکار ہاتھ سے نکل جانے پر جس قدر غضب ناک ہو رہی تھی اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا تھا کہ اس کے موٹے لٹکے ہوئے بھدے ہونٹوں سے گرم گرم سانسیں کسی طوفانی ہوا سے مشابہہ خارج ہو رہی تھی سناٹے کے باعث اس کی سانسوں کے طوفانی زیرو بم کی آواز اک گونج سی لئے ہوئی تھی اور ماحول میں محسوسا تی تپش سی رچی بسی محسوس ہو رہی تھی۔

بابو کا دل اس قدر شدت سے دھڑک رہا تھا جیسے آخری بار دھڑک رہا ہو پھر کبھی نہ دھڑکنے کے لئے! اس کے جسم کے تمام مسامات سے پسینے کا منہ زور اخراج جاری تھا۔

''تجھے کہا بھی تھا اب کسی آواز پر متوجہ نہیں ہونا...... ادھر ادھر دیکھنے کی حماقت مت کرنا لیکن تو نے نہیں سنا'' اس کے اندر کے انسان نے اسے بری طرح ڈانٹا۔ وہ اپنے اندر کے انسان کی ڈانٹ بھی سنتا رہا اور الفاظ کو یاد کرنے کی کوشش بھی کرتا رہا۔

''اپنی سلامتی چاہتا ہے تو اب نگاہیں اٹھا کر کہیں بھی مت دیکھنا، کسی بھی آواز پر متوجہ نہیں ہونا ورنہ آج کی رات ہی تیرا فیصلہ ہو جائے گا جنات کی دہشت تجھے زندگی سے فارغ کر کے رکھ دے گی'' اس کے اندر سے آواز آتی رہی۔

پھر اچانک وظیفے کے الفاظ یاد آتے ہی اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور پڑھائی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

اس نے پڑھائی کا عمل اور تیز کر دیا۔ روانی سے پڑھتے ہوئے اس بات کا بھی دھیان رکھنا بے حد ضروری تھا کہ وظیفے کے الفاظ کی ادائیگی میں کسی قسم کی غلطی سرزد نہ ہو خصوصاً تلفظ کی درست ادائیگی اولین شرط تھی۔

ابھی بھی اس نے نصف تسبیح کا عمل ہی مکمل کیا تھا کہ ایک دم سے اس احساس نے اس کی توجہ بانٹ کر رکھ دی کہ اس کے اطراف بپھرتی ہوئی لہروں کا سمندر موجزن ہو اور اس کا پورا وجود بلکہ جس جگہ وہ بیٹھا تھا وہ جگہ دھیرے دھیرے اس طرح ہل رہی ہو جیسے وہ کسی ٹھوس زمین پر نہیں بلکہ سمندر کی سطح پر ربڑ کی ٹیوب پر بیٹھا پڑھائی کر رہا ہو...... اس کی سماعتوں سے آن کر ٹکرانے والی لہروں کی پرشور آواز نے اسے آنکھیں کھول کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

''شررر...... شرر...... شرر'' انتہائی خوفناک اور پرشور لہریں اس کے اطراف رقص کر رہی تھیں اپنے اطراف بپھرا ہوا سمندر دیکھ کر وہ بری طرح بوکھلا اٹھا۔

غیر یقینی اور حیرت و استعجاب میں مبتلا ہو کر اس نے ایک بار نہیں بلکہ کئی بار اپنے دائیں بائیں، آگے پیچھے گردن گھما کر دیکھا لیکن ہر طرف

ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہی پایا اور وہ خود سمندر کے بیچوں بیچ بیٹھا تھا۔

نا تو اس کی نگاہوں کے سامنے وسیع و عریض قبرستان تھا اور نا ہی تین اطراف کچے پکے راستے، ہر منظر ہی سرے سے غائب ہو کر رہ گیا تھا۔ کیا یہ وہی جگہ تھی جہاں اس نے حصار کھینچا تھا؟ یا کسی نادیدہ قوت نے اسے وہاں سے اٹھا کر سمندر کے درمیان لا کر بٹھا دیا تھا؟ لیکن برگد والے بابا نے تو کہا تھا کہ کوئی بھی غیبی قوت حصار کے اندر داخل ہونے کی جرأت ہرگز نہیں کر سکتی تو پھر وہ یہاں کیسے پہنچا؟

اس کا دل ڈوبنے لگا ڈوبتے دل کے ساتھ ایک بار پھر اس نے اپنے اردگرد نگاہیں دوڑائیں وہی منظر تھا یعنی تاحد نگاہ بپھرتا ہوا سمندر اور خوفناک و ہیبت ناک لہریں! سمندر کا سینہ اس طرح متحرک تھا جیسے کوئی بھیانک ترین عفریت سانس لے رہا ہو۔

اور لہروں کا کیا کہنا؟ لہریں بھی کسی ہیبت ناک عفریت کی مانند سمندر کے اندر سے اپنا وجود نمودار کرتی ہوئی آسمان تک بلند ہونے کے بعد انتہائی دہشت انگیز آواز کے ساتھ جھاگ اڑاتی ہوئی نیچے آن گرتیں اور ساحل سے جا ٹکراتیں ساحل سے ٹکرانے والی لہروں کا شور اس قدر زیادہ تھا کہ اس کے دل کی دھڑکنیں معمول سے زیادہ تیزی دکھانے لگیں وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اس وقت کس بات سے ڈر رہا تھا؟ ہاں اتنا وہ ضرور جانتا تھا کہ کسی انجانے خوف کے پنجے دھیرے دھیرے اس کے دل میں پیوست ہوتے جا رہے تھے کوئی نامعلوم سا ڈر اس کے اردگرد اپنا جال سا بنتا جا رہا تھا اور وہ غیر محسوس طور پر ڈر و خوف کے اس ان دیکھے جال میں پھنستے چلے جا رہا تھا۔

"یا اللہ! یہ سب کیا ہے؟ کیسا اسرار ہے؟ میں یہاں کیسے پہنچا؟ مجھے یہاں کون لایا؟ میں یہاں سے کیسے نکل پاؤں گا؟ یہ سمندر اور اس خوف ناک سمندر کی بھیانک ترین لہریں مجھے زندہ نگل لیں گی۔ اے اللہ! میری زندگی کی حفاظت فرما" وہ دعا مانگتے ہوئے ایک دم سے رو پڑا۔

"کہتے ہیں کہ ڈوبنے والے کے لئے تنکے کا سہارا بھی بہت ہے لیکن یہ پتلی سی چادر مجھے کب تک ڈوبنے سے بچائے رکھے گی؟" سمندر میں ڈوب کر مرنے کا تصور ہی اس قدر لرزہ خیز تھا کہ اس کا پورا وجود جھرجھرا کر رہ گیا لیکن صرف چند لمحوں کے لئے! اگلے ہی لمحے ایک اور خیال نے اس کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ بکھیر کر رکھ دی۔

جس پتلی سی چادر پر وہ براجمان تھا وہ کپڑے کی چادر تھی لیکن اس کے باوجود وہ ڈوبنے نہیں پا رہا تھا؟ یہاں تک کپڑے کی چادر سمندر کی سطح پر اس طرح بچھی پڑی تھی اور معمولی سی بھی بھیگنے نہ پائی تھی جیسے وہ سمندر کی سطح پر نہیں بلکہ زمین کی سطح پر بچھی پڑی ہو جبکہ وہ گہرے سمندر کے درمیان موجود تھا۔

چادر تو چادر اس کے وجود پر موجود لباس تک بالکل خشک تھا جبکہ اس کے اطراف لہروں کا جنونی رقص اور شور بدستور موجود تھے آخر کیوں؟ بپھری ہوئی خوفناک ترین لہریں بھی اس کے وجود کو چھوئے بغیر اس کے اطراف سے اسے بھگوئے بغیر گزر رہی تھیں؟

کیونکہ یہ سب اس کا فریب نظر تھا یا دوسرے اور آسان لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ اس کی نظروں کو فریب دیا جا رہا تھا اور یقیناً اس شرارت کے پیچھے بھی جنات کی کارستانی شامل تھی۔

اسے پختہ یقین ہونے لگا جو کچھ اسے دکھائی دے رہا تھا در حقیقت ویسا کچھ نہیں تھا اور اس خیال کے آتے ہی وہ ایک دم سے مطمئن ہو گیا

ہر قسم کا ڈر وخوف اس کے دماغ کی سلیٹ سے حرفِ غلط کی طرح مٹ کر رہ گیا۔

تاہم یہ الجھن بدستور موجود رہی کہ چند مختصر ترین لمحات کے اندر اتنی بڑی تبدیلی کیسے واقع ہو کر رہ گئی؟ وہ راستے کہاں غائب ہو گئے؟ وہ وسیع وعریض قبرستان کا وجود کیسے مٹ کر رہ گیا؟ اور سب سے اہم بات جو انتہا سے زیادہ حیرت انگیز اور ناممکنات میں سے تھی وہ یہ تھی کہ اس قدر وسیع سمندر کا وجود یہاں کیسے آن وارد ہوا؟ کیا جنات حقیقتاً اتنے طاقت ور ہوتے ہیں کہ وہ سمندر کی جگہ بھی بدل کر رکھ دینے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتے ہیں؟ یا انسان کی نگاہیں ایسا اتنا بڑا فریب کھا سکتی ہیں؟

ابھی وہ اس حیرت انگیز معمے کو حل بھی کر نہیں پایا تھا کہ اچانک ایک منحوس پرندے کی بھیانک ترین چیخ کی آواز نے اس کا دل دھک سے کر کے رکھ دیا ابھی وہ اپنے دل کو سنبھال بھی نہ پایا تھا کہ سمندر کے سینے سے ارتعاش سا برپا کرتا ایک عجیب وغریب وجود اپنا سر اٹھائے آہستہ آہستہ نمودار ہونے لگا وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے سمندر کے اندر سے برآمد ہونے والے اس عجیب وغریب وجود کو تکتا رہ گیا اس وجود کے ظاہر ہوتے ہی اطراف میں رقصاں لہروں پر بھی ایک جنون سا سوار ہو گیا اور ہر طرف لہریں پر شور آواز میں اپنا طوفانی رقص پیش کرنے لگیں ان لہروں کے شور کی آواز اس قدر دہشت ناک تھی جیسے عذاب کے دیوتا کسی گناہ گار کو اذیت پہنچاتے ہوئے اپنی پوری شدت سے چیخ وچلا رہے ہوں...... قطعی غیر متوقع طور پر ایک دم سے بجلی بھی کڑکنا شروع ہو گئی۔

ایک ہولناک آواز کے ساتھ سمندر کا سینہ چیر کر نمودار ہونے والی عجیب وغریب مخلوق اپنے آدھے وجود کے ساتھ بلند ہو گئی۔ وہ مخلوق پانی کا ایک بلند اور وسیع پہاڑ تھی اس کا نصف وجود سمندر کی گہرائیوں میں بابو کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا اور نصف وجود جو سمندر کی سطح سے اوپر تھا اس سے بھی اس طرح پانی ٹپک رہا تھا جیسے کسی انسان کے بھیگے ہوئے کپڑوں سے پانی ٹپکتا ہے۔

وہ خوف زدہ ہونے کے باوجود اپنی نگاہوں کے سامنے کھڑے عجیب وغریب پانی کے وجود کو تکتا رہ گیا اس کے لبوں پر وظیفے کے الفاظ تھے اور ہاتھوں کی انگلیاں تسبیح کے دانے گرانے میں مصروف تھیں۔

غور سے دیکھنے پر بابو کو اس پانی کے پہاڑ میں انسانی ہونٹوں جیسے دو ہونٹ دکھائی دیئے جو اس طرح کبھی کھل رہے تھے اور کبھی بند ہو رہے تھے جیسے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہے ہوں۔ اس عفریت کے دانت بھی تھے جو پانی سے ہی بنے ہوئے تھے اور عجیب مخلوق اس طرح اپنے دانت کچکچا رہی تھی جیسے کوئی سخت چیز چبا رہی ہو اس کی آنکھیں بھی تھیں اور ناک بھی! اور اس کے چہرے کے ایک ایک عضو سے پانی ٹپک رہا تھا گویا وہ انسانی پیکر میں ڈھلا پانی سے تخلیق پانے والا ایسا وجود تھا جو پانی پانی بھی ہو رہا تھا لیکن اس کا وجود مٹنے بھی نہ پا رہا تھا۔

اس عجیب وغریب مخلوق کے پانی سے بنے پانی ٹپکاتے ہونٹ متحرک ہوئے اور لہروں کے شور سے مشابہ آواز اس کے لبوں سے آزاد ہوئی اس آواز کے فضا میں بکھرتے ہی اطراف کی لہروں کا رقص وشور مزید بڑھ کر بابو کے حواسوں پر ہتھوڑے برسانے لگا۔

''آں اوں آں آں۔'' پانی کے پہاڑ کے لبوں سے عجیب وغریب آواز بلند ہوئی جیسے اس نے اپنی زبان میں کچھ کہا ہو؟ یا کسی کو طلب کیا ہو۔

اور پھر بابو نے دیکھا کہ سمندر کے اندر سے ہی چار انسانی وجود سمندر کی سطح پر آن کر کھڑے ہوئے اور سمندر کی سطح پر چلتے ہوئے بابو کی

جانب بڑھنے لگے۔

وہ چاروں سمندر کی متحرک سطح پر اس قدر سہولت سے چل رہے تھے جیسے وہ کسی ٹھوس زمین کے سینے پر چل رہے ہوں۔ان کے وجود سمندر کی آتی جاتی سانسوں کے سبب اوپر نیچے تو ہو رہے تھے لیکن وہ پانی میں ڈوبنا یا گرنا تو در کنار ذرا سا لڑکھڑا بھی نہ پا رہے تھے۔

قریب آ کر وہ بابو کے وجود سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک دائرے کی سی صورت اختیار کیے اس کے اطراف آن کھڑے ہوئے اور اپنی پھٹی پھٹی خون اگلتی نظروں سے بابو کو یک ٹک گھورنے لگے......اف خدایا!ان چاروں انسانوں یا انسان نما مخلوق کی آنکھیں جلتے ہوئے کوئلوں کی مانند دہک رہی تھیں اور ان کے دیکھنے اور کھڑے ہونے کا انداز ایسا تھا جیسے ابھی آنے والے لمحے وہ چاروں اس پر حملہ آور ہو جائیں گے اور بھوکے بھیڑیوں کی مانند اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے کیونکہ ان کے لبوں سے ایسی ہی بھیانک ترین غراہٹیں خارج ہو رہی تھیں۔

''آگے بڑھو اور اسے میرے وجود کی گہرائیوں میں غرق کر ڈالو۔'' پانی کے پہاڑ سے دہشت ناک آواز ابھری لہروں کے طوفانی رقص اور بے پناہ شور کے باوجود بابو کی سماعتوں سے یہ الفاظ بالکل واضح طور پر آن کر ٹکرائے اور بابو نے دیکھا کہ وہ چاروں کسی آدم خور اور خوں خوار درندوں کی مانند غراتے ہوئے اپنی جگہ سے اچھلے اور عقاب کی مانند اس کی طرف بڑھے۔

اگر چہ ان چاروں کے چہروں پر پھیلی غضب ناکی اور ان کے جھپٹ پڑنے کا انداز دیکھ کر بابو کے حواس جواب دے گئے اور اسے اپنے وجود سے روح نکلتی ہوئی محسوس ہونے لگی اور وہ اپنی پتھرائی ہوئی نظروں سے چاروں غضب ناک انسانوں کو فضا میں اڑتے ہوئے اپنی جانب بڑھتے دیکھتا رہا لیکن......؟ اگلے ہی لمحے اس نے ایک دم سے پڑھنا شروع کر دیا اور نہایت برق روانی سے پڑھتے ہوئے تسبیح کے چند آخری دانے ختم کرنے کے عزم میں ہر خوف کو پس پشت دھکیل دیا۔

اور اس سے پہلے کہ اس کا آج کی رات کا عمل اپنے اختتام کو پہنچتا، چاروں بھیانک صورت انسان فضا میں رک سے گئے اور دور ہی سے اپنے ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیئے ان کے ہاتھ از خود لمبے ہوتے چلے گئے اور انہوں نے بابو کے نیچے بچھی چادر کا ایک ایک کونا پکڑ کر چادر کو جھٹکنے والے انداز سے اس طرح ہلایا کہ بابو کا وجود کسی گیند کی مانند فضا میں بلند ہوا اور چند لمحوں تک فضا میں بلند رہنے کے بعد قلابازیاں کھاتا ہوا سمندر کی سطح کی جانب بڑھنے لگا۔

اس نے پڑھنے کا عمل موقوف نہیں کیا اور بدستور برق روانی سے پڑھتا رہا۔وہ سر کے بل سمندر کی سطح سے جا ٹکرایا اور اس کا وجود سمندر کا سینہ چیرتا سمندر کی گہرائی کی جانب بڑھنے لگا لیکن اس نے پڑھنے کا عمل جاری رکھا اس کا وجود قلابازی پر قلابازیاں کھاتے ہوئے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں کی جانب بڑھتا رہا اور اس سے پہلے کہ سمندر کی گہرائیاں اس کے وجود کو نگلنے میں کامیاب ہو پاتیں......؟

اس کی انگلیوں نے تسبیح کا آخری دانا گرا کر اپنا آج کا رات کا عمل مکمل کر لیا،عمل مکمل کرتے ہی اس نے ایک دم سے آنکھیں کھول لیں اور یہ دیکھ کر اسے بے حد مسرت ہوئی کہ وہ بجائے سمندر کی گہرائیوں میں غرق ہونے کے اسی جگہ پر بیٹھا تھا۔

وہ ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا اور خوشی و مسرت کی زیادتی سے قہقہے بکھیرتے ہوئے حصار کے اندر رہتے ہوئے ہی اپنے وجود کو چکراتے

ہوئے اپنے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

اس کے تین اطراف کچے پکے راستے اور نظروں کے سامنے وہی قبرستان تھا۔ سمندر تو دور کی بات! پانی کی کسی چھوٹی سی نہر یا جھیل تک کا دور دور تک کہیں نام ونشان نہ تھا۔

''میں جیت گیا...... میں جیت گیا۔'' وہ مارے خوشی کے چلا اٹھا۔

''بابا...... برگد والے بابا میں نے پہلی رات کا عمل کامیابی سے مکمل کر لیا...... میں نے موکل کو شکست دے دی...... او...... یاہو۔'' اس کی مسرت انگیز چیخیں ویران علاقے کے پرسکون ماحول کو بے سکون کرنے لگیں۔

''اب بابو دی گریٹ کو کوئی شکست نہیں دے سکتا...... میں جنات کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ آئیں اور مجھے یہ چلہ مکمل کرنے سے روک سکتے ہیں تو روک کر دکھائیں۔'' اس نے پہلی رات کی کامیابی کو اپنے اوپر سوار کر لیا اور کامیابی کے اسی زعم میں مبتلا ہو کر وہ غصے سے ہوائی مخلوق کو دھمکانے لگا اس نے اپنی چیزیں سمیٹ کر بیگ میں رکھنا شروع کر دیں۔

اور جب اندھیرے کا سینہ چیرتے ہوئے صبح کے اجالے نے اپنا جلوہ دکھانا شروع کر دیا تو اس نے بیگ کاندھے پر رکھا اور اپنی حفاظت کے مقدس الفاظ کا ورد کرتے ہوئے ڈرڈر کر دائرے کی لکیر پھلانگی۔

صبح کا اجالا پھیلنے کے باوجود وہ جب تک ویران وغیر آباد علاقے کی حدود سے باہر نکل نہیں آیا بدستور ڈرا ڈرا سا خوف زدہ ہی رہا۔

☆......☆......☆

جب اس نے اپنے علاقے کی حدود میں قدم رکھا تو یہاں رات بھر کی خاموشی کے بعد زندگی کی دوڑ کا آغاز ہو چکا تھا۔ بہت سے لوگ اپنی زندگی کی ایک نئی صبح کو خوش آمدید کہنے کے لئے بیدار ہو چکے تھے۔

جونہی اس نے گھر کی دہلیز کے اندر قدم رکھا صحن میں کہیں بھی عبداللہ کا وجود نہ پا کر اور زلفاں بیگم کو ناشتے کی تیاری میں مصروف پا کر اس نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اب تک اس کی غیر موجودگی کا کسی کو علم نہیں ہونے پایا تھا اور اس یقین کی وجہ دروازے پر لگی بیرونی کنڈی تھی جو رات میں اس نے اپنے ہاتھوں سے لگائی تھی اور اب اپنے ہاتھوں سے ہی کھولی تھی۔

وہ ماں کی نگاہوں کی زد میں آئے بغیر دبے پاؤں چلتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اپنی خواب گاہ میں قدم رکھتے ہی اس نے سکون کا سانس لیا اس نے اپنے آرام دہ بستر کی جانب چمکتی نگاہوں سے دیکھا یہ آرام دہ بستر ہی تو تھا جس سے لپٹ کر وہ اپنی ذات سے وابستہ ہر غم بھول کر میٹھی نیند کی آغوش میں ڈوب جایا کرتا تھا۔

اس نے بیگ کپڑوں کی الماری میں رکھا اور آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے چہرے پر چھائی سرخی جو اس کی مردانہ وجاہت کا ایک اضافی پہلو بنی ہوئی تھی اس کے چہرے سے پرواز کر چکی تھی اب اس سرخی کی جگہ خوف کی پیلاہٹ نے اپنا تسلط جما رکھا تھا ایک خوفناک ترین شب کے رت جگے نے اس کی پرکشش آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار کر دیئے تھے اس کے چہرے کی رونق گویا حرف غلط کی طرح مٹ کر رہ گئی تھی وہ ایک ایسے مریض کی مانند خود کو محسوس کر رہا تھا جو خون کی کمی کے مرض میں مبتلا ہو! کیا اس کی یہ حالت خوف کے باعث ہوئی تھی؟ کیا خوف کی یہ گرفت کبھی ڈھیلی پڑے گی؟ کیا وہ آنے والی دو راتوں میں اپنے خوف پر قابو پانے میں کامیاب ہو پائے گا۔

انہی سوالوں کے نامعلوم جواب میں وہ الجھا ہی ہوا تھا کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے ایک بار پھر ڈرا کر رکھ دیا۔ ''کک کون؟'' بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا اور وہ خوف زدہ نگاہوں سے دروازے کی جانب دیکھ کر رہ گیا۔

''ناشتہ کر لے بیٹا...... ناشتہ تیار ہے۔'' پہلی بار اسے ماں کی ممتا بھری، محبت کے لہجے سے لبریز آواز سن کر بے حد سکون حاصل ہوا اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

''ناشتہ تیار...... یا اللہ خیر! کیا ہوا بیٹا تیری طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' اس کی صورت دیکھ کر زلفاں بیگم کے لبوں سے بھی حیرت بھرے الفاظ ادا ہو کر رہ گئے۔

''نن...... نہیں ماں طبیعت ٹھیک نہیں ہے رات بھر سر کے شدید درد کے باعث ایک لمحے کے لئے بھی سو نہیں پایا...... اس لئے ناشتہ کرنے کا دل نہیں چاہ رہا۔'' اس نے جواب دیا۔

''اگر تیرے سر میں درد تھا تو مجھے جگا دیا ہوتا میں رات بھر تیرا سر دباتی رہتی تجھے خود نیند آ جاتی۔'' زلفاں بیگم نے اس کی آنکھوں کے سیاہ حلقے، پیلی رنگت، بجھی بجھی آنکھیں، ہراساں چہرہ اور بکھرے بالوں کو دیکھ کر بے حد محبت سے کہا اور قریب آ کر اس کی پیشانی چھو کر دیکھا، دیکھا ہی تھا کہ اس کے لبوں سے دبی دبی سی ایک چیخ نکل پڑی۔

''تجھے تو بہت تیز بخار ہے تیرا وجود تو آگ کے جیسی تپش دے رہا ہے آخر تجھے ہوا کیا ہے؟ تیری ایسی حالت کیوں ہو رہی ہے؟ کل شام تک تو بالکل ٹھیک تھا یہ ایک رات کے اندر تجھے کیا ہو کر رہ گیا ہے؟ میرا دل کہتا ہے کہ بات کچھ اور ہے تیری یہ حالت صرف ایک رات کے سر درد کی وجہ سے نہیں ہو سکتی؟'' زلفاں بیگم ماں تھی اور ایک ماں کا دل چیخ چیخ کر یہ کہہ رہا تھا کہ ''ہیں کو اک پچھ نظر آتے ہیں کچھ۔'' اس لئے ان کا پریشان ہونا حق بہ جانب تھا۔

اولاد چاہے کیسی بری سہی، نافرمان، بے ادب اور بدتمیز ہو، ماں کا دل اس کے لئے کبھی سخت نہیں ہوا کرتا چاہے زبان سے وہ ایسی اولاد کو لاکھ ہزار برا بھلا کہے لیکن دل سے کبھی وہ اولاد کو بد دعائیں نہیں دیا کرتی اور نا ہی اولاد کا برا چاہ سکتی ہے۔

بابو بھی ایک نافرمان و بدتمیز بیٹا سہی لیکن آخر وہ زلفاں بیگم کے جگر کا ٹکڑا تھا جسے انہوں نے بڑی منتوں ومرادوں کے بعد پایا تھا اس لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ اپنے جگر کے گوشے کی یہ حالت دیکھ کر ان کے دل پر چوٹ نہیں لگتی؟

''مجھے کچھ نہیں ہوا ہے ماں کل سارا دن بے مقصد یہاں وہاں بہت زیادہ گھومنے پھرنے کی وجہ سے تھکن کی زیادتی کے باعث ایسا ہو رہا ہے بخار بھی شاید اسی وجہ سے ہو رہا ہے۔ کئی گھنٹے ٹھیک سے سولوں گا تو اپنے آپ ٹھیک ہو جاؤں گا تم بس اتنا احسان کرنا جب تک میں خود سے نہ جاگوں کوئی مجھے نہ جگائے۔'' بابو کے لہجے میں بسی تھکن اور آنکھوں سے عیاں ہوتی نیند کی طلب زلفاں بیگم سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

''ہاں ہاں تو آرام کر...... تجھے جتنا سونا ہے تو سولے میں کسی کو بھی تیرا آرام خراب کرنے نہیں دوں گی۔'' زلفاں بیگم نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر اپنی جانب جھکایا اور ممتا کی محبت سے بھرا بوسہ اس کے سلگتے ماتھے پر ثبت کرتے ہوئے اسے آرام کرنے کے لئے کہا۔

وہ ماں کی اس محبت کے جواب میں صرف مشکور نگاہوں سے ماں کو گھور کر رہ گیا۔ ماں کے جاتے ہی اس نے دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی چڑھائی اور پردے گرا کر کمرے میں نیم تاریک ماحول بنا کر اپنے آرام دہ پلنگ پر جا گرا۔ آنکھیں بند کرتے ہی گزشتہ شب کا ایک ایک لمحہ نگاہوں کے سامنے گھوم کر رہ گیا۔ اس نے ایک دم سے آنکھیں کھولیں۔

اس نے اپنے دل ودماغ سے گزشتہ رات پیش یا نظر آنے والے خوفناک ترین واقعات کو نکال کر باہر پھینکنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی لیکن وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ آنکھیں بند کرتے ہی تصور کے پردے پر گزری رات کے تمام خوفناک ڈرامے کسی ڈراؤنی فلم کی مانند منظر در منظر لہرانے لگتے اگر وہ واقعی مضبوط اعصاب وقویٰ کا مالک نہ ہوتا تو شاید خوف کی انتہائی زیادتی کے باعث اس کا دل پھٹ پڑتا؟ اس کا دماغ الٹ کر رہ جاتا...... یا پھر؟...... وہ کسی جسمانی معذوری کا شکار ہو کر رہ جاتا؟ لیکن یہ اس کی ہستی پر خداوند کریم کی خاص عنایت یا مہربانی کی انتہا ہی کہی جا سکتی ہے کہ خوف کے شکنجے میں پھنس جانے کے باوجود اسے کچھ بھی نہیں ہوا۔

اسے اپنی غیر معمولی بہادری پر بھی تعجب اور حیرت سی ہو رہی تھی وہ بہادر ہے اس بات کا تو اسے علم تھا لیکن کتنا بہادر ہے؟ اس بات کا اسے اندازہ نہ تھا لیکن اب اسے اپنی غیر معمولی بہادری کا اندازہ ہو چکا تھا۔

وہ یہ سوچ سوچ کر متعجب ہوتا رہا کہ اتنا کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود وہ زندہ کیسے رہا؟ خوف کی انتہائی زیادتی سے اس کے دل

کی دھڑکنیں تھم کیوں نہ گئیں؟ اس کے حواس سلامت کیسے رہے؟ اس کا دماغ الٹ کر کیوں نہ رہ گیا؟ اور سب سے بڑھ کر وہ اپنے قدموں پر چل کر اپنے گھر تک کیسے پہنچا؟ یقیناً یہ قدرت کی انتہائی مہربانی کی وجہ سے ہی ممکن ہوا تھا ورنہ بندے کی بساط ہی کیا ہے؟

وہ دل کی گہرائیوں سے اس محاورے کی صداقت پر یقین لے آیا کہ "جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے"۔

"اے میرے مالک! مجھے اسی طرح اپنی مہربانیوں کے سائے میں رکھنا۔ آمین"۔

اس نے بے اختیار دل کی گہرائیوں سے دعا طلب کی۔ جب نیند کے شدید دباؤ کے باعث اس کی آنکھوں کا اوپری پردہ بار بار اس کی آنکھوں کی پتلیوں کے سامنے آن کر گرتا رہا تو اس نے ہر قسم کی سوچ سے اپنے دماغ کو خالی کیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

نیند کی دیوی گویا اسی لمحے کی منتظر کھڑی تھی کہ کب وہ آنکھیں بند کرے اور وہ اسے اپنی آغوش میں سمو لے؟

☆......☆......☆

''ابے کب تک سوتا رہے گا؟ اب اٹھ جا۔'' بابو کی سماعتوں سے اپنے غائب وجود خیر خواہ کی آواز آن کر ٹکرائی ہی تھی کہ اس کا سویا ہوا دماغ مضطرب ہو کر رہ گیا آنکھوں کے اوپری پپوٹے تھرتھرا اٹھے اور اگلے ہی لمحے اس نے ایک دم سے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے دیکھا کہ اس کے کمرے میں تاریکی کا راج تھا اور اپنے غائب وجود خیر خواہ کی موجودگی کا احساس کمرے میں بکھری دھوپ کی سی تپش کی مانند ہو رہا تھا۔

''دوست میں نے پہلی رات کا عمل کامیابی سے انجام دے ڈالا ہے۔'' وہ بیدار ہوتے ہی بے حد خوشی سے بولا اور کمرے میں ٹیوب اور لائٹ کی روشنی بکھیرتے ہی اپنے غائب وجود خیر خواہ کو نگاہیں دوڑا کر اس طرح تلاش کرنے لگا جیسے غائب وجود اب اسے ضرور دکھائی دینے لگے گا۔

''مجھے معلوم ہے! اسی لئے تو تمہیں بیدار کرنے چلا آیا ہوں...... نیندیں ہی اڑاتے رہو گے یا چلنے کی تیاری بھی کرو گے؟'' غائب وجود کی آواز پر وہ چونک سا پڑا۔

''اس وقت؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ذرا ایک نظر گھڑی پر ڈالو۔'' غائب وجود خیر خواہ کے توجہ دلانے پر جونہی اس نے دیوار گیر گھڑی کی جانب نگاہیں کیں حیرت کی زیادتی سے اچھل کر رہ گیا کیونکہ گھڑی شب کے دس بجنے کا واضح اشارہ دے رہی تھی۔

اسے اپنے آپ پر حیرت سی ہونے لگی تھی آج سے پہلے اتنا زیادہ یعنی بارہ سے زائد گھنٹے وہ پہلے کبھی نہیں سویا تھا اور نیند بھی ایسی گہری رہی کہ دوران نیند وہ لمحے بھر کے لئے بھی بیدار نہ ہوا اور نا ہی کسی بھی وجہ سے اس کی نیند میں کوئی خلل ہی واقع ہونے پایا۔

وہ یہ سوچ کر مسکرا اٹھا کہ سکون کے لمحات کتنی جلدی بیت جاتے ہیں اسے علم بھی نہ ہو سکا اور بارہ گھنٹے چٹکی بجاتے ہی بیت گئے اور ایک کل کی رات تھی کہ گزارے نہیں گزر رہی تھی ایک ایک لمحہ ایک ایک سال کی مانند گزرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''تمہیں اچھی طرح اس بات کا علم ہے کہ تمہارا سفر بہت طویل ہے لیکن پھر بھی تم گدھے گھوڑے بیچ کر نہایت سکون سے سو رہے تھے اگر میں آن کر تمہیں بیدار نہ کرتا تو تم شاید صبح سے قبل جاگنے کے بارے میں سوچتے بھی نہیں...... خیر اگلی بار ذرا دھیان رکھنا! اب جتنی جلدی ہو سکے نکلنے کی کرو تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔'' غائب وجود خیر خواہ کی یہ بات سنتے ہی اس نے الماری کھول کر اپنا بیگ نکالا۔

''کیا میں کچھ کھا پی سکتا ہوں کل رات سے میں نے کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔'' بابو نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے لہجے میں مسکینی بھر کر غائب وجود ہستی سے اس طرح اجازت طلب کی جیسے کوئی پرائمری کلاس کا بچہ انگلی اٹھا کر کسی جلاد صفت ٹیچر سے ڈرتے ڈرتے پیشاب کے لئے جانے کی اجازت طلب کرتا ہے۔

''صرف پندرہ منٹ! انہی لمحات کے اندر جتنا ٹھوس سکتے ہو ٹھوس لو...... میں تمہاری اتنی مدد کر سکتا ہوں کہ تمہاری طویل مسافت کو لمحات میں طے کرا سکتا ہوں۔'' غائب وجود کے ان الفاظوں نے اسے الجھا کر رکھ دیا۔

''کیا مطلب؟'' بابو نے اپنی الجھن کو لفظوں کے پیراہن میں ڈھال کر پیش کیا۔

''مطلب تو ایسے پوچھ رہے ہو جیسے جانتے نہیں؟ کیا دو بار پہلے تمہارے لئے راستے سمیٹ کر تمہیں چٹکیوں میں تمہاری مطلوبہ جگہ تک

نہیں پہنچایا گیا؟“ غائب وجود خیر خواہ کے اس جواب پر بابو کے دماغ میں بڑی زور کا چھنا کا ہوا اسے وہ لمحات یاد آ گئے۔

”تو کیا؟ وہ تم تھے؟“ اس نے حیرت سے دریافت کیا۔

”جی جناب والا! تمہارا خیر خواہ، شبھ چنتک یا ویل وشر۔“ غائب وجود کے انداز سے بابو کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا غائب وجود خیر خواہ سینے پر ہاتھ باندھے اس کے سامنے سر تسلیم خم کیے کھڑا ہو۔

”تمہاری مہربانیوں کا شکریہ! لیکن کیا میں یہ جاننے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ تمہاری یہ مہربانی یکطرفہ کیوں ہے؟“

بابو نے وہ سوال کیا جو اسے کانٹے کی مانند چبھا اذیت پہنچا رہا تھا۔ ”تمہاری یادداشت کی کمزوری نے مجھے بہت دکھ پہنچایا...... کل شب ہی میں نے تمہیں برگد والے بابا کے ٹھکانے سے اس جگہ تک لمحوں کے اندر پہنچایا جو یہاں سے کئی میل دور واقع ہے اور پھر صبح سویرے وہاں سے تمہارے ٹھکانے تک لا کر چھوڑا...... کیا اتنی مہربانی کافی نہیں! اس صورت میں جبکہ میں کسی پر زیادہ مہربان ہوا نہیں کرتا۔“ غائب وجود کا یہ جتلانا اسے پسند نہیں آیا۔

”مجھ پر اس قدر مہربان ہونے کی کوئی خاص وجہ؟“ بابو نے چڑ کر دریافت کیا۔

”تمہاری محبت کی شدت اور اپنی محبت کو پانے کی تڑپ دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں نے تمہاری مدد کرنے کی ٹھان لی۔“ غائب وجود کے اس جواب نے بابو کا موڈ پھر سے بدل کر رکھ دیا وہ خوش دلی سے مسکرا پڑا۔

”اتنے مہربان ہو رہے ہو تو یہ بتا کر میری ایک اور الجھن دور کر دو کہ تم کون ہو؟ تمہارا کوئی نام تو ہوگا؟“ بابو نے سوال کیا۔

”میاں جب تمہیں کھانے کے لئے آم مل رہے ہیں تو تم کیوں پیڑ گننے کے چکر میں پھنسے رہتے ہو...... تم سو کر پہلے ہی بہت وقت ضائع کر چکے ہو اب باتوں میں اور وقت برباد مت کرو آئندہ مجھ سے کوئی سوال کرنے سے قبل صرف میری یہ بات یاد رکھنا کہ مجھے جتنا کام کرنے کا حکم دیا جاتا ہے میں اتنا ہی کام کرتا ہوں اگر میں نے اپنے ذمے کاموں میں ذرا سی بھی کمی بیشی کرنے کی کوشش کی تو ہمیں کڑی سزا بھگتنی پڑ جاتی ہے۔“ غائب وجود نے کہا۔

”اوہ! گویا تمہارے سر پر بھی کسی کا ڈنڈا ہے؟“ بابو نے مسکرا کر کہا اور کچھ کھانے کی نیت سے کمرے سے نکل پڑا۔

بابو نے یہ سوچ کر کہ اس کا غائب وجود خیر خواہ کون ہے؟ فی الحال چپ اختیار کر لی کہ کبھی تو اس راز پر سے بھی پردہ ہٹے گا۔

دوسری رات کے عمل کے لئے اس کے غائب وجود خیر خواہ نے اسے لمحوں کے اندر مقررہ جگہ پر پہنچا دیا اور پہنچاتے ہی وہ لمحے بھر کے اندر اڑن چھو ہو گیا۔

کل رات والے محسوسات سے گزرتے ہوئے اس نے اللہ کا نام لے کر اپنے گرد حصار کھینچا اور ایک چادر بچھا کر اس پر بیٹھ گیا اور بیگ سے ضروری سامان نکال کر اپنے ارد گرد رکھنے لگا۔

خوف کے بے رحم پرندے نے آج کی رات آغاز سے قبل ہی اسے پنجے مارنے شروع کر دیے، جانے کیوں اس کا دل تیزی سے

دھڑ کے جار ہا تھا؟ اسے رہ رہ کر برگد والے بابا کے الفاظ یاد آ رہے تھے۔

''ہر آنے والی رات پہلی رات سے زیادہ دہشت انگیز بھیانک اور خوف ناک ہوگی۔''

وہ یہ سوچ کر اپنے دل کو مضبوط کرتا رہا کہ اللہ جانے آج کی رات اسے کیسے کیسے دہشت انگیز اور دل دہلا کر رکھ دینے والے مناظر دیکھنے کو ملیں؟ کیا آج کی رات بھی وہ گزشتہ رات کی طرح ہمت و بہادری کا مظاہرہ کر پائے گا؟ کیا آج کی رات کا عمل بھی کامیابی سے ہمکنار ہو پائے گا؟

اس نے اپنے دماغ سے جونک کی مانند چمٹے سوالات کو دماغ سے نوچ کر پھینکا اور آج کی رات کے عمل کا آغاز کر دیا۔

دس منٹ نہایت ہی خیریت سے گزر گئے، گیارہویں منٹ کا آغاز ہوتے ہی ایک دم سے تیز ہوا کے جھکڑ چلنا شروع ہو گئے اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ہواؤں میں اس قدر شدت پیدا ہونے لگی کہ ویران علاقے کی حدود میں جتنے بھی قد آور ہرے بھرے درخت کھڑے تھے سب کے سب ''شائیں شائیں'' کی بھیانک ترین آواز کے ساتھ اس طرح جھومنے اور لہرانے لگے جیسے کئی بدروحیں باہم گتھم گتھا ہو کر آپس میں لڑ رہی ہوں۔ ہواؤں کے تیور نا قابل برداشت حد تک خطرناک تھے۔

''یا اللہ! اپنا رحم فرمانا۔'' اس نے بے اختیار یہ دعا طلب کی اور اپنی نگاہیں تسبیح کے دانوں کی جانب کر لیں۔

چودھویں کے چاند کی نکھری نکھری، صاف و شفاف اور دن کی سی روشنی سے مشابہہ چاندنی رات میں اسے زمین میں کہیں دراڑیں پڑتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں جبکہ ہواؤں کے جھکڑ بدستور جاری تھے کہ اگلے ہی لمحے ایک خوفناک ترین آواز بلند ہوئی اور......؟ تمام قد آور اور ہرے بھرے درخت اپنی جڑوں سمیت زمین سے اکھڑ پڑے۔

وہ حیرت و استعجاب کے سمندر میں ڈبکیاں لگاتے ہوئے قد آور اور بھاری بھرکم درختوں کو زمین پر بے دردی سے لڑھکتے ہوئے اور چھوٹے درختوں کو کاغذ کے ٹکڑوں کی مانند ہوا میں اڑتے بکھرتے دیکھتا رہا۔

اور مزید غریق حیرت کر دینے والی بات یہ تھی کہ ایسی قیامت خیز طوفانی ہوائیں! جس نے برسوں پرانے اور قد آور درختوں کو جڑوں سمیت زمین سے اکھاڑ کر رکھ ڈالا تھا اور جنہیں حقیر تنکوں کی مانند اپنی ٹھوکروں پر رکھا ہوا تھا وہی طوفانی ہوائیں! اس کے سر کا ایک بال تک ہلانے میں ناکام دکھائی دے رہی تھیں یہاں تک کہ پانی سے بھری بوتل اور چمڑے کا بیگ! کوئی ایک چیز بھی اپنی جگہ سے ہلنے نہ پائی تھی۔

کافی دیر تک اس کے ارد گرد طوفانی ہواؤں کی چیخ و پکار برپا رہی؟ درختوں کے اکھڑنے، لڑھکنے اور اڑ کر غائب ہونے کا کھیل جاری رہا؟ جونہی اس نے اپنی توجہ پڑھائی کی جانب مبذول کی طوفانی ہواؤں کی چیخ و پکار اور درختوں کی اکھاڑ پچھاڑ بھی آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوتے آخر کار مدھم پڑ گئی اور مزید چند لمحوں کے اندر دم توڑ گئی۔

ماحول پر خاموشی طاری ہوتے ہی کرخت آواز سنائی دی۔

''اس بدبخت نے کل رات سے ہمارا جینا حرام کر رکھا ہے...... حالانکہ جو یہ چاہتا ہے وہ اسے کبھی حاصل نہیں ہوگا لیکن یہ اپنی ضد پر قائم ہے اور آج پھر ہمیں پریشان کرنے کے لئے چلا آیا ہے...... تم میں سے کون ہے؟ جو اسے اس کی ضد یا ہٹ دھرمی سے باز رکھ سکتا ہے؟ ہماری یہ

خواہش ہے کہ معاملہ بات چیت کے ذریعے حل ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔'' ایک کریہہ ہیبت ناک شکل کے ایک آدمی نے کہا۔

''ورنہ......؟'' کرسی پر بیٹھے اس شخص نے جو کہ سردار لگتا تھا اس نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

''کیا اب تک اسے روکنے کی کسی نے کوشش نہیں کی ہے؟'' سامنے بیٹھے خوفناک شکل والوں میں سے آواز آئی۔

''کی گئی ہے لیکن میں نے کہا ہے نا کہ یہ بہت ضدی اور ہٹ دھرم بھی ہے اور ہمیں ایسے انسان سخت ناپسند ہیں جو ہم سے ضد کرتے ہیں یا ہمیں اپنی ہٹ دھرمی دکھانے کی کوشش کرتے ہین حالانکہ یہ لوگ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کا اور ہمارا کوئی مقابلہ نہیں لیکن پھر بھی یہ ہمارے مقابل آتے ہیں اور ہمیں ناحق پریشان کرتے ہیں ہم ایسے شیطان صفت انسانوں سے عاجز آ چکے ہیں۔'' سردار نے کہا۔

''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اس سے بات کروں؟'' کرسیوں پر بیٹھے وجودوں میں سے ایک وجود نے اٹھ کر ادب واحترام سے اپنے سردار سے اجازت طلب کی۔

''تم بھی اپنا شوق پورا کر کے دیکھ لو...... یہ ایک انتہائی ڈھیٹ انسان ہے اور ایسے انسان باتوں کی زبان نہیں سمجھتے۔'' سردار کی غضب ناک آواز کی گونج نے بابو کو لرزا کر رکھ دیا۔

اور پھر بابو نے دیکھا کہ ہجوم میں سے ایک کتے کی سی شکل کا بھیانک صورت آدمی اٹھا اور آن کر اس سے کچھ فاصلے پر اس کی نگاہوں کے سامنے کھڑا ہو کر اپنی قہر برساتی نگاہوں سے اسے گھورنے لگا۔

بابو کا حلق ایک دم سے خشک ہو کر رہ گیا اور گوشت پوست کا مجسمہ بن کر رہ گیا خوف نے اس کی تمام حسیات کو بھی منجمد کر کے رکھ دیا تھا وہ کچھ بھی سوچنے سمجھنے سے قطعی معذور ہو چکا تھا۔

''اے چھورے کون ہے رے تو؟'' بادل گرجے تھے یا بجلیاں کڑکی تھیں لیکن اس بھیانک صورت اجنبی کی دہلا دینے والی آواز کا یہ اثر ہوا کہ بابو کے ساکت وجود میں تحریک سی بیدار ہوئی منجمد ہو جانے والے حواس سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے آشنا ہونے لگے اس نے چونک کر اپنے سامنے کھڑے بھیانک صورت وجود کو دیکھا۔

''جا بھاگ جا یہاں سے! ورنہ بہت پچھتانا پڑے گا۔'' جب بابو کے دماغ کی تمام مشینری متحرک ہو کر ٹھیک طرح سے کام کرنے لگی تو اسے علم ہوا کہ وہ بھیانک صورت اجنبی دراصل اسے ہی مخاطب کئے دھمکا رہا تھا۔

بابو نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ اپنی نگاہیں اس بھیانک شکل انسان کے چہرے سے ہٹا لے تو زیادہ بہتر ہے ورنہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھنے والا خوف اس کی ہمت کو گیلے کپڑے کی مانند نچوڑ کر رکھ دے گا اور اس کے لئے آج کی رات کا عمل اپنے انجام تک پہنچانا ناممکن ہو کر رہ جائے گا اور بابو ایسا سوچنے پر اس لئے مجبور ہو گیا تھا کہ خوف کے قوی الجثہ عقاب نے پہلے ہی سے اسے اپنے بھیانک پنجوں میں بری طرح جکڑ رکھا تھا۔

اس نے بھیانک صورت اجنبی اور دوسرے جنات کی دہکتی ہوئی نگاہوں پر سے اپنا ذہن ہٹانے کے لئے باآواز بلند عمل پڑھنا شروع کر دیا۔

اف خدایا! ان کی بھدی، کرخت، کریہہ اور حواسوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے والی آوازوں نے اسے پاگل سا کر کے رکھ دیا اس سے پہلے کہ واقعی اس کی قوت برداشت دم توڑ جاتی اور پاگل سا ہو اٹھتا ایک دم سے قطعی غیر متوقع اور حیرت انگیز طور پر خاموشی چھا گئی اس نے گردن اٹھا کر دیکھا تو نگاہوں کے سامنے وہی پرانا منظر تھا یعنی وسیع و عریض قبرستان!

اس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اسے ایک پاگل کر دینے والے خوف سے رہائی حاصل ہوئی لیکن یہ اس کا خام خیال تھا کہ اسے خوف سے رہائی حاصل ہو چکی ہے اگلے ہی لمحے ایک اور منظر اسے دہشت زدہ کرنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔

وہ بھی انسانی پیکر میں ڈھلا ایک ایسا ہیولہ تھا جس کا بدن قدرے نحیف لگتا تھا اور وہ کسی پرندے کی مانند اڑتا ہوا گویا آسمان سے نازل ہوا تھا۔

"اے چھورے! میری طرف دیکھ۔"

ہیولے کے لب متحرک ہوئے اور ایک کھرکھراتی دہشت انگیز آواز نے بابو کا دل دھڑکا کر رکھ دیا۔

اور بابو نے دیکھا کہ اس ہیولے نے پہلے ایک لمبا سا سانس خارج کیا اور پھر اگلے ہی لمحے سانس کھینچنے کا عمل شروع کر دیا۔ خدا جانے اس کے سانس کھینچنے کے عمل میں ایسی کون سی کشش پوشیدہ تھی کہ زمین پر بچھے درختوں کے سوکھے پتے، اینٹیں، پتھر، کنکر اور دھول مٹی مقناطیسی انداز سے اس کے چہرے کی جانب برق رفتاری سے کھنچے چلے جا رہے تھے اور نہایت سہولت سے اس کے لبوں کی دہلیز عبور کرتے ہوئے اس کے منہ میں داخل ہوئے جا رہے تھے۔

پھر ایک دم سے اس نے اپنے وجود میں ایک بڑا سا شگاف پیدا کر لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک سے دو، دو سے تین، تین سے چار ہوتا چلا گیا اور اس کی تعداد ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

ایک ہی شکل کے بے شمار وجود دیکھ کر حیرت و خوف نے بابو کو چکرا کر رکھ دیا۔ اس نے ایک بار پھر وہی کیا جو خوف کے شکنجے سے رہائی حاصل کرنے کے لئے وہ اب تک کرتا چلا آ رہا تھا یعنی اس نے با آواز بلند عمل پڑھنا شروع کر دیا اور یہ دیکھ کر ایک ڈرا ڈرا سا تبسم اس کے لبوں پر آن ٹھہرا کہ جیسے جیسے اس کی زبان سے عمل کے الفاظ ادا ہو رہے تھے ویسے ویسے اس ہیولے کے وجود سے پیدا ہونے والے ان گنت وجود ایک ایک کر کے مٹتے جا رہے تھے اور جب محض چند لمحات کے اندر اس عجیب سے ہیولے سے نکلنے والے تمام وجودوں کا خاتمہ ہو گیا تو سب سے آخر میں یہ حیرت انگیز کرتب دکھانے والے نے بھی الو کی چیخ سے مشابہہ ایک بے حد بھیانک اور کریہہ چیخ ماری اور ایک نامعلوم سے پرندے کا روپ دھار کر جہاں سے آیا تھا وہیں کی اڑان بھر لی اور لمحے بھر کے اندر آسمان کی وسعتوں میں تحلیل ہو کر رہ گیا۔

ابھی بابو نے سکون کی سانس ہی خارج کی تھی کہ کسی شیر کی بھیانک ترین دھاڑ نے خاموشی کے سینے میں شگاف سے ڈال کر رکھ دیا۔

بابو کے دل کی دھڑکنیں بھی ایک دم سے بکھر کر رہ گئیں شیر کی آمد کا تصور ہی اس کے ہوش اڑا کر رکھ دینے کے لئے کافی تھا وہ یہ سوچ کر خوف سے لرز اٹھا کہ وہ حصار کے اندر ہونے کی وجہ سے جنات سے تو محفوظ تھا کسی درندے سے کیسے خود کو محفوظ رکھ پائے گا۔

اور صرف چند لمحوں کے اندر بابو کو شیر کا وجود بالکل صاف دکھائی دینے لگا۔ "اف خدایا! شیر کو اپنے سامنے پا کر خوف سے بابو کے دیوتا تک

کوچ کر گئے اسے اپنے وجود پر سینکڑوں نہیں ہزاروں چیونٹیاں رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں، وجہ معقول تھی! وہ شیر جسمانی لحاظ سے تو عام شیروں جیسا ہی تھا لیکن اس شیر کی آنکھیں عام شیروں جیسی ہرگز نہ تھیں اس شیر کی آنکھیں بالکل انسانوں کی آنکھوں جیسی تھیں اور وہ اپنی انسانوں جیسی آنکھوں کا زاویہ اس کے چہرے پر مرکوز کئے کھڑا تھا۔ بابو کو اس شیر کی انسانوں جیسی آنکھوں میں لہو کا دریا سا ٹھہرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ شیر اپنے مخصوص انداز سے زمین پر بیٹھ گیا بظاہر وہ شیر بڑے سکون اور بے فکری سے بیٹھا دکھائی دے رہا تھا۔

''کامیابی تیرے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔'' برگد والے بابا کے یہ وہ الفاظ تھے جو بابو کے بے جان جسم میں نئی روح پھونک گئے اور اس نے چند لمحوں کے اندر اپنی حالت بحال کی اور پڑھائی کی جانب توجہ مرکوز کرنے کی ایک اور کوشش کی۔

یہ دیکھ کر بابو کو خوشی ہونے لگی کہ وہ آج کی رات کے عمل کی آخری تسبیح پڑھ رہا تھا وہ کسی اور بھیانک منظر کے وقوع پذیر ہونے سے قبل یہ تسبیح مکمل کر لینا چاہتا تھا۔

''بابو! ہمیں بچالے بیٹا یہ ہمیں مار ڈالیں گے۔'' ماں کی دلخراش پکار پر اس نے ایک دم سے نگاہیں اٹھا کر دیکھا اور یہ دیکھ کر اسے زبردست جھٹکا سا لگا کہ اس کی ماں زلفاں بیگم اور باپ عبداللہ کو چار بھیانک صورت انسان اپنی گرفت میں کسے گھسیٹتے ہوئے لئے چلے آ رہے تھے۔

''ہم تو سو رہے تھے نجانے یہ کس طرح گھر میں گھس آئے اور ہمیں زبردستی اٹھا کر یہاں لے آئے ہیں۔'' عبداللہ نے بے بسی سے کہا۔

''ہمیں بچالے بابو! خدا کے لئے ہمیں بچالے۔'' ماں نے بمشکل تمام اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر ایسے کرب انگیز لہجے میں کہا تو بابو کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا تھا۔ عبداللہ کو اس کے چہرے پر پھیلا کرب اور آنکھوں میں بسی التجائیں بابو کو صاف دکھائی دے رہی تھیں اور اس کے دل کو ایک اضطراب سا سونپے دے رہی تھیں۔

اگرچہ عبداللہ کے ہونٹ غیر متحرک تھے لیکن بابو ان کی نظروں کی زبان باآسانی سمجھ رہا تھا اور عبداللہ کی آنکھیں چیخ چیخ کر اس سے التجائیں کر رہی تھیں۔

''تیرے اس بیٹے کی عقل پر پتھر پڑ چکے ہیں اس پر تیری التجائیں، آنسوؤں اور فریاد کا کوئی اثر نہیں ہوگا جب تیرا بیٹا اتنا سنگ دل ہے تو ہم کیوں تجھ پر رحم کھائیں؟''

بھیانک صورت آدمی نے سفاکی سے بھرپور لہجے میں کہا عین اسی لمحے انسانی آنکھوں والے شیر نے بھی بھیانک ترین دھاڑ بلند کی تو بابو سر تا پاؤں لرز اٹھا اس کا چہرہ بھی پسینے کی انتہائی زیادتی کے باعث بھیگ چکا تھا۔

''منہ کھول میرے شیر۔'' ایک آدمی زور سے چیخا اور عبداللہ کو کسی بے جان پتلے کی مانند اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر اپنے سر سے اونچا کر لیا اور عبداللہ کی خوف و دہشت میں ڈوبی چیخیں نظر انداز کئے عبداللہ کا وجود کچھ فاصلے پر دوسری سمت کھڑے انسانی آنکھوں والے شیر کی جانب اچھال دیا۔

''مجھے بچالے بیٹا۔'' عبداللہ کا وجود فضا میں بلند ہونے کے بعد ہوا میں تیرتا ہوا شیر کی جانب بڑھ رہا تھا عبداللہ کے لبوں سے خوف و

دہشت میں ڈوبی چیخیں سن کر بابو نے بے اختیار گردن اٹھا کر عبداللہ کی جانب دیکھا عبداللہ کی خوف سے پھٹی پھٹی آنکھیں، دہشت انگیز چیخیں اور چہرے پر چھائی موت کی زردی دیکھ کر لمحے بھر کے لئے بابو کا ذہن پھر سے شک کے صحرا میں بھٹکنے لگا۔

''ابا! یہ تو واقعی میرے ابا ہیں۔'' اس کے لبوں سے بے اختیار یہ الفاظ ادا ہو کر رہ گئے اس نے تیزی سے چہرہ گھما کر شیر کی جانب دیکھا اور پھر اگلے ہی لمحے شیر نے اپنا بھیانک ترین جبڑا کھول دیا تھا۔

''تو بھی جا۔'' بھیانک صورت آدمی نے زلفاں بیگم کو بھی اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر سر سے بلند کیا اور پھر شیر کی جانب اچھال دیا۔

بابو نے اپنی نگاہیں اپنے باپ اور ماں کے فضا میں ڈولتے وجود پر ہی مرکوز رکھیں اور اس کی آنکھوں نے جو ہیبت ناک نظارہ اسے دکھایا وہ دیکھ کر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے ہی رہ گیا...... افراط خوف سے اس کی آنکھوں کی خاکی پتلیاں بھی بے جان سی ہو کر رہ گئیں اور جسم ایسے اکڑ کر رہ گیا جیسے اس کی روح اس کے جسم کے قفس کو چھوڑ کر عالم بالا میں پرواز کر گئی ہو۔

شیر کے نوکیلے اور تیز دانت عبداللہ اور زلفاں بیگم کے وجود میں پیوست ہی ہوئے تھے کہ ان کے لبوں سے آخری لیکن بے حد دلخراش اور کرب انگیز چیخ بلند ہوئی اور ان کے جسموں سے خون کی سرخ دھاریں ابل پڑیں۔

بابو کا دماغ سنسنا اٹھا تھا اور اس وقت وہ ہمت کا دامن اپنے ہاتھوں سے چھوڑ بیٹھا جب انسانی آنکھوں والے شیر نما عفریت نے ''پھوں'' کر کے اپنے منہ سے کچھ اگلا...... شیر کے منہ سے نکلنے والی دو چیزیں لڑھکتی ہوئی بابو کی نظروں کے سامنے آن کر رک گئیں۔

اس کی پتھرائی ہوئی نظریں از خود فرش کی طرف جھک کر رہ گئیں اور پھر جو منظر اس نے دیکھا وہ اس کے لئے مزید اعصاب شکن ثابت ہوا اور گھگھیا تا رہ گیا۔

وہ دو گول چیزیں! کوئی فٹ بال نہیں بلکہ اس کے ماں باپ کی گردنیں تھیں جن سے اب تک تازہ اور گاڑھا خون بہہ رہا تھا۔

عبداللہ اور زلفاں بیگم کے بے دھڑ کے چہروں پر موجود پھٹی پھٹی آنکھیں قطعی غیر متحرک تھیں اور بابو کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''تو نے ہمیں نہیں بچایا...... ہماری موت کا تماشہ دیکھتا رہا ہم اس بات کے لئے تجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔'' اس کے دماغ میں آواز گونجی۔

یہ اس کے ضبط کی انتہا تھی از خود اس کی آنکھوں کا اوپری پردہ اس کی آنکھوں کی پتلیوں پر آن گرا اور ''دھپ'' سے اس کا وجود زمین پر گر کر رہ گیا اس کے دماغ پر تاریکیاں سی مسلط ہو کر رہ گئیں۔

ویران و غیر آباد جگہ پر کئی لمحات تک وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر حصار کے اندر پڑا رہا۔

کئی لمحوں بعد جب اس کے بے حس و حرکت پڑے وجود میں حرکت جاگی، جب اس کے دماغ پر چھائی خوف کی زنگ صاف ہوئی اور جب اسے اپنے دل کے دھڑکنے کا احساس ہوا تو خود کو زندہ پا کر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

اس کے اطراف چند لمحے قبل ہونے والے دہشت انگیز ڈرامے کا کوئی کردار اور کوئی منظر موجود نہ تھا۔

وہ سوچے بنا نہ رہ سکا کہ ایک دم سے اس قدر گہرا سکوت کیوں چھا چکا تھا؟ وہ شیر کی وحشیانہ دھاڑیں؟ وہ بھیانک صورت انسانوں کے مکروہ اور وحشت انگیز قہقہے؟

اب ہر سو خاموشی گشت کر رہی تھی، سکوت چہل قدمی فرما رہا تھا گہری اور ہولا دینے والی خاموشی، پاگل سا کر کے رکھ دینے والا سکون!

وہ انسانی ہر آواز، ہر وجود مٹ کر رہ گیا تھا؟ یا اس طرح سے اچانک پوشیدہ ہو جانے میں ان کی کوئی نئی شرارت کارفرما تھی؟

بے حد خوف زدہ ہو جانے کے باوجود اپنے اطراف کسی کو نا پا کر اس کی خوف زدہ نگاہیں خوشی سے لمحے بھر کے لئے چمک اٹھیں اور ڈرے ڈرے چہرے پر ڈرا ڈرا سا تبسم رقصاں ہو گیا۔

اس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور یہ دیکھ کر خوشی سے اس کا دل بے قابو ہونے لگا کہ ابھی اس کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ آسانی سے اپنا آج کی رات کا وظیفہ مکمل کر سکتا تھا اگر وہ بے ہوش نہ ہوا ہوتا تو جانے کب سے آج کی رات کا عمل پورا کر چکا ہوتا۔

تاہم وہ یہ سوچ کر اللہ کا بے حد شکر گزار ہونے لگا کہ اس پاک ذات نے اس کے اندر اتنی ہمت پیدا کی کہ وہ چند لمحات کے اندر ہی ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹ آیا۔ اور اس نے ڈرتے ڈرتے تسبیح ہاتھوں میں لی اور عمل پڑھنا شروع کر دیا۔

اس نے نہایت سہولت سے اپنا دوسری رات کا وظیفہ مکمل کر لیا۔ آج اسے اپنا وظیفہ یا چلے کی دوسری رات کا عمل مکمل کرنے کی رتی برابر خوشی نہیں ہو رہی تھی۔ خوف نے اس کے دل و دماغ پر اتنا برا اثر مرتب کیا تھا کہ ہر ایک منٹ بعد اس کے وجود کو جھٹکا سا لگ رہا تھا اور وہ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ اس کا پورا وجود گویا بری طرح ہل کر رہ جاتا۔

جانے کیوں اس کا دل بھی بہت گھبرا رہا تھا اس کا دھیان بار بار اپنے ماں باپ کی جانب گھوم کر رہ جاتا اور بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور وہ باقاعدہ بچوں کی طرح ماں کو یاد کر کے رونے لگا۔

جب رونے سے دل کا غبار آنکھوں کے راستے آنسو بن کر بہہ گیا تو اس نے دیکھا کہ صبح کا اجالا دھیرے دھیرے اندھیرے کو نگلتے ہوئے غیر محسوس طور پر نمودار ہو رہا تھا۔

اس نے اپنا سامان سمیٹ کر بیگ کے اندر رکھا اور حصار سے باہر قدم نکالا وہ بدستور بہت ڈرا ڈرا خوف زدہ سا تھا۔

وہ خوف زدہ نگاہوں سے اپنے چاروں طرف دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ قدم اٹھائے چلتا رہا اپنے گھر کی جانب۔

''تم بہت خوف زدہ دکھائی دے رہے ہو تم گھر جا کر آرام کرو ہم بعد میں بات کریں گے۔'' غائب وجود خیر خواہ کی آواز آئی اور گرم ہوا کا ایک جھونکا اسے اپنے قریب سے گزرتے ہوئے محسوس ہوا۔

خوف کا شیش ناگ اس کے دل پر کچھ اس طرح کنڈلی مارے بیٹھا تھا کہ جب وہ اپنے محلے میں داخل ہوا تو آتے جاتے لوگوں کو دیکھ دیکھ کر خوف زدہ ہوتا رہا اگر کوئی تیزی سے اس کے قریب سے گزرتا تو وہ اپنے آپ میں سمٹ کر رہ جاتا۔

جب اس نے اپنے گھر کے داخلی و خارجی دروازے پر دستک دی تو اس وقت بھی اس کے دل و دماغ پر خوف کے بادل چھائے ہوئے

تھے اور جسم کو جھٹکے لگنے کا عمل بھی جاری تھا۔

''بابو؟ تو؟ کہاں تھا تو رات بھر؟'' اس کی بڑی بہن صبیحہ نے دروازہ کھولتے ہی پہلے حیرت اور پھر غصے سے دریافت کیا۔

''مم میں...... میں کک کسی کا...... کام سے گگ گیا تھا کک کہیں۔'' اس کے لہجے میں لسی ہکلاہٹ صبیحہ کو حیران کر گئی اس نے ایسی نگاہوں سے بابو کا سر تا پاؤں جائزہ لیا جیسے اپنے دل کی تسلی چاہ رہی ہو کہ اس کے سامنے کھڑا ہوا اس کا خوب صورت بھائی بابو ہی تھا یا بابو سے ملتی جلتی شکل کا کوئی اور بندہ انہیں بے وقوف بنانے چلا آیا تھا۔

بکھرے بال، دھول مٹی سے اٹا ہوا لباس چہرے پر چھائی مردوں کی سی سفیدی حیران وخوف زدہ سا، آنکھوں میں پستی بے رونقی اور لب و لہجے میں ہکلاہٹ! کیا اس کا بھائی بابو ایسا تھا؟

''تجھے کچھ معلوم ہے؟ رات ہم پر کیسی بھاری گزری ہے؟'' یہ الفاظ ادا کرتے ہی صبیحہ کی آواز اور آنکھیں بھر آئیں۔

اس کا دل ایک دم سے دھک سا ہو کر رہ گیا اس کے تصور کے پردے پر گزشتہ رات والا بھیانک منظر لہرا کر رہ گیا۔ چار بھیانک صورت آدمیوں کا اس کے ماں باپ کو پکڑ کر لانا، ان کے زندہ وجود انسانی آنکھوں والے شیر کے بھیانک و نوکیلے جبڑوں کے درمیان پھینک دینا اور شیر کا ان کے وجود کو چباڈالنا، تو کیا وہ سب اس کی نظروں کا دھوکا یا جنات کا بھیانک ڈرامہ نہیں تھا؟

''کک کیا...... کیا ہوا؟'' اس نے خوف سے تھوک نگلتے ہوئے دریافت کیا۔

''وہ......؟ وہ اماں......؟'' بات پوری کئے بغیر وہ ایک بار پھر رونا شروع ہوگئی۔

''کک کیا ہوا؟ ام اماں کو؟'' وہ ایک دم سے چیخ پڑا بے اختیار بیگ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر اپڑا۔

''میں بتاتا ہوں کیا ہوا تیری ماں کو۔'' ایک مردانہ آواز پر اس نے نگاہیں اٹھا کر آواز کے وجود کی جانب دیکھا اپنے سامنے اپنے باپ عبداللہ کو زندہ سلامت کھڑے پا کر لمحے بھر کے لئے وہ ڈر سا گیا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اپنے ڈر پر قابو پا کر دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ ویسا کچھ بھی نہ تھا جیسا وہ سوچ رہا تھا اور جھک کر اپنا بیگ اٹھایا اس بات سے قطعی انجان کہ عبداللہ اس کے سراپے اور اس کی ہر حرکت کا کڑی نگاہوں سے جائزہ لے رہا تھا

''تو رات بھر کہاں تھا؟'' اور اس بیگ میں کیا ہے؟'' عبداللہ نے قریب آ کر سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''کک کام سس سے گیا تھا...... مم ماں کو کیا ہوا؟'' عبداللہ کو اس کے لہجے کی ہکلاہٹ اور ڈرا ڈرا سا انداز کسی خطرے کا احساس دلانے لگے۔

عبداللہ نے بتایا۔''رات تیری ماں تجھے گھر میں نہ پا کر بے چین ہوگئی اور اسی کارن دل کا دورہ پڑا۔ بس یہ سمجھ لے کہ موت کے منہ میں جا کر واپس آئی ہے۔

جب ڈاکٹر نے تیری ماں کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد یہ کہا۔'' یہ ابھی زندہ ہیں۔'' تو ڈاکٹر کے ان الفاظ نے ہمیں ایک نیا حوصلہ بخشا۔ اللہ اس نیک دل ڈاکٹر کو صحت وتندرستی کے ساتھ لمبی زندگی عطا فرمائے جس نے کئی منٹوں کی کوشش کے بعد آخر تیری ماں کے سینے میں

اکی سانسیں بحال کیں اور وہ ایک لمبا سا سانس لئے اس طرح ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی جیسے اسے کسی نے گہری نیند سے زبردستی جاگنے پر مجبور کر دیا ہو۔

بابو ماں کے کمرے کی جانب بڑھا جہاں زلفاں بیگم ڈاکٹر کی دی ہوئی سکون کی گولیاں کھا کر گہری نیند کے مزے لوٹنے میں مصروف تھی۔

''مجھے معاف کر دو ماں...... میں بہت برا ہوں بہت برا۔'' وہ زلفاں بیگم کے پیر پکڑے بولا اس کی آنکھوں کے کنارے نمکین پانی کی زیادتی کے باعث چھلک پڑے۔

''اب تو بتا دے بیٹا! کہ رات بھر کہاں تھا؟''

''میں کک کچھ دیر سس سونا چاہتا ہوں ابا...... اٹھنے کے بب بعد میں ساری سس سچائی بتا دوں گا'' اس نے کچھ اس انداز اور لب و لہجے سے کہا کہ عبداللہ نے محبت سے مسکرا کر گردن ہلاتے ہوئے اسے آرام کرنے کی اجازت دی اور محبت سے اس کی پیٹھ تھپک کر کمرے سے نکل گیا۔

☆......☆......☆

اس نے کمرے کے پردے گرا کر اپنی خواب گاہ کو نیم تاریک ماحول سے آراستہ کیا اور تھکن سے چور چور وجود لئے آرام وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔

خوف کا آسیب بدستور اس پر حاوی تھا وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے بھی ڈر و خوف محسوس کر رہا تھا۔

اس کے دماغ کی ابتر ہوتی حالت کے ذمہ دار بھی صرف اور صرف جنات کے بھیانک ترین روپ تھے۔

پہلی رات کی نسبت دوسری رات زیادہ خوف ناک و دہشت انگیز تھی خدا بہتر جانتا ہے کہ تیسری رات کا عالم کیا ہوگا؟ اس سلسلے میں کئی ایسے سوالات جو اس کے دماغ میں ہلچل سے برپا کئے دے رہے تھے اور جن کے جوابات کا اسے کچھ اندازہ نہ تھا۔

سب سے اہم سوال تو یہی تھا کہ کیا وہ تیسری رات کا عمل کامیابی سے انجام دے پائے گا؟ کیا اس کا دماغ مزید کسی دہشت انگیز نظارے کو برداشت کر پائے گا؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا دماغ الٹ کر رہ جائے؟ وہ پاگل ہو جائے؟ یا اس کا دل خوف کی زیادتی کے باعث دھڑکنا بند کر دے؟ اگر ان خدشات میں سے کوئی ایک بھی خدشہ اللہ نہ کرے سچ ثابت ہو کر رہ جاتا ہے تو کیا اس کی باقی زندگی دوسروں پر ایک بوجھ بن کر رہ جائے گی؟ یا اس کی کہانی ہی ہمیشہ کے لئے ختم ہو کر رہ جائے گی؟

''اگر ایسا ہوا تو میری معصومہ کا کیا ہوگا؟ کیا وہ بڈھا کھوسٹ وڈیرا شاہنواز رستم اسے اپنی ملکیت بنالے گا؟'' اسے اب بھی صرف اپنی محبت کی فکر لاحق تھی۔

''بابو میاں! جان ہے تو جہان ہے۔'' اس کے اندر کا انسان اس کے وجود سے باہر نکل آیا اور اس کے سامنے کھڑے ہو کر بولا۔

''جو چلہ تمہیں بتایا گیا ہے وہ بہت ہی خطرناک ہے کیوں اپنی ہنستی مسکراتی زندگی کے خود دشمن بن رہے ہو؟ کوئی اور راستہ تلاش کرو ورنہ تمہاری مثال اس شعر کی منہ بولتی تصویر بن کر رہ جائے گی کہ

''نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم
نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے''

اس کے اندر کا انسان بھی اس کا مذاق بنانے لگا۔

''میں آج کی آخری رات کا وظیفہ کرنے اس ویران و غیر آباد جگہ کا رخ نہیں کروں گا، میں 20 لاکھ حاصل کرنے کا کوئی اور راستہ تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔'' اس نے اپنے آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔

''بہت خوب! کیا فیصلہ فرمایا ہے جناب عالی نے؟'' غائب وجود خیر خواہ کی آواز نے لمحے بھر کے لئے اسے ڈرا کر رکھ دیا۔

''ہاتھی نکل چکا ہے صرف دم رہ گئی ہے اور تم ہمت کا دامن چھوڑ بیٹھے۔'' غائب وجود کے لہجے میں افسوس نمایاں تھا۔

''مجھ سے اب مزید برداشت نہیں ہوتا۔ اگر تم دیکھ سکتے ہو مجھے! تو میری جانب غور سے دیکھو محض دو راتوں کی چلہ کشی نے میری کیا حالت بنادی ہے؟ خوف کی انتہائی زیادتی کے باعث میرے جسم میں دوڑنے والا خون خشک ہو کر رہ گیا ہے میری رگ رگ میں لہو کی جگہ اب صرف خوف گردش کر رہا ہے...... اور میری دماغی ابتری کا تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے مجھے اپنے سائے سے بھی خوف محسوس ہونے لگا ہے...... رب العزت کی یہ مجھ

پر بڑی مہربانی ہے بلکہ مہربانی کی انتہا کہی جاسکتی ہے کہ میں اب تک اپنے حواسوں میں ہوں ورنہ......؟'' اس نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا اس کے قریب سے گزرا جیسے اس کے غائب وجود خیر خواہ نے اپنی سمت تبدیل کی ہو۔

''کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے پھر تم پر جس خوف نے اپنا تسلط جما رکھا ہے وہ محض وقتی ہے جب تم آج کی تیسری اور آخری رات کا چلہ کامیابی سے مکمل کرلو گے اور ایک طاقت ور جن تمہاری غلامی میں آجائے گا اور وہ تمہاری ہر جائز و ناجائز خواہش چٹکی بجاتے ہی پوری کر دیا کرے گا تو تمہارا سارا ڈر و خوف حرف غلط کی مانند مٹ کر رہ جائے گا۔'' غائب وجود خیر خواہ نے اس کی ہمت بندھائی۔

''نن......نہیں! میرا دل نہیں مان کے دے رہا۔'' بابو نے جواب عنایت فرمایا۔

''اپنے دل کو مناؤ میرے یار! اگر تم نے ہمت ہار دی تو ایک لمحے کے لئے سوچو؟ اس لڑکی کا کیا ہوگا؟ جو بے صبری و بے چینی سے تمہاری آمد کے دن گن رہی ہے۔''

غائب وجود کا یہ تیر سیدھا نشانے پر جا کر لگا اس کے تصور کے پردے پر معصومہ کی بھولی بھالی صورت اور حسین و دلکش سراپا دھر آیا اس کی وہ حسین آنکھیں یاد آنے لگیں جن میں آنسوؤں کے کانچ جیسے سفید موتی جھلملا رہے تھے۔

''دو راتوں کا وظیفہ تم کامیابی سے مکمل کر چکے ہو تیسری اور آخری رات کا عمل باقی ہے اور تم ہمت ہار رہے ہو......تمہیں اپنی ہمت و بہادری سے اس کامیابی کو پانا ہے۔'' غائب وجود ہستی کی اپنے اطراف چکراتی آواز اسے شش و پنج میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔

''جب تم گزشتہ دو راتوں والی ہمت اور بہادری کا مظاہرہ کرو گے......اور میرا یقین یہ کہتا ہے کہ تم کامیابی کا بیش قیمت ہیرا پا سکتے ہو! کیونکہ تم کوئی عام نوجوان نہیں ہو تم ایک غیر معمولی قوت ارادی اور مضبوط اعصاب کے مالک ہو۔'' غائب وجود اس کی ہمت کی ٹوٹی ہوئی دیوار کو نئے سرے سے ایک ایک اینٹ رکھ کر تعمیر کرنے کی اپنی سی ہر ممکن کوشش کرتا رہا۔

''اس چلے کو مکمل کرنے میں ہی تمہاری بہتری پوشیدہ ہے اگر تم کوئی بینک لوٹو گے، کسی کروڑ پتی انسان کے پوتے، نواسے یا بیٹے کو اغوا کر کے اس سے 25,20 لاکھ روپے تاوان کا مطالبہ کرو گے یا چوری ڈکیتی کے راستے کی جانب قدم بڑھاؤ گے تو جانتے ہو؟ پکڑے جانے کی صورت میں کیا ہوگا؟ پولیس کی بندوق سے نکلی بارود کی چند گولیاں اور کسی ویران سڑک پر ماہی بے جل کی مانند تڑپتا ہوا آخری سانسیں لیتا ہوا تمہارا جسم!'' غائب وجود کی یہ بات لمحے بھر کے لئے اسے لرزا گئی۔

''حیرت کی بات ہے اپنے جیسے انسانوں سے تمہیں خوف محسوس نہیں ہوتا؟ جو تمہیں مارنے سے قبل ایک لمحے کے لئے بھی یہ نہیں سوچیں گے کہ وہ کسی مجبور انسان کو مار رہے ہیں؟ نا وہ اس سوال پر غور فرمائیں گے کہ کس گھر کا چراغ بجھا رہے ہیں؟ ان کے دلوں میں ذرہ برابر بھی تمہاری ہستی کے لئے رحم کے جذبات بیدار ہونے نہ پائیں گے وہ تمہیں تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھ کر خوش ہونگے اور جب تم مر جاؤ گے تو تمہارے مردہ وجود پر لات مار کر آگے بڑھ جائیں گے......مردار خور پرندے و جانور تمہارے وجود سے ضیافت اڑائیں گے اور تم بے گور و کفن بے نام و نشان ہو کر اس دنیا والوں کے لئے ایک کہانی بن کر رہ جاؤ گے۔'' غائب وجود گرم لوہے پر ضرب پر ضرب لگاتا رہا۔

ایسی باتیں مت کرو...... مم مجھے خوف آتا ہے میں بے گوروکفن بے نام ونشان ہو کر مرنا نہیں چاہتا۔" وہ ڈر کر بولا۔

"یہ ہوئی نامردوں والی بات! میرے یار! جینا ہے تو شیروں والی زندگی جیو اور ویسے بھی ہوائی مخلوق کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہوں، کسی انسانوں کو مارنے پر قادر نہیں ہوتے۔" غائب وجود اسے راضی پا کر خوشی سے اس کے اطراف برق رفتاری سے گھوم کر گویا اپنی خوشی کا اظہار فرمانے لگا۔

"اب تم آرام کرو! کیونکہ آج کی رات تمہاری زندگی کی اہم رات ہے جو کامیابی کی صورت میں تمہاری زندگی کی ایک یادگار رات بن کر رہ جائے گی۔" غائب وجود نے اسے تسلی دی اور زن سے گزر گیا۔

اپنی باتوں اور دلیلوں سے اس کے غائب وجود خیر خواہ نے بالآخر اس کے ارادوں کی گرتی دیوار کو نا صرف سہارا مہیا کیا بلکہ نئے سرے سے دیوار کو مضبوطی سے کھڑی کر کے چلا گیا۔

یہی وجہ تھی کہ جب وہ بستر پر سونے کے ارادے سے لیٹا تو اپنے دل میں اس بات کا پختہ ارادہ باندھ چکا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے وہ تیسری اور آخری رات کا وظیفہ مکمل کرنے اس جگہ ضرور پہنچے گا۔

تین راتوں پر مشتمل اس خوفناک ترین چلے کو وہ آج کی رات ہر حال میں اپنے انجام کو پہنچا کر دم لے گا۔

اسے کسی صورت بھی گوارہ نہ تھا معصومہ کے بغیر جینے اور اگر جی بھی لیتا تو اس کے لئے بے کار و بے مقصد تھا یہ جینا، بالکل اس زندہ کہلانے والے انسان کی مانند جو کوے میں پڑا ہو۔

☆......☆......☆

آج چاند کی پندرہویں شب تھی بابو کے چلے کی آخری رات! جو چلہ وہ انجام دے رہا تھا وہ پوری تین راتوں کا تھا۔

دو! وحشت انگیز اور خوفناک ترین راتیں وہ گزار چکا تھا اور تیسری اور آخری رات کے وظیفے کے لئے وہ مقرر کردہ جگہ پر پہنچ چکا تھا۔

یہ بھی سچ تھا کہ دو راتوں کے وظیفے نے اس کے دل و دماغ پر بہت منفی اثرات مرتب کئے تھے ڈر و خوف نے اسے بری طرح اپنی گرفت میں کس رکھا تھا وہ اپنے غائب وجود خیر خواہ کی سینکڑوں تسلیوں کے باوجود اپنے آپ کو خوف کی آہنی گرفت سے رہا نہیں کر پا رہا تھا۔

دو راتیں وہ کامیابی سے گزار چکا تھا اور اسے امید بھی تھی کہ آج تیسری رات بھی کامیابی اس کے قدم چومے گی کیونکہ یہی پیشن گوئی برگد والے بابا کی تھی اور اس کے غائب وجود خیر خواہ نے بھی یہی یقین دلایا تھا کہ وہ کامیابی حاصل کرنے میں ناکامی کا چہرہ نہیں دیکھے گا لیکن......؟ ان تمام دلاسوں، تسلیوں اور حوصلے کے باوجود اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور اسے بار بار اس بات کے لئے اکسائے دے رہا تھا کہ وہ آج کا عمل انجام نہ دے۔

''گھر لوٹ جا بابو! گھر لوٹ جا۔'' لیکن وہ اپنے دل کی اس پکار اور دھڑکنوں کے انتشار کو نظر انداز کئے آگے بڑھا۔ دائرے کی صورت میں حصار کھینچا اور چادر بچھا کر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔

ابھی اس نے وظیفے کا آغاز کیا ہی تھا کہ اس کے ذہن میں جنات کا خیال آیا اور پھر جنات کا خیال آتے ہی اپنے جس خوف کو اس نے اپنے دل کی سرزمین میں دبا رکھا تھا لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ خوف زمین پھاڑتا ہوا ظاہر ہو گیا اور بابو کو بری طرح اپنی گرفت میں لے کر بے بس کر کے رکھ دیا۔

وہ ایک دم سے خود کو بے جان سا محسوس کرنے لگا اس کی تمام ہمت جیسے دم توڑنے لگی وہ اپنے آپ کو اب کسی بھی دہشت انگیز نظارے کا متحمل نہیں پا رہا تھا۔

اور پھر اس نے اپنے آپ کو مضبوط رکھتے ہوئے اپنی سوچ پر عملدرآمد شروع کر دیا اور اپنی پوری توجہ عمل کی پڑھائی کی جانب مرکوز کر ڈالی۔

جب بنا کسی رکاوٹ کے اس نے نہایت سہولت سے اپنا نصف وظیفہ مکمل کر لیا تو مارے خوشی کے اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا!

کامیابی اس سے صرف نصف وظیفے کے فاصلے پر کھڑی اسے مسکراتی نظروں سے تک رہی تھی کوئی دیر تھی کہ وظیفہ مکمل کرتے ہی کامیابی اس کے قدموں میں آن گرتی۔

اس نے اپنی دانست میں جنات کو ہار ماننے پر مجبور کر ڈالا تھا اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ جنات اسے ڈرا دھمکا کر اور اپنی بھیانک حرکات سے خوف و دہشت میں مبتلا کرنے کی کوشش کر کے تھک چکے تھے۔

شاید ہوائی مخلوق یہ بھانپ چکی تھی کہ بابو کو شکست سے دوچار کرنا......یا......ڈرا دھمکا کر فرار ہونے پر مجبور کرنا ان کی جناتی قوت کے بس کا روگ نہ تھا۔

وہ یہ سوچ سوچ کر خوشی سے لہرانے لگتا کہ کوئی دیر ہے کہ ایک جن اس کی غلامی میں ہو گا وہ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اپنے غلام جن سے

سب سے پہلے 20 لاکھ روپے نقد اپنی خدمت میں پیش کرنے کی خواہش کا اظہار کرے گا بلکہ حکم صادر فرمائے گا اور جب اس کا غلام جن اس کا یہ حکم چٹکی بجاتے ہی پورا کر دے گا تو وہ اس جن کی مدد سے ہی جانم کے مکان میں ایک دم سے داخل ہو کر 20 لاکھ روپے اس کی جھولی میں ڈال کر کہے گا۔ ''اب میری معصومہ میرے حوالے کر دو۔'' اور جب معصومہ کے سنگ وہ دنیا کی حسین جگہوں کی سیر کے لئے روانہ ہوگا تو زندگی کا ہر پل کس قدر حسین، رومان سے بھرپور اور خوشگوار گزرے گا۔

اور پھر آہستہ آہستہ وہ اپنے غلام جن سے زندگی کا ہر عیش و آرام طلب کرتا رہے گا۔

وہ خیالوں کے گھوڑے پر سوار سرپٹ دوڑے چلا جا رہا تھا کہ دفعتاً......؟

سناٹے کی چادر کو تار تار کرتی ہوئی چرچراہٹ کی بھیانک ترین آواز کی گونج نے اس کے خیالوں کے برق رفتار گھوڑے کی لگا میں ایک دم سے کھینچ کر سوچ کے گھوڑے کو ہنہنا کر رکنے پر مجبور کر دیا۔

اس نے اپنے خیالوں کی پٹاری سے سر نکال کر آواز کی سمت نگاہیں اٹھا کر دیکھا...... دیکھا ہی تھا اپنے دائیں جانب واقع سڑک سے ایک بیل گاڑی کا ہیولہ آتا دیکھ کر اس کا دل مینڈک کی طرح پھدک کر اس کے حلق میں آن پھنسا کیونکہ بیل گاڑی کا رخ اسی کی طرف تھا۔

وہ بری طرح سٹپٹا کر رہ گیا اور اس سٹپٹانے کی وجہ کوئی خوف یا دہشت انگیز نظارہ نہیں بلکہ ایک سوچ تھی۔

اور وہ سوچ یہ تھی کہ درمیانی تمام راستہ پر وہ حصار باندھے بیٹھا تھا اور بیل گاڑی کے گزرنے کا راستہ بھی حصار کے اندر سے ہو کر جاتا تھا اگر وہ بیل گاڑی کو راستہ دینے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھنے کی حماقت کرتا ہے تو یہ لازم ہے کہ اسے اپنا حصار توڑ کر ایک جانب ہونا پڑے گا اور حصار توڑنے یا حصار کی حدود سے باہر قدم رکھنے کا مطلب ہوگا جنات کے گھیرے میں جا پھنسنا اور برگد والے بابا نے کسی بھی حال میں حصار سے باہر آنے یا حصار توڑنے کی سختی سے ممانعت کر دی تھی۔

''پھر اب کیا کیا جائے؟'' وہ سوچ سوچ کر پاگل ہوتا رہا اس کی حالت بری ہونے لگی اس کے جسم کے تمام مسامات پسینے کے موتی اگلنے لگے، حصار سے باہر قدم رکھنے کا مطلب تھا موت جو اسے کسی صورت گوارہ نہ تھی۔

وہ اپنے آپ کو منزل کے بے حد قریب ہوتے محسوس کر رہا تھا اور اتنا قریب آنے کے بعد وہ اپنی کسی حماقت کے باعث اپنی منزل سے دور ہونے یا منزل کو ہمیشہ کے لئے کھو دینا منظور نہیں کر سکتا۔

''اس کم بخت کو بھی ابھی نازل ہونا تھا یہ لوگ وقت بے وقت کیوں گھر سے نکل پڑتے ہیں؟ انہیں رات کے اس پہر کیا مصیبت آن پڑتی ہے؟''

وہ بری طرح تلملا کر رہ گیا اور پڑھنے کے ساتھ ساتھ بیل گاڑی کی جانب بھی دیکھتا رہا۔

یہ بات تو برگد والے بابا نے اسے بتا دی تھی کہ عموماً اس راستے پر انجن والی گاڑیوں کی آمد قطعی نہیں ہوتی لیکن بیل گاڑیاں کبھی کبھار اتفاق سے گزر جایا کرتی ہیں اور یہ بابو کی بدنصیبی ہی کہی جا سکتی ہے کہ آج یہ اتفاق رونما ہو گیا یعنی ایک بیل گاڑی سوار اس راستے پر آن نکلا تھا۔

اگرچہ بیل گاڑی کی رفتار بہت ہی سست تھی لیکن اتنی سست بھی نہ تھی کہ وہ اپنا نصف وظیفہ مکمل کر پاتا چیونٹی کی چال چلنے کے باوجود وہ بیل

گاڑی سوار زیادہ سے زیادہ دس یا پندرہ منٹ کے اندر اس کے نزدیک آن پہنچے گا اور بابو چاہے لاکھ روانی دکھائے پندرہ منٹ کے اندر نصف وظیفہ ختم کرنا اس کے بس کا روگ نہ تھا اور ایسی صورت میں تو قطعی ناممکن تھا کہ کوئی تلفظ کی غلطی بھی سرزد نہ ہو۔

بابو کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ اور کیا نہ کرے؟

''اے کم عقل انسان! تجھے کون سی ضرورت نے رات کے اس پہر گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے کہ تو صبح ہونے کا بھی انتظار نہ کر سکا؟ اور میرا بڑی مشکلوں سے بننے والا کام خراب کرنے چلا آ رہا ہے۔'' یہی کچھ سوچتے ہوئے وہ لحہ بہ لحہ بیل گاڑی کو قریب ہوتے دیکھتا رہا۔

اس نے چند لمحوں کے لئے پڑھنا موقوف کر دیا کیونکہ وہ ذہنی طور پر پڑھائی کی جانب اپنی توجہ مبذول نہیں کر پا رہا تھا اس کا ذہن کسی ایسی تدبیر پر غور فرمانے میں مصروف ہو گیا جس پر عمل پیرا ہو کر وہ اپنے حصار کی بھی حفاظت فرما سکے اور بیل گاڑی سوار بھی اپنی راہ ہو لے؟

لیکن ایسی کوئی تدبیر اس کی عقل میں سمانے نہ پا رہی تھی جس سے بیک وقت دونوں کے مسئلے حل ہو سکیں۔

بہت سوچنے کے بعد آخر اسے ایک مناسب تدبیر سوجھ گئی اس نے خود غرض بننے کا فیصلہ کر لیا اور یہ سوچ لیا کہ چاہے بیل گاڑی والا کیسی ہی سنگین پریشانی سے دوچار ہو وہ کسی صورت بھی اسے گزرنے کے لئے راستہ نہیں دے گا وہ اندھا اور بہرہ ہونے کا ناٹک کرے گا اور اس ناٹک کو اس وقت تک جاری رکھے گا جب تک کہ وہ اپنا وظیفہ مکمل نہیں کر لیتا۔

اب جبکہ وہ اپنی دانست میں جنات کو شکست دے چکا تھا پھر وہ کیسے ایک انسان کو اپنی کامیابی کی راہ میں حائل ہوتے دیکھ سکتا تھا؟ یہی سوچ کر اس نے اپنے دل میں یہ پکا پروگرام ترتیب دے دیا کہ وہ بیل گاڑی والے کی ''راستہ دینا'' کی پکار پر قطعی کان نہیں دھرے گا اور نا ہی اپنی آنکھیں کھول کر اس کی جانب دیکھے گا۔

اگرچہ وہ اپنے دل میں یہ فیصلہ کر کے قدرے مطمئن ہو کر بیٹھ گیا اور پڑھائی بھی شروع کر دی لیکن لحہ بہ لحہ قریب ہوتی بیل گاڑی اور بیل گاڑی کے پہیوں سے پیدا ہونے والی آواز اس کے تسلسل پر اثر انداز ہونے کے علاوہ اس کے حواسوں پر ضربیں سی لگا کر اسے اذیت پہنچانے کا سبب بن رہی تھی۔

مزید چند لمحات کے اندر بیل گاڑی بالکل صاف اور واضح دکھائی دینے لگی اس نے اپنی بند آنکھوں پر سے ذرا سی پلکیں اٹھا کر دیکھا کہ لکڑی کی بنی گاڑی میں دو بیل جتے ہوئے تھے دونوں بیلوں کی رنگت سفید تھی اور دونوں ہی بیل ناقابل یقین حد تک صحت مند تھے۔

اب بیل گاڑی اس کے بہت قریب آ چکی تھی اس نے فوراً سے بھی پہلے اپنی آنکھیں پوری بند کر لیں بابو ذہنی طور پر اس بات کا منتظر رہا کہ کسی بھی لمحے ایک مردانہ آواز اس کی سماعتوں سے آن کر ٹکرائے گی اور اسے مخاطب کر کے کہا جائے گا۔

''اے چھوکرے! راستے سے ہٹ مجھے آگے جانا ہے۔''

لیکن ایک کے بعد ایک لحہ آگے کی جانب سرکتا رہا اور ایسی کوئی آواز اس کی سماعتوں سے آن کر نہیں ٹکرائی اس کا انتظار! انتظار ہی رہا جانے کیا بات تھی؟ کوئی اسے مخاطب ہی نہیں کر رہا تھا؟ بیل گاڑی بھی اس سے چند قدموں کے فاصلے پر گویا کھڑی ہی رہ گئی تھی۔

وہ اپنے اندر ایک اضطراب، ایک بے چینی سی محسوس کرنے لگا اس کے اندر کا تجسس اسے اکساتا رہا کہ وہ آنکھیں کھول کر دیکھے کہ کیا ماجرا ہے؟ کیا بات ہے کہ کوئی آواز، کوئی آہٹ تک سنائی نہ دے رہی تھی؟ اور بالآخر اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر آہستہ آہستہ اس نے آنکھیں کھول دیں اور دھیرے دھیرے چہرہ گھما کر دیکھا۔

بیل گاڑی بدستور اس سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی اس پر ایک مرد اور ایک عورت سوار تھے جو بابو کے وجود کو نظر انداز کئے بیل گاڑی سے نیچے اتر پڑے۔

عورت و مرد کے نیچے اترتے ہی آٹھ اور دس کی عمر کے دو بچے بھی ایک چادر سے برآمد ہوئے شاید وہ دونوں بچے چادر اوڑھے سو رہے تھے اور اب بیل گاڑی رکتی دیکھ کر بیدار ہو کر عورت و مرد کی پیروی کرتے ہوئے بیل گاڑی سے نیچے کود پڑے۔

عورت و مرد تو عام انسانوں جیسے ہی تھے لیکن وہ دونوں بچے قطعی عام بچوں جیسے دکھائی نہ دے رہے تھے ان کے جسم تارکول کی مانند سیاہ اور چکیلے تھے اور جسم کی نسبت ان کے سر اس قدر بڑے تھے کہ وہ کوئی اور ہی مخلوق دکھائی دے رہے تھے وہ لباس کے تکلف سے بھی آزاد تھے البتہ ستر پوشی کے لئے لنگوٹ کس رکھی تھی۔

''اماں! بہت بھوک لگ رہی ہے کچھ کھانے کے لئے دو نا۔'' ایک بچے نے عورت کا دامن پکڑ کر ہلاتے ہوئے لاڈلے پن کا مظاہرہ کیا۔

''یہ کھانے کا کون سا وقت ہے؟'' مرد نے بچے کو غصے سے گھور کر کہا۔

''میرے بچوں پر غصہ کیوں کر رہے ہو؟ انہوں نے کھایا ہی کیا ہے، یہ دونوں تو تمام راستے پڑے سو رہے تھے اب جاگے ہیں تو بھوک تو لگے گی نا۔'' عورت نے جواب دیا۔

''پھر کیا کریں؟ ابھی تو بہت سفر باقی ہے۔'' مرد نے تشویش کا اظہار کیا۔

''میرا خیال ہے یہ جگہ بھی مناسب ہے اور ہمارے سامان کے ساتھ بکری کا ایک بچہ بھی ہے تم کچھ لکڑیاں جمع کر کے آگ سلگاؤ میں بچوں کو بکری کا بچہ بھون کر دیتی ہوں۔'' عورت نے کہا۔

''یہ ٹھیک ہے! یہاں سوکھی جھاڑیاں بھی بہت ہیں...... آگ بھی جلدی بھڑک اٹھے گی، میں لکڑیاں اکٹھی کر کے لاتا ہوں۔'' مرد نے خوش ہو کر جواب دیا اور لکڑیوں کی تلاش میں چل پڑا۔ ''ڈھیر ساری لکڑیاں لانا آگ جتنی زیادہ بھڑکے گی گوشت اتنی ہی جلدی تیار ہوگا۔'' عورت نے ہانک لگائی۔

''''اچھا! سمجھ گیا۔'' مرد کا رخ قبرستان کی جانب تھا وہ لمبے لمبے قدم اٹھائے چلے جا رہا تھا۔

بابو نے دیکھا کہ وہ ایک مضبوط تن و توش اور قد آور شخصیت کا مالک تھا اس کی جلد بھی چکیلی اور رنگت کالی تھی اس نے ڈھیلا ڈھالا کرتا اور دھوتی زیب تن کر رکھی تھی۔

اس نے ایک تناور درخت کا سرسری جائزہ لیا اور اگلے ہی لمحے درخت کے موٹے تنے سے جا لپٹا...... بظاہر وہ درخت سے لپٹا ہوا محسوس

ہو رہا تھا لیکن درحقیقت وہ اپنی جان کا بھرپور زور لگائے درخت کو زمین سے اکھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر بابو نے دیکھا کہ لمحے بھر کے اندر اس نے جڑ سمیت درخت کو زمین سے اکھاڑ کر رکھ دیا اور اپنی بانہوں کے حلقے میں بھاری بھرکم درخت کو اٹھائے نہایت سہولت سے اٹھا کر بابو کی نگاہوں کے سامنے زمین پر رکھ دیا۔

ایک بار پھر جنات کو اپنے سامنے متحرک پا کر خوف اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں بس کر رہ گیا وہ اس طرح بے حس و حرکت بیٹھا اپنی نگاہوں کے سامنے حرکت کرتے جنات کو گھورتے رہ گیا جیسے کسی ساحر نے کوئی سحر پھونک کر اسے ہلنے جلنے سے معذور کر ڈالا ہو۔

عوت نے بیل گاڑی پر سے بکری کے بچے کو اٹھایا اور وہ بھی بابو کی نگاہوں کے سامنے آن کر بیٹھ گئی بیٹھتے ہی اس نے اپنے ہاتھ کی ایک انگلی کے نوکیلے ناخن سے بکری کے بچے کی کھال پر ایک بڑا سا چر کا لگایا اور اگلے ہی لمحے کٹی ہوئی کھال کے اندر اپنا پورا ہاتھ گھسیڑ کر نہایت سہولت سے بکری کے زندہ بچے کے جسم سے اس طرح کھال اتارنے لگی جیسے وہ کھال نہیں بلکہ بال اتار رہی ہو۔

''اف خدایا۔'' بکری کے بچے کے منہ سے کرب و اذیت سے بھرپور ''میں میں'' کی ایسی اعصاب شکن آوازیں خارج ہونے لگیں کہ بابو کا دل بند روالے کی ڈگڈگی کی مانند بجنے لگا۔

سونے پر سہاگہ! ان جنات کے بچوں کی ہنسی قہقہوں کی آوازوں نے کیا جو وہ ایک دوسرے کے آگے پیچھے بھاگتے ہوئے مارے خوشی کے بلند کر رہے تھے یہ سب تو تھا اس کے علاوہ ان بچوں کے قدموں کی دھمک سے زمین کا سینہ اس طرح لرزا تھا جیسے بدمست ہاتھی دوڑے چلے جا رہے ہوں۔

بکری کے بچے کی کرب و اذیت میں ڈوبی میں میں، جنات کے بچوں کی دہشت انگیز ہنسی سناٹے کے سینے میں شگاف ساڈالتی ایک ایسی بھیانک گونج لئے ہوئے تھی کہ بابو کے دماغ کی رگیں جھن جھنا اٹھیں۔

حیرت انگیز اور ناقابل یقین بات یہ تھی کہ ان جنات نے بابو کے وجود کو اس طرح نظرانداز کر رکھا تھا جیسے انہیں سرے سے بابو کا وجود دکھائی نہ دے رہا ہو یا ان کی نظر میں بابو کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو لیکن انہوں نے چاہے بابو کو نظرانداز کر رکھا ہو بابو انہیں کیسے نظرانداز کر سکتا تھا؟ چاہے انہیں بابو کا وجود دکھائی نہ دے رہا ہو لیکن بابو تو انہیں دیکھ رہا تھا اور ان کی دہشت انگیز حرکات نے بابو کو گوشت پوست کے ایسے مجسمے میں تبدیل کر کے رکھ دیا تھا جو صرف سن اور دیکھ سکتا تھا لیکن حرکت کرنے سے معذور ہو چکا تھا۔

''اس درخت کو جلا کر آگ بھڑکاؤ۔'' عورت نے گویا حکم سنا دیا۔

اور بابو نے دیکھا کہ وہ آدمی اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہلا دور کھڑے رہ کر اس نے اپنے ہونٹوں کو سیٹی بجانے والے انداز سے سکیڑ کر پہلے بہت ساری ہوا اپنے اندر کھینچی اور پھر اپنے دونوں گال پھلا کر وہی ہوا درخت کی جانب اچھال دی لیکن حیرت انگیز طور پر اس کے لبوں سے ہوا کے بجائے ایک شعلہ سا سنسناتا ہوا نکلا اور درخت کے موٹے تنے سے جا ٹکرایا، شعلے کے ٹکراتے ہی ایک دم سے درخت کے تنے کو آگ نے پکڑ لیا اور صرف لمحے بھر کے اندر پورا درخت کسی کی چتا کی مانند کڑکڑاتے ہوئے جلنا شروع ہو گیا اردگرد کا ماحول بھی روشن ہو کر رہ گیا۔

''یہ آگ تو بہت کم ہے کچھ اور سوکھی لکڑیاں لے کر آؤ۔''

مرد نے اپنے اطراف نگاہیں دوڑائیں اور چند لمحوں کے اندر چھوٹے بڑے تمام درخت جڑوں سمیت اکھاڑ کر لے آیا اور آگ میں جھونک دیا۔

آگ مزید شدت سے بھڑک اٹھی اور آگ کا پھیلاؤ بھی اتنا بڑھ گیا کہ بابو کو ان جنات کے وحشت انگیز چہرے کے نقوش بھی بالکل واضح دکھائی دینے لگے۔

''اتنی سی آگ پر اس بکری کے بچے کو میں کیسے بھون پاؤں گی؟ کچھ اور آگ میں لا کر ڈالو۔'' عورت نے اپنی پھٹی ہوئی آواز میں غصے کا اظہار کیا۔

'' کچھ اور؟'' مرد نے ایک بار پھر اپنے اردگرد کا جائزہ لیا جب اسے ایسی کوئی چیز سجھائی نہ دی جو وہ آگ میں جھونک کر آگ کو مزید بھڑکا سکتا تو اس نے دونوں بیل گاڑی سے الگ کیے اور لکڑی کی بنی گاڑی اٹھا کر دور ہی سے آگ کی جانب اچھال کر رکھ دی۔

''شرشررز'' کی خوف ناک ترین آواز اس کے ساتھ آگ ایک دم سے اس قدر بھڑک اٹھی کہ آگ کے کڑکڑاتے ہوئے شعلے آسمان کی بلندی کو چھونے لگے۔

اسی آگ کی وجہ سے ویران وغیر آباد علاقے کے طول وارض میں دن کا سا اجالا پھیل کر رہ گیا وہ بھی تپش سی محسوس کرنے لگا۔

''اس کے دل کی دھڑکنیں اس قدر تیزی سے دوڑنے لگیں جیسے دوڑ کے عالمی مقابلے میں اول نمبر پر آنے کی مشق کر رہی ہوں۔

بھڑکتے ہوئے الاؤ نے ان کے چہرے پر برستی وحشت و بربریت میں کئی گنا اضافہ کر ڈالا تھا۔

''آگ کم ہے کچھ اور لا کر ڈالو۔'' عورت ایک بار پھر چیخی۔

مرد نے دائیں بائیں نگاہیں دوڑانے کی زحمت کیے بغیر اپنا ایک بیل اٹھا کر آگ میں جھونک دیا۔

''آگ ابھی بھی کم ہے۔'' عورت باؤلی کتیا کی مانند غرائی۔ مرد نے دوسرا بیل بھی اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر سر سے بلند کیا اور اسے بھی آسمان کو چھوتی جہنم کی سی آگ میں پھینک دیا۔ آگ مزید بلندی کی جانب سفر کرنے لگی۔

''اف خدایا! بابو کو وہ آگ کسی عفریت سے کم دکھائی نہ دے رہی تھی جو اس قدر غضب ناک آواز سے لہرا رہی اور چنگھاڑ رہی تھی جیسے پوری دنیا کو نگلنے کا اعلان کر رہی ہو۔

بابو کا پورا جسم پسینے کے منہ زور اخراج کے باعث تر ہو کر رہ گیا۔

''اتنی سی آگ پر کچھ نہیں پکنے والا۔'' عورت کی دہشت انگیز آواز نے ذرے کو ہلا کر رکھ دیا۔

مرد کو بھی غصے نے آن گھیرا اس نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا جب اس کی نگاہوں کی دوربین کوئی ایسی چیز نہ پا سکی جو آگ میں جھونک کر آگ بڑھائی جا سکے تو اسے ایک دم سے شدید طیش آ گیا اور اس نے اپنا ایک بچہ اٹھا کر آگ کی جانب اچھال دیا۔

بچے کا وجود تیر کی مانند سنسناتا ہوا آگ کے سمندر میں جا گرا۔ بابو کو اپنے جسم سے جان سی نکلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

''کچھ اور لاکر ڈالو۔'' عورت کے ان الفاظ کی گردان نے مرد کو گویا پاگل سا کر کے رکھ دیا اس کا غصہ اتنا بڑھا کہ اس کے سانسوں کی آواز گھوڑے کی پھنکاروں سے مشابہہ محسوس ہونے لگی وہ اس قدر غضب ناک ہو کر رہ گیا کہ اس نے اپنا دوسرا بچہ بھی اپنے ہاتھوں کے پنجوں میں دبوچ کر اٹھایا اور اسے بھی آگ کے بپھرے ہوئے سمندر میں پھینک دیا۔

خوف بابو کی نس نس میں سرایت کر گیا اس کی حالت غیر ہونے لگی اس کا پورا وجود سنسنا ہو کر رہ گیا حرکت کرنا تو ایک طرف رہا اسے سانس تک لینا یاد نہ رہا۔

''کچھ اور لاکر ڈالو۔'' عورت کی غضب ناک آواز پھر ابھری۔

مرد دونوں ہاتھوں سے اپنے جھاڑ جھنکار جیسے بال نوچ کر رہ گیا، غصے کی شدت کے باعث اس کا سینہ تیزی سے پھول پھول کر پچکتا رہا، اس کے لبوں سے بھیانک ترین غراہٹیں خارج ہونے لگیں وہ اپنی قہر برساتی نگاہوں سے اس طرح اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگا جیسے اگر اسے کوئی ایسی چیز دکھائی نہ دے جو وہ آگ میں جھونک کر آگ کو مزید بھڑکا سکے تو وہ غصے سے پوری کائنات کو الٹ کر رکھ دے گا۔

''یہاں وہاں کیا دیکھ رہا ہے؟ ذرا اپنے پیچھے گھوم کر دیکھ۔'' عورت نے چہرہ گھما کر غصہ سے بابو کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اس کے موٹے بھدے لبوں پر حد درجہ بھیانک مسکراہٹ کا بسیرا تھا۔

عورت کو اپنی جانب گھورتے پاکر بابو کے ساکت وجود کو ایک جھٹکا سا لگا اسی جھٹکے کے باعث اس کے دل و دماغ اور اعصاب پر چھائی خوف کی برف چٹخنا شروع ہوگئی یہ اس کا وہم نہیں ایک حقیقت تھی کہ عورت کے لبوں سے ادا ہونے والے الفاظ سو فیصد بابو کے لئے کہے گئے تھے اس نے بابو کے وجود کی نشان دہی فرمائی تھی اسی لئے مرد برق رفتاری سے اپنے پورے وجود سمیت پلٹ کر بابو کو دیکھنے لگا۔

''یہ بھی بہت تگڑا ہے...... اسے بھی اٹھا کر اس آگ میں جھونک دے۔'' عورت نے کہا۔

مرد کی آنکھوں میں درندگی سے بھرپور چمک پیدا ہوگئی وہ زمین پر ''دھب دھب'' پاؤں مارتا ہوا اس کی جانب بڑھنے لگا اس کی شعلوں کی مانند سلگتی ہوئی نگاہیں بابو کے چہرے پر ہی جمی ہوئی تھیں وہ جس غضب ناک انداز سے اس کی جانب بڑھے چلا آ رہا تھا ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک دم سے بابو کے وجود کو اٹھا کر آگ میں پھینکنے کے بجائے اس کے جسم کے ایک ایک عضو کو بے دردی سے اس کے جسم سے الگ الگ کر کے باری باری آگ کی جانب اچھالے گا اور یہی وہ دہشت ناک تصور تھا جس نے بابو کے ہوش اڑا کر رکھ دیئے۔

کیا وہ ایک ایسے شخص سے رحم کی امید رکھ سکتا تھا جس نے تمام نباتات آگ میں جھونک کر رکھ دیئے ہوں، یہاں تک کہ اس نے بیلوں سمیت اپنی بیل گاڑی اور اپنے بچوں تک کو آگ میں غرق کر کے ختم کر ڈالا تھا۔ ''نہیں۔'' ایسے بے رحم و سفاک شخص سے رحم کی بھیک طلب کرنا بیکار ہی تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جہنم جیسی خوف ناک آگ میں زندہ جلنے کے تصور نے اسے اس قدر خوف زدہ و ہراساں کر ڈالا کہ بھیانک صورت شخص کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا...... یہ خوف کی بے انتہا زیادتی کا ہی اثر تھا کہ اس کی ٹانگیں بھی اس کا ساتھ نہ دے

پا رہی تھیں شدید کپکپاہٹ کے باعث وہ ایک نہ دو کئی بار لڑکھڑا کر گرا لیکن موت کے خوف یا جہنمی آگ میں زندہ جلنے کے تصور نے اسے ہمت کا دامن چھوڑنے نہ دیا۔

''جلدی جا! اسے دبوچ کر لے آ...... یہ کہیں بھاگ نہ جائے۔'' عورت کی آواز نے مرد کے قدموں میں بجلی سی بھری وہ مزید لمبے ڈگ بھرتا ہوا بابو کی جانب جھپٹنے والے انداز سے بڑھنے لگا اور قریب...... اور قریب...... اور قریب! اور اس سے پہلے کہ وہ مزید غضب ناک ہو کر اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن دبوچ پاتا......؟

بابو کے لبوں سے خوف و دہشت میں ڈوبی ایک دلخراش چیخ آزاد ہو کر رہ گئی اور وہ حصار کی لکیر پھلانگتا ہوا انجانی سمت دوڑ پڑا۔

''بھاگ گیا...... پکڑو اسے پکڑو۔'' عورت کی آواز اس کی سماعت سے آن کر ٹکرائی ہی تھی کہ اس کے پاؤں میں گویا بجلی سی بھر گئی اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں بھاگے جا رہا تھا؟ اس نے کون سی سمت اختیار کی تھی؟ وہ تو بس بنا سوچے سمجھے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ برگد والے بابا کی ہر ہدایت ہر نصیحت وہ قطعی فراموش کر بیٹھا تھا بلکہ خوف نے ڈسٹر کی مانند اس کے دماغ کے تختۂ سیاہ پر رقم ایک ایک حرف کو مٹا کر رکھ دیا تھا۔

''اماں! تو فکر نہ کر ہم ابھی اسے پکڑ کر لاتے ہیں۔'' وہ بچے! جنہیں غضب ناک شخص آگ میں جھونک چکا تھا وہ آگ کے سمندر سے باہر نکلے ہوئے یک زبان ہو کر بولے اور بابو کے پیچھے لپکے۔ ''بھیں بھیں'' کی دہشت انگیز آواز میں ڈکارتے ہوئے دونوں بیل بھی آگ سے زندہ سلامت باہر آن کودے اور اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔

ان کے قدموں کی دھمک سے پوری زمین لرز اں تھی اس نے اپنے جسم کی تمام تر قوت بھاگنے میں صرف کر دی وہ اپنی زندگی کی تیز ترین رفتار سے بنا رکے بھاگتے چلا گیا دونوں بچے اور ڈکارتے ہوئے بیل بھی اس کے تعاقب میں دوڑے چلے آ رہے تھے۔

بھیانک صورت بچوں کی دہشت انگیز چیخیں اور بیلوں کی ہیبت ناک ڈکار کی آوازوں نے ایک قیامت سی برپا کر رکھی تھی۔

اس لیے اس کے دماغ سے برگد والے بابا کی یہ ہدایت بھی محو ہو کر رہ گئی تھی کہ۔ ''بھاگتے ہوئے پیچھے مڑ کر مت دیکھنا۔'' وہ ہر چند لمحوں بعد بے اختیار گردن گھما کر پیچھے دیکھے جا رہا تھا اور ان بچوں اور بیلوں کو بدستور اپنے تعاقب میں پا کر اس کے خوف میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔

یونہی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی غلطی کا اسے یہ خمیازہ بھگتنا پڑا کہ راستے میں حائل ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر وہ ''دھب'' سے زمین پر گر پڑا۔

بھاگتے اور ڈکراتے ہوئے موٹے تازے بیل اس کی جانب بڑھتے رہے ان کے منہ سے غیض و غضب کی زیادتی کے باعث جھاگ خارج ہو رہی تھی انہیں اپنے قریب آتے دیکھ کر بابو کے دیوتا کوچ کر گئے اس نے ایک بار پھر اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کی ٹانگوں نے اس کا ساتھ نہ دیا بے تحاشا بھاگنے کے باعث اس کی ٹانگیں جواب دے چکی تھیں۔

خونخوار بیلوں کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ بابو کو ناقابل تلافی چوٹ پہنچائے بغیر ٹلنے والے نہ تھے یہ بھی غنیمت تھی کہ جنات کے بچے دکھائی نہ دے رہے تھے خدا جانے وہ دانستہ لوٹ گئے یا اسے دھوکہ دینے کے لئے اپنے وجود اس کی نگاہوں سے پوشیدہ کر لئے تھے تاکہ ایک دم سے اس پر حملہ آور ہو سکیں؟ بہر حال ان سے نمٹنا تو بعد کی کہانی تھی پہلے تو بابو کو ان خوف ناک بیلوں سے خود کو محفوظ رکھنا تھا۔

بابو نے دیکھا کہ اس کے ایک جانب صاف وشفاف پانی کی لہریں اچھالتی ایک چوڑی سی لیکن گہری جھیل تھی جس میں چھلانگ لگانے کا واضح مطلب یہی تھا کہ ایک جانب سے موت سے دامن چھڑا کر دوسری جانب موت کے منہ میں خود کو دھکیل دینا......اور دوسری طرف سڑا ہوا بدبودار پانی تھا جسے کیچڑ کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

بابو کو ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا اور سوچنے کے لئے اس کے پاس پل بھر کی مہلت تھی اور اس سے پہلے کہ بابو کسی ایک جگہ کا انتخاب کرنا چاہتا ڈکراتے ہوئے دونوں بیل اس کے قریب آن پہنچے ان میں سے ایک بیل نے بابو کو ایسی زوردار ٹکر رسید کی کہ اس کا وجود فٹ بال کی مانند فضا میں بلند ہو کر رہ گیا اور چند لمحوں تک فضا میں چکراتے رہنے کے بعد چھپاک سے بدبودار کیچڑ پر جا گرا خدا جانے! وہ کیچڑ تھی یا کوئی دلدل؟ غیر محسوس طور پر اس کا وجود اندر دھنسنے لگا اور اس سے پہلے کہ دلدل اس کے وجود کو نگلنے میں کامیاب ہو پاتی اس نے اپنے سر کے اوپر جھولتی ایک درخت کی شاخوں کو پکڑ کر اپنے آپ کو دلدل سے آزاد کیا لیکن یہ دیکھ کر بھک سے اس کا دماغ اڑ گیا کہ وہ خوفناک بیل اس کے پاس ہی کھڑے غیض وغضب سے اس طرح پھنکار رہے تھے کہ ان کے نتھنوں سے گویا آگ کی لپٹیں خارج ہو رہی تھیں اور وہ اپنے کان کھڑے کئے اس کے اٹھنے کے منتظر دکھائی دے رہے تھے......لیکن انہوں نے اس کے اٹھنے کا انتظار فضول جانا اور اسے رگیدتے ہوئے بہت دور لے گئے۔"

"بچاؤ! کوئی ہے جو مجھے بچائے؟ خدا کے لئے اگر کوئی میری پکار سن رہا ہے تو آن کر مجھے ان خونی بیلوں سے بچائے۔

وہ زور زور سے چیختا چلاتا رہا، مدد کے لئے پکارتا رہا لیکن اس اجاڑ اور ویران جگہ پر کوئی دور دور تک اس کی چیخ وپکار اور مدد کی صدائیں سننے والا نہ تھا۔

دونوں خونخوار بیلوں نے دیر تک اپنی بھڑاس نکالی اور اس کے وجود کو یہاں سے وہاں رگیدتے رہے اور جب انہوں نے بابو کو نیم بے ہوشی کے سمندر میں ڈبکیاں لگانے پر مجبور کر دیا تو جانے کے ارادے سے پلٹ گئے۔

سر سے پاؤں تک وہ گندی کیچڑ میں ویران سی جگہ پر بے یار و مددگار پڑا رہا اس کے کلف لگی سفید رنگ کی شلوار قمیض گندگی کی پوٹ بن چکے تھے اگر ایسی حالت میں کوئی بھولے بھٹکے اس جگہ آن نکلتا تو اسے یقیناً ایک بھوت سمجھ کر بھاگ کھڑا ہوتا۔

جب کئی لمحات کے بعد اس کے حواس ذرا بحال ہوئے تو اس نے سوچا کہ وہ جھیل کے صاف پانی سے پہلے اپنا حلیہ کچھ درست کر لے اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کے جسم کی ہڈیاں ٹوٹنے سے محفوظ رہیں تھیں تاہم جسم پر لگنے والی چوٹیں بھی کچھ کم اذیت ناک نہ تھیں بعض تو اتنی شدید نوعیت کی تھیں کہ ذرا سا جسم کو حرکت دینے کی کوشش اسے سسکاری بھرنے پر مجبور کر دیتی۔

اس نے اپنی ہمت کو یکجا کیا اور صاف وشفاف پانی کی جھیل کی جانب قدم بڑھانے شروع کر دیئے ابھی اس نے دو قدم ہی آگے بڑھائے تھے کہ سناٹے کے احترام کو مجروح کرتی اور طول وارض میں گونج سی پیدا کرتی بیلوں کے ڈکرانے اور "دھب دھب" بھاگنے کی آوازوں نے اسے بری طرح سٹپٹا کر رکھ دیا اس نے دیکھا کہ سامنے ہی ایک اونچا درخت کھڑا تھا وہ اپنی ہر اذیت اور تکلیف فراموش کر بیٹھا اور بھاگتے ہوئے گھنے درخت کی شاخیں پکڑ کر درخت کے چوڑے ومضبوط تنے پر اپنے پیر جما دیئے اور تیزی سے درخت پر چڑھ گیا۔

اس نے دیکھا کہ چند لمحوں کے اندر دونوں خونخوار بیل اسی درخت کے نیچے آن کر کھڑے ہو گئے جس پر چڑھ کر اس نے ان بیلوں سے اپنی زندگی بچانے کی ایک کوشش کی تھی ورنہ یہ خونخوار اور غیض و غضب سے بھرے ہوئے بیل آج اس کی جان لے کر دم لیتے اور ان کے تیور یہی بتلا رہے تھے کہ وہ بابو کو تڑپا تڑپا کر اور اذیتیں پہنچا کر مارنے کا تہیہ کئے ہوئے تھے۔

وہ دم سادھے درخت کی گھنی شاخوں کے درمیان دبکے بیٹھا رہا اپنے کپڑوں پر لگی کیچڑ کی اعصاب شکن بد بو سے اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا اور یہ دیکھ کر اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا کہ غضب ناک بیلوں نے درخت کو ٹکریں مارنا شروع کر دیں اور ایسا کرنے سے ان بیلوں کا مقصد اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا کہ وہ بابو کو درخت سے نیچے گرانا چاہتے تھے۔

پہلے ایک بیل چند قدم دور ہٹ کر ایک دم سے دوڑتا ہوا آتا اور درخت کے چوڑے و مضبوط تنے کو ایک بھرپور ٹکر رسید کرتا اسی دوران دوسرا بیل اپنی پوزیشن سنبھال لیتا اور جب پہلا بیل درخت کو ٹکر رسید کر کے پیچھے ہٹتا عین اسی لمحے دوسرا بیل بھاگتے ہوئے اپنا سر درخت کے تنے سے آن ٹکراتا......

آف خدایا! ان غضب ناک بیلوں کی وحشیانہ ٹکروں سے مضبوط درخت کا تنا اس بری طرح ہل کر رہ جاتا جیسے کسی بھی لمحہ اپنے جڑوں سمیت زمین پر گر پڑے گا...... بذات خود بابو کے لئے اپنے وجود کو سنبھالے رکھنا مشکل ہو رہا تھا اس نے اپنی پوری قوت سے درخت کی شاخوں کو پکڑ لیا تھا تاکہ وہ غضب ناک بیلوں کی ٹکر سے اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے زمین بوس ہو کر نہ رہ جائے اور زمین پر گرنے کا مطلب تھا غضب ناک بیلوں کو ایک بار پھر تفریح مہیا کرنا جو اسے اب کسی صورت گوارہ نہ تھا یہی وجہ تھی کہ وہ ہاتھوں کی ہتھیلیاں چھل جانے کے باوجود شاخوں کو مضبوطی سے پکڑے بیٹھا رہا اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اسے اپنی ماں شدت سے یاد آنے لگی۔

''خدا جانے کب درخت گر پڑے اور وہ......؟'' اس سے زیادہ وہ سوچ نہیں پایا کیونکہ اس نے دیکھا کہ غضب ناک بیل درخت کو ٹکریں مار مار کر ہانپنے لگے تھے اور جب ان بیلوں نے یہ اندازہ کر لیا کہ وہ اس درخت کو گرانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے تو وہاں سے چلے گئے۔

بابو نے دونوں بیلوں کو جاتے دیکھ کر سکون کی طویل سانس خارج کی اور ہاتھوں کی گرفت کھول کر اپنی زخمی زخمی ہتھیلیوں کو تکنے لگا۔

بابو نے یہ سوچ کر درخت سے اترنا گوارہ نہ کیا کہ کہیں وہ خونخوار بیل اسے بے وقوف نہ بنا رہے ہوں ایسا نہ ہو کہ وہ درخت سے نیچے کودے اور وہ ایک دم سے پھر آن وارد ہوں اور اس کی درگت بنانی شروع کر دیں اس لئے درخت سے نیچے کودنے کو موت کے منہ میں کودنا جان کر وہ درخت کی شاخوں کے درمیان ہی چھپا بیٹھا رہا۔

چند لحات ہی سکون سے گزرے ہوں گے کہ اس کی سماعتوں سے کچھ عجیب و غریب آوازیں آن کر ٹکرائیں اس نے توجہ دی تو ایسا محسوس ہوا جیسے دور کہیں کچھ عورتیں کسی بات پر جھگڑ رہی ہوں اور سب عورتیں ناک سے آواز نکال کر کچھ بول رہی ہوں......اور جب بابو نے ان آوازوں پر اپنی مکمل توجہ مبذول کر کے آواز کی سمت کا اندازہ لگانا چاہا تو اس خیال نے اس کے ہوش اڑا کر رکھ دیئے کہ یہ آوازیں کہیں دور سے نہیں بلکہ اسی درخت کی اوپر والی شاخ سے آ رہی تھیں بابو نے بے اختیار گردن اٹھا کر دیکھا اس کے دیکھتے ہی آواز آنا بند ہو گئی پندرہ تاریخ کے چاند کی روشنی میں

اس نے دیکھا کہ اوپر والی شاخ پر کسی عورت کا تو کیا کسی چڑیا کے بچے تک کا وجود نہ تھا لیکن ایک دھوئیں کا لہرتا ہوا مرغولہ سا نہایت برق رفتاری سے اس کے وجود کو چھوتا ہوا گزر گیا بظاہر وہ دھوئیں کا مرغولہ تھا لیکن جب دھوئیں کے اس مرغولے نے بابو کو چھوا تو ٹھوس ہاتھوں کا لمس محسوس کر کے بابو کی جان ہی نکل کر رہ گئی اور اس سے پہلے کہ وہ اس نئی مصیبت کے متعلق کچھ بھی سوچ پاتا اگلے ہی لمحے دھوئیں کا ایک اور مرغولہ اس کی پیٹھ پر ایک ضرب رسید کرتا آگے بڑھ گیا ضرب اس قدر قوت سے بھرپور تھی کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اس کا وجود درخت سے کسی پکے ہوئے پھل کی طرح ”دھب“ سے زمین پر آن گرا۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنے آپ کو سنبھال پاتا کسی نادیدہ وجود نے ایک جھٹکے سے اس کا بازو نہایت بے دردی وسفاکی سے مروڑ کر رکھ دیا۔

”آ ااا۔“ اس کے لبوں سے زمین وآسمان ہلا کر رکھ دینے والی کرب انگیز چیخ آزاد ہو کر رہ گئی جو کئی لمحات تک ویران وغیر آباد علاقے میں گونج سی مچاتی مدھم پڑنے لگی گونج کے مدھم پڑنے سے قبل ہی وہ اپنا متاثرہ بازو دوسرے ہاتھ کی مدد سے پکڑے ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا اور کرب واذیت کی انتہائی زیادتی سے بلبلانے کے باوجود بھاگ کھڑا ہوا۔

”ہاہاہا...... ہاہاہا۔“ بھاگتے ہوئے اس کی سماعتوں نے قہقہوں کی آواز سنی اس نے بے اختیار گردن موڑ کر دیکھا۔

جنات کے وہی دو بھیانک صورت بچے جو حصار توڑ کر بھاگنے کے دوران جہنم جیسی بھڑکتی آگ سے نکل کر اس کے پیچھے لپکے تھے اب اسے جاتے ہوئے دکھائی دیئے گویا اس کا بازو مروڑ کر رکھ دینے والے بھی جنات کے بچے تھے جو غضب ناک بیلوں کے بعد اسے اپنے عتاب کا نشانہ بنا کر اپنے کلیجے ٹھنڈے کئے لوٹ رہے تھے۔

اسے کچھ اندازہ نہ تھا کہ وہ کب تک دوڑتا رہا؟ لیکن جب بے تحاشہ دوڑتے دوڑتے اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں اور مزید چلنا بھاگنا اس کے لئے دشوار ہو گیا تو وہ ایک جگہ بے دم سا ہو کر گر پڑا اور اپنی اکھڑی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

پیاس کی شدت کے باعث اس کے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے...... ہونٹ بھی بے تحاشہ خشک ہو کر رہ گئے تھے اور لٹکے ہوئے بازو کی اذیت الگ پریشان کئے دے رہی تھی یہی وجہ تھی کہ اس پر نقاہت اور کمزوری کے باعث غنودگی سی طاری ہونے لگی اور وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

جونہی اس نے اپنے وجود کو حرکت دینا چاہی درد و کرب میں ڈوبی ایک چیخ اس کے لبوں سے نکل کر ویرانے میں ہر سو پھیل کر رہ گئی۔ بازو کی تکلیف جہاں بے پناہ اذیت پہنچا رہی تھی وہیں جسم پر لگی جا بجا چوٹوں پر بھنبھناتی سیکڑوں مکھیاں بھی اس کے لئے ذہنی و جسمانی پریشانی کا سبب بن رہی تھیں اوپر سے آگ برساتے سورج کی جھلسا دینے والی تپش اس کے زخموں پر نمک پاشی کا فریضہ انجام دے رہی تھیں۔

اسے اس بات کا کوئی اندازہ نہ تھا کہ وہ کتنے گھنٹوں تک ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر پڑا رہا؟ تاہم اس کی چوٹوں سے بہنے والا لہو جم کر اسے یہ احساس دلا رہا تھا کہ وہ بہت طویل وقت تک بے ہوش رہا تھا۔

ہوش میں آنے کے بعد اس نے کئی بار اپنے جسم کو حرکت دینے کی کوشش کی لیکن ہر بار ٹوٹے ہوئے بازو سے اٹھنے وا لے درد کی ناقابل برداشت اذیت نے اسے آنسو بہانے پر مجبور کر دیا اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے اور آنکھیں بند کئے لیٹا رہا ویسے بھی سورج کی تیز روشنی میں اس کے لئے آنکھیں کھلی رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔

اس کے دل میں اس یقین نے جگہ سی بنانی شروع کر دی کہ کوئی دیر ہے کہ اس کے جسم میں قید روح اس کے جسم کا قفس چھوڑ کر عالم ارواح میں پرواز کر جائے گی اس کے بعد اس کا یہی جسم! جو کبھی چیتے کی مانند پھرتیلا اور چاق و چوبند ہوا کرتا تھا اور جس کی مضبوطی پر اسے فخر تھا اسے ویرانے میں یونہی بے گور و کفن پڑا سڑتا رہے گا...... یا مردار خور جانوروں کی خوراک کا ذریعہ بن کر رہ جائے گا۔

وہ مرنا نہیں چاہتا اور نا ہی اس کی یہ عمر موت سے ہم آغوش ہونے کی تھی لیکن وہ کیا کرتا؟ مجبوری و بے بسی نے اس کی ہمت کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا اور یہ بے بسی اس کے اپنے ایک غلط قدم اٹھانے کی سزا کی پاداش میں اسے بھگتنی پڑ رہی تھی۔

رات میں حصار پھلانگ کر بھاگتے وقت اس نے خوف کے باعث قطعی اس جانب توجہ نہ کی تھی کہ وہ کہاں بھاگے جا رہا ہے؟ لیکن اب وہ بھیانک رات گزر چکی تھی نئے دن کا سورج بھی اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور وہ با آسانی دیکھ سکتا تھا کہ وہ کہاں پڑا ہے؟ اس نے زمین پر لیٹے لیٹے ہی گردن گھما کر پہلے اپنے دائیں اور پھر بائیں جانب دیکھا تا حد نگاہ کسی آبادی کا کوئی نام و نشان نہ پا کر وہ کوئی اندازہ نہ لگا سکا کہ وہ کس جگہ پڑا تھا؟ ویران و غیر آباد جگہیں اس کے خیال کے مطابق سب ہی ایک جیسی محسوس ہوتی ہیں۔ جگہوں کی شناخت تو انسانی آبادیوں سے ہوا کرتی ہیں اور یہاں کوئی ایسا سائن بورڈ بھی آویزاں نہ تھا کہ وہ کچھ تو اندازہ کر پاتا کہ ان کم بخت جناتوں نے اسے بھگا بھگا کر کہاں لا کر پٹخا تھا؟ اس کا دماغ اس انجان جگہ کی شناخت کا کوئی راستہ ڈھونڈنے بھی نہ پایا تھا کہ۔

''آ ااا'' سناٹے کی دیوار میں شگاف سا ڈالتی ایک اور انتہائی کرب انگیز چیخ اس کے لبوں کا قفل توڑتی ویرانے علاقے کے طویل وارض میں پھیل کر رہ گئی۔

وہ جسم پر لگی کسی چوٹ میں اٹھنے والی ٹیسیں یا اذیت سے نہیں چیخا تھا بلکہ ایک نئی اذیت نے نزول فرما کر اسے چیخنے پر مجبور کیا تھا اور وہ اذیت کوئی ایسی نوکیلی چیز کی شکل میں تھی جو اس کی ران کے گوشت کے اندر پیوست ہوئی جا رہی تھی ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی تیز دھار خنجر کی نوک یا برف توڑنے والا نوکیلا آلہ بے دردی و بے رحمی سے اس کی ران کے گوشت گھسیڑ دے رہا ہو...... درد و اذیت کو سہنے کی کوشش میں اس کا چہرہ جھریوں

سے بھر گیا گویا وہ برداشت کی انتہائی حدود کو چھوڑ رہا تھا اس نے اسی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی گردن کو ذرا سا زمین سے بلند کر کے دیکھا اور یہ دیکھ کر وہ بے بسی کی زیادتی کے باعث ایک بار پھر آنسو بہانے پر مجبور ہو گیا کہ ابھی تو وہ زندہ تھا؟ اس کے جسم اور روح کا رشتہ ابھی قائم تھا لیکن اس کے باوجود مردار خور پرندے اسے مردہ جان کر اس کے جسم کا گوشت نوچنے کے لئے آن وارد ہوئے تھے اور کسی ماہر سرجن کی طرح اپنی نوکیلی چونچیں اس کی ران کے گوشت پر مارتے ہوئے اس کا پوسٹ مارٹم کر رہے تھے۔

''ہش ہش۔'' بابو نے ان مردار خور پرندوں کو اڑانے کی اپنی سی ایک ناکام کوشش کی لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ گدھ کسی بھی صورت میں اس کے جسم کو زندہ مان کر چھوڑ دینے پر تیار دکھائی نہ دے رہے ہیں تو زندگی بچانے کے عزم نے اس میں ہمت سی بیدار کی اور وہ کرب واذیت کو سہتے ہوئے ایک دم سے اٹھ بیٹھا اسے زندہ پا کر مردار خور پرندے اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے آسمان کی سمت پرواز کرنے لگے لیکن جو اذیت وہ اسے سونپ گئے تھے وہ سونے پر گویا سہاگہ ڈالنے والی بات تھی۔

''اگر جینا چاہتے ہو تو اس ویرانے سے نکلنے کی کوشش کرو ورنہ وہ لمحہ دور نہیں جب اس ویرانے میں بھٹکنے والی روحوں میں ایک تمہاری روح بھی شامل ہو کر رہ جائے گی اور اپنے جسم کی درگت بنتے ابھی تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔'' اس کے اندر سے آواز آئی۔

اس نے اپنے جسم کی بچی کچی توانائیاں یکجا کیں اور ہمت سے اٹھ کھڑا ہوا...... بازو کا ناقابل برداشت درد، جسم پر لگی چوٹیں اور ٹانگ کی اذیت سب کچھ زندگی بچانے کے عزم کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا۔

اب وہ بہت آہستہ آہستہ اور مر مر کر قدم اٹھا رہا تھا اور ساتھ ہی وہ اپنے اطراف اس امید سے دیکھے جا رہا تھا کہ شاید کہیں پانی کا کنواں، کوئی نہر یا کوئی چھوٹا سا چشمہ ہی دکھائی دے اور وہ اپنی پیاس بجھا سکے...... لیکن تاحد نگاہ میدان ہی میدان تھا پانی تو دور کی بات، کسی سایہ دار درخت تک کا وجود نہ تھا جس کی چھاؤں میں بیٹھ کر وہ اپنے جھلستے بدن کو ہی کچھ تسکین پہنچا پاتا لیکن خدا جانے وہ کس طرف آن نکلا تھا؟ کون سی ایسی جگہ کی حدود میں بھٹک رہا تھا؟ جہاں نہ پانی کا کوئی ذریعہ نظر آ رہا تھا اور نا ہی کوئی سایہ دار درخت! درخت تو بہت سے کھڑے تھے لیکن بالکل سوکھے اور حسرت زدہ سے!

اس کی پیاس کا اندازہ صرف وہی انسان بخوبی لگا سکتا تھا جس نے ارتالیس گھنٹوں سے زائد پیاسا رہ کر پیاس کی اذیت بھگتی ہو یا جسے جبری پیاسا رکھا گیا ہو۔

ایک بڑا سا پتھر پڑا دیکھ کر وہ اس پر جا بیٹھا۔ کس قدر حیران کن اور دہشت زدہ سی کر کے رکھ دینے والی بات تھی کہ زمین کے وسیع وعریض ٹکڑے پر اس کے علاوہ کسی ذی روح کا وجود نہ تھا وہ یہی سوچ سوچ کر پاگل ہوتا رہا کہ کیا وہ یہاں سے کبھی نکل پائے گا؟ خوراک و پانی کی عدم دستیابی اسے کب تک زندہ رکھے گی؟

وہ اپنی سوچوں میں گم بیٹھا تھا۔ ''چیں چیں'' کی عجیب وغریب آواز نے اس کی سوچوں کے شیشے کو چکنا چور کر کے رکھ دیا اس نے سوچوں کے تاریک کنویں سے باہر آن کر دیکھا تو اپنے وجود سے کچھ فاصلے پر اور نگاہوں کے سامنے ایک بڑے سے چوہے کو دیکھ کر اس کے وجود میں خوف

کی ایک سرد ترین لہر سرایت کر کے رہ گئی اور اس کا پورا وجود جھرجھرا کر رہ گیا وجہ معقول تھی۔

اس چوہے کی رنگت بالکل کالی سیاہ تھی اور ایک سرسری نظر ڈالنے پر اس چوہے کے وجود پر بلی ہونے کا گمان گزرتا کیونکہ جسمانی لحاظ سے وہ اس قدر صحت مند چوہا تھا وہ اپنی گول نقطے جیسی لال لال آنکھوں سے اسی کو گھورے جا رہا تھا ہر ایک لمحے بعد اس کا لمبا سا منہ کھلتا اور ''چیں چیں'' کی عجیب وغریب اور سوئی کی مانند چبھتی ہوئی آواز بابو کے دماغ کے تاروں کو ہلا کر رکھ دیتی۔

ایک تو ویران وغیر آباد جگہ، دوسرے دور دور تک کسی محفوظ جگہ کا نہ ہونا اور اوپر سے ایک خوف ناک چوہے کا ایک دم سے آن وارد ہونا اس کے اوسان خطا کرنے کے لئے کافی تھا۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ چوہا واقعی خوف ناک تھا یا یہ محض اس کے محسوسات تھے؟ یا ایسی ویران جگہوں پر ایسے ہی خوف ناک چوہوں کا بسیرا تھا؟ جو کچھ بھی تھا خوف ودہشت نے اسے ایک بار پھر اپنے حصار میں لینا شروع کر دیا تھا۔

''ہش ہش۔'' اس نے سلامت ہاتھ کی مدد سے خوف ناک چوہے کو بھگانے کی اپنی ہی ایک ناکام کوشش کی...... ناکام اس لئے کہ اس نے دیکھا کہ انسانوں کے سائے کو دیکھ کر راہ فرار اختیار کرنے والا یہ جانور! ایک پورے انسان کو سامنے پا کر بھی نہایت بے خوفی سے کھڑا تھا بلکہ جونہی بابو نے اسے بھگانا چاہا وہ چند قدم چل کر بابو کے اور قریب آنے لگا اور چوہے کی یہی دیدہ دلیری بابو کے دل کی دھڑکنوں کو اتھل پتھل کر گئی۔

وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے اس چوہے سے ڈرنا چاہئے یا نہیں؟ لیکن قطعی غیر ارادی طور پر وہ خوف کے جال میں الجھتا ہی جا رہا تھا۔

اور پھر اگلے ہی لمحے قطعی غیر متوقع طور پر اس بھیانک چوہے نے اس پر چھلانگ لگا دی لیکن اس سے پہلے کہ فضا میں بلند چوہے کا وجود اس کے جسم یا چہرے کو اپنے بھیانک پنجوں سے زخمی کر پاتا لمحے کے ہزارویں حصے میں بابو نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور اپنی ہر تکلیف بھول کر چوہے کی مخالف سمت میں دوڑ پڑا۔

''دھپ۔'' سے زمین پر گرتے ہی بھیانک چوہا سنبھلا اور سنبھلتے ہی بابو کے تعاقب میں دوڑ پڑا۔

دوڑتے ہوئے اس نے یونہی گردن گھما کر دیکھ لیا اور بھیانک چوہے کو اپنے تعاقب میں آتے دیکھ کر وہ مزید حواس باختہ ہو کر رہ گیا گویا جس چوہے کو وہ ایک عام چوہا ماننے سے انکاری ہو رہا تھا اب اسی چوہے کو برق رفتاری سے اپنے پیچھے دوڑتے دیکھ کر اسے یقین کرنا پڑا کہ یہ چوہا بھی دراصل چوہا نہیں تھا چوہے کے روپ میں وہ خدا کی کوئی بھی مخلوق تھی یہ طے ہے کہ اس کا مقصد بھی بابو کو کوئی ناقابل فراموش چوٹ یا اذیت پہنچانا ہی تھا یہی وہ سوچ تھی جس نے اس کے قدموں میں بجلیاں بھر دیں اور وہ نہایت تیز رفتاری سے دوڑتے ہوئے اپنے آپ کو خونخوار چوہے سے بچانے کی کوشش کرنے لگا۔

خونخوار چوہے کی دہشت میں گرفتار وہ یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ آگے ایک گہرا گڑھا پڑا ہوا تھا اور اس سے پہلے کہ گڑھا کو دیکھ کر وہ اپنے آپ کو روک پاتا لڑکھڑاتے ہوئے وہ گہرے گڑھے میں گر پڑا۔

''چیں چیں۔'' کی کئی عجیب وغریب اور دماغ کے تاروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے والی آوازوں نے اس کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ نگاہوں کے سامنے جو منظر تھا وہ اس کے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لئے کافی تھا اس کے دل کی دھڑکنیں اپنے معمول سے ہٹ کر اس قدر تیزی سے دھڑکنے لگیں

جیسے گوشت کے اس لوتھڑے جسے "دل" کہتے ہیں پھاڑ کر رکھ دیں گی۔

وجہ معقول تھی! کیونکہ اس گڑھے میں بے شمار چوہوں کا بسیرا تھا اس کے وجود تلے دب کر بھی کئی چوہے ہلاک ہو کر رہ گئے تھے۔"چیں چیں" کی دہشت انگیز آوازیں بے شمار چوہوں کے منہ سے برآمد ہو کر اس کے حواسوں کو جھنجوڑے دے رہی تھیں۔

سینکڑوں بدبودار چوہوں کے درمیان سانس لینا بھی کسی عذاب سے کم نہ تھا ہر سانس کے ساتھ گندی اور ناگوار بو جسم میں داخل ہو کر اسے ابکائیاں لینے پر مجبور کر دیتی...... لیکن مرتا کیا نہ کرتا! سانس لئے بغیر رہا نہ جاتا اور وہ کب تک اپنا سانس روکے کھڑا رہتا؟ اس گڑھے سے باہر نکلنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

ایک چوہے کے حملے سے تو اس نے خود کو بچا لیا تھا لیکن یہاں تو چوہوں کی ایک پوری بٹالین موجود تھی خونخوار چوہوں کی اس فوج سے وہ کیسے خود کو محفوظ رکھ پاتا؟

ایک کے بعد ایک چوہا اس پر حملہ آور ہو رہا تھا اس کے چہرے، بازو، گردن، دھڑ اور ٹانگیں! جسم کا وہ کون سا حصہ تھا جہاں چوہوں نے اپنے بھیانک پنجوں سے خراشیں نہ ڈالی ہوں اور اسے کاٹا نہ ہو، وہ ایک ہاتھ سے کب تک اپنا بچاؤ کرتا؟ اسے اپنی موت یقینی نظر آنے لگی۔

بابو کو جب اس بات کا یقین ہو گیا کہ وہ ان بے شمار خونخوار آدم خور چوہوں سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا تو وہ بے اختیار اللہ کی ذات پاک کو پکار اٹھا جس ہستی پر اس کے دل کو سو فیصد یقین تھا کہ اب ایک وہی ذات کامل تھی جو اس مشکل گھڑی میں اس کی حفاظت فرما سکتی تھی اور ان سینکڑوں آدم خور چوہوں کے درمیان سے اسے زندہ نکال سکتی تھی۔

اور کہتے ہیں کہ اللہ مصیبت زدہ اور دکھی لوگوں کی پکار ضرور سنتا ہے۔ بندہ چاہے لاکھ اپنے رب کو بھلائے بیٹھا ہو لیکن اللہ تعالیٰ کبھی اپنے بندوں کو نہیں بھولتا! اور بندہ کیسا ہی گنہگار نا شکرا، نافرمان اور بدکردار کیوں نہ ہو وہ جب بھی اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اسے پکارتا ہے تو وہ اپنے بندے کو مایوس نہیں کرتا۔

اور یہی کچھ بابو کے ساتھ ہوا از خود اس کا وجود بلندی کی طرف اٹھنا شروع ہو گیا یوں جیسے اس کی کمر سے کوئی نادیدہ رسہ بندھا ہو اور کوئی وجود گڑھے کے باہر کھڑا رسے کی مدد سے اسے اوپر کی جانب گھسیٹ رہا ہو اور صرف اسی پر بس نہ تھا اس کے وجود سے چمٹے ہوئے چوہے بھی اس طرح اس کے وجود سے الگ ہو کر گڑھے میں گرتے جا رہے تھے جیسے کوئی شکاری بندوق لئے ان کے وجود کا نشانہ لئے فائر کئے دے رہا ہو حالانکہ نا تو بابو کو گڑھے کے کناروں پر کوئی شکاری بیٹھا نظر آ رہا تھا اور نا ہی اس کی سماعتوں سے بندوق سے نکلی گولیوں کی آواز آن کر ٹکرا رہی تھی لیکن اس کے باوجود ایک کے بعد ایک چوہے گڑھے میں گرتے رہے اور اس کا وجود اوپر کی جانب اٹھتا رہا۔

اپنے شکار کو ہاتھوں سے نکلتے دیکھ کر بیک وقت کئی چوہوں نے اس پر چھلانگ لگا کر اس کے وجود سے چمٹنے کی کوشش کی لیکن ان چوہوں کا بھی وہی انجام ہوا جو اس کے وجود سے چمٹے ہوئے چوہوں کا ہو رہا تھا یعنی کوئی نادیدہ گولی کہیں سے آن کر ان کی زندگیوں کا خاتمہ کرتی رہی اور وہ اس کے وجود کو کسی قسم کا نقصان پہنچانا تو درکنار چھو بھی نہ پا رہے تھے۔

گڑھے کے اندر پچاسوں چھوٹے بڑے سوراخ تھے جن سے خونخوار و آدم خور چوہے اس تیزی و برق رفتاری سے برآمد ہوئے جا رہے تھے جیسے زمین انہیں اگل رہی ہو۔

وہ حیرت واستعجاب اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ سوراخوں سے برآمد ہونے والے چوہوں کو دیکھتا رہ گیا۔

گڑھے سے باہر آتے ہی اس نے چہرہ اٹھا کر تشکر بھری نگاہوں سے اپنے محسن کی جانب دیکھا اور یہ دیکھ کر بھک سے اس کا دماغ اڑ کر رہ گیا کہ اس کی نگاہوں کے سامنے کسی انسان کا وجود نہ تھا اس نے بے اختیار اپنے قرب و جوار میں نگاہیں دوڑا کر اپنے محسن کے وجود کو دیکھنا چاہا لیکن اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا دور دور تک اسے کوئی ایسا وجود دکھائی نہ دیا جسے وہ اپنا محسن کہہ سکتا جس نے سینکڑوں خونخوار و آدم خور چوہوں کے درمیان سے اسے زندہ نکال باہر کیا تھا۔

''چیں چیں۔'' کی آوازوں پر اس نے گردن گھما کر گڑھے کی جانب دیکھا تو یہ دیکھ کر اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں خوف سا در آیا کہ خونخوار و آدم خور چوہے گڑھے سے باہر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔

وہ ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا اور ہمت کر کے تیز تیز چلنا شروع کر دیا چلنا اس لئے کہ بھاگنے کی ہمت وہ اپنے اندر نہیں پا رہا تھا۔

ان آدم خور چوہوں نے اس کے چہرے و جسم کا پورا جغرافیہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا تھا ان چوہوں نے اس کے دونوں کان غائب کر ڈالے تھے چہرے و جسم کی کھال بھی بری طرح سے نوچ کر اس کے وجود کو کھال سے عاری کر ڈالا تھا اس کے وجود پر جا بجا گہرے زخم دکھائی دے رہے تھے جن سے خون بھی رس رہا تھا۔

ان آدم خور چوہوں نے جہاں جہاں سے اس کے جسم کا گوشت نوچا تھا ان متاثرہ حصوں میں اس قدر شدید جلن ہو رہی تھی جیسے وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں زندہ جل رہا ہو۔ اس کے چہرے کی ساری وجاہت خاک میں مل کر رہ گئی تھی اگر وہ اس لمحے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ لیتا تو مارے خوف کے اس کی چیخیں نکل کر رہ جاتیں کیونکہ وہ انتہائی خوف ناک صورت ہو چکا تھا یا ان آدم خور چوہوں نے اسے بنا ڈالا تھا۔

بھوک و پیاس اپنی جگہ! خوف و دہشت سے اس کا برا حال ہو رہا تھا اگر چہ وہ بھاگنے کی ہمت اپنے اندر نہ پا رہا تھا لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ آدم خور چوہوں میں سے کچھ چوہے گڑھے سے باہر آنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اب اس کے تعاقب میں دوڑے چلے آ رہے تھے تو اس نے ایک بار پھر بھاگنا شروع کر دیا، کیا کرتا؟ زندگی بچانے پر وہ بھی مجبور تھا مرنے سے اسے خوف محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن اسے ویرانے میں آدم خور چوہوں کی خوراک بن کر تڑپ تڑپ کر مرنا اسے گوارہ نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بھاگتا رہا...... بھاگتا رہا اور بھاگے ہی چلے جا رہا تھا۔

خونخوار چوہوں کا ہجوم بدستور اس کے تعاقب میں تھا اس کی ہمت کی پختہ دیوار میں بڑی تیزی سے دراڑیں پڑنے لگیں وہ کب تک ان عفریتوں سے خود کو بچا پاتا؟ اس کی زخمی زخمی ٹانگیں جواب دینے لگیں اور اس سے پہلے کہ وہ بے دم سا ہو کر گر پڑتا ایک آواز! جی ہاں ایک ایسی روح پرور آواز اس کے کٹے کانوں کے پردوں سے آن کر ٹکرائی جس نے اس کے تن مردہ میں نئی روح پھونک ڈالی، اس کی مایوس آنکھوں میں امید کے دیئے روشن ہونے لگے چوہوں کی خوراک بن جانے والے آدھ سلامت ہونٹوں پر خوشی سے مسکراہٹ نے آن کر بسیرا کر لیا وہ آواز ہی کچھ ایسی سحر

انگیز جاں فزا اور وجد طاری کر دینے والی آواز تھی۔

''اللہ ہو اکبر......اللہ ہو اکبر......'' یہی وہ سحر انگیز وروح پرور صدا تھی جس نے بابو کے اندر جینے کی نئی امید جگا کر رکھ دی۔

وہ ایک نئے جوش و جذبے سے آگے بڑھا اسے مایوسی نہیں ہوئی نگاہوں کے سامنے ایک نہر تھی اور نہر کے اس پار اسے ایک چھوٹی سی مسجد کا ہیولہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے درمیان میں حائل نہر کو حسرت سے دیکھا بظاہر نہر گہری دکھائی نہ دیتی تھی لیکن نہر کا پاٹ اتنا چھوڑا تھا کہ چھلانگ لگا کر نہر کو پار کر کے دوسری جانب کود پڑنا بابو تو کیا؟ کسی پھرتیلے چیتے کے لئے بھی قطعی آسان کام نہ تھا بابو تو پھر بھی سر سے پاؤں تک زخموں سے چور تھا اس کے لئے تو نہر کے اوپر سے چھلانگ لگا کر گزرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

اس نے بے بسی سے اپنے عقب کی سمت دیکھا خونخوار چوہوں کا ہجوم ''چیں چیں'' کی بھیانک ترین آوازیں نکالتا ہوا اس کی جانب بڑھے چلا آ رہا تھا اس نے دیکھا کہ نہر پار کرنے کے سوائے اس کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا کہ وہ نہر میں کود پڑے اور اس نے خونخوار چوہوں سے بچنے کے لئے بنا سوچے سمجھے بغیر نہر میں چھلانگ لگا دی...... عین اسی لمحے خونخوار چوہوں کا ہجوم نہر کے کنارے پر آن کر ٹھہر گیا اور اپنی چھوٹی گول موتیوں جیسی لال آنکھوں سے اسے نہر کے پانی میں ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

اس کا زخمی زخمی وجود نہر کے ٹھنڈے پانی میں اترتے ہی چند لمحوں کے لئے جھرجھرا اٹھا شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ بھاگ بھاگ کر اس کا جسم اس قدر تھک چکا تھا کہ نہانے کی طلب ان کی پیاس کی مانند ہر گزرنے والے لمحے کے ساتھ بڑھتی چلی جا رہی تھی اور اس طلب کو مٹانے کا ذریعہ میسر آتے ہی اس کے وجود میں سکون سا گردش کرنے لگا۔

اس نے الوداعی نظروں سے خونخوار چوہوں کے ہجوم کو دیکھا اور ایک ہاتھ کی مدد سے بمشکل تمام تیرتا ہوا نہر کے دوسرے کنارے کی جانب بڑھنے لگا جہاں اس کے دل میں یہ یقین سا تھا کہ اسے خوش آمدید کہنے کے لئے اس کی زندگی کھڑی ہوگی۔

دوسرے کنارے تک پہنچنے کا سفر زیادہ طویل ثابت نہ ہوا لیکن تیراکی میں اناڑی ہونے، ایک بازو ناکارہ ہونے اور زخموں سے چور جسم ہونے کی وجہ سے اسے تیر کر دوسرے کنارے تک پہنچنے میں کڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا اور اس کوشش میں وہ بری طرح ہانپ کر رہ گیا لیکن اس نے اپنے آپ کو کسی بھی لمحے کمزور نہیں پڑنے دیا۔

دوسرے کنارے پر پہنچ کر وہ فوری طور پر نہر سے باہر نہیں آیا صرف اپنا نصف دھڑ بلند کئے وہ اپنی اکھڑی ہوئی سانسوں کو اعتدال بخشنے لگا۔

یہاں پانی کی گہرائی نسبتاً کم تھی اس کے پیر با آسانی زمین کو چھو رہے تھے وہ ابھی نہر سے باہر آنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ''میاؤں میاؤں'' کی بے شمار آوازوں نے اسے چہرہ اٹھا کر دیکھنے پر مجبور کر دیا اور اپنی نگاہوں کے سامنے اور نہر کے کنارے سے کچھ فاصلے پر خونخوار بلیوں کو کھڑے پا کر وہ ایک طویل سانس خارج کرتا رہ گیا۔

''اب کیا کرو گے بابو میاں؟ یہ تو سیدھے سیدھے آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے والی بات ہوگی۔'' اس کے دل سے آواز آئی۔ اب وہ

سمجھا کہ وہ خونخوار چوہے اس کے تعاقب میں نہر کے پانی میں کیوں نہیں اتر رہے تھے؟ کیونکہ نہر کے اس طرف اگر ان خونخوار چوہوں کی حکمرانی تھی تو نہر کے اس طرف ان کی جان کی دشمن بلیوں نے اپنا تسلط جمار کھا تھا لیکن چوہے ہوں یا بلیاں؟ دونوں ہی خونخوار اور آدم خور تھے اور ان دونوں میں سے کوئی بھی بابو سے ہمدردی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ خدا جانے وہ کتنے دنوں کے بھوکے تھے اور بابو کا زندہ اور گوشت پوست سے بھرپور جسم ہی ان کی مرغوب غذا تھی۔

اگرچہ چوہوں کی نسبت بلیوں کی تعداد بہت محدود تھی لیکن تعداد میں کم ہونے کے باوجود ان میں سے ہر ایک بلی اپنی خونخواریت کے باعث سینکڑوں چوہوں پر بھاری تھی۔

ان بلیوں کی رنگت بھی کالی رات کی مانند گہری کالی سیاہ تھی، جسمانی لحاظ سے ان میں سے کوئی ایک بلی بھی عام بلیوں جیسی نہ تھی بلکہ عام بلیوں سے دگنی جسامت کی مالک تھی اور سب کی سب اپنی ہری ہری خونخوار نظروں سے بھیانک ترین غراہٹیں خارج کئے بابو کو اس طرح گھور رہی تھیں جیسے کسی بھی لمحے سب کی سب بیک وقت اس پر حملہ آور ہو جائیں گی اور اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیں گی۔

بابو ذہنی طور پر ان بلیوں کے حملے کے لئے تیار ہو گیا لیکن اللہ جانے کیا بات تھی کہ اس پر بدستور غرانے کے باوجود کوئی ایک بلی بھی حملہ نہ کر رہی تھی؟ اور بابو کو یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ وہ پانی میں کھڑا تھا شاید اس لئے وہ خون خوار بلیاں اس پر حملے کی ہمت نہ پا رہی تھیں لیکن فوری طور پر وہ یہ نہ جان سکا کہ نہر کے پانی میں ایسا کون سا طلسم پوشیدہ تھا کہ پہلے وہ خونخوار چوہے اور اب یہ خون خوار بلیاں پانی میں اتر کر نہ دے رہی تھیں ورنہ وہ چوہے اور یہ بلیاں ویران علاقے میں بسیرا کرنے والی وہ عفریتیں تھیں جو پانی تو کیا؟ قبر کی گہرائیوں میں بھی اس کی جان نہیں بخشتیں۔

یہ سوچ کر وہ اپنے کٹے پھٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا پھول کھلا بیٹھا کہ وہ جب تک اس نہر کے پانی میں کھڑا تھا گویا ان خونخوار بلیوں سے بچا ہوا تھا اپنی زندگی کی حفاظت کے لئے اس نے نہر کے پانی میں ہی اس وقت تک رہنے کا فیصلہ کر لیا جب تک کہ مایوس ہو کر یہ خونخوار بلیاں اپنے ٹھکانوں کی جانب لوٹ نہیں جاتیں۔

اس نے نہر کے ٹھنڈے پانی میں ڈبکیاں لگانا شروع کر دیں ہر ڈبکی پر وہ سر اٹھا کر خونخوار بلیوں کی جانب ایسی نگاہوں سے دیکھتا جیسے بلیوں کی بے بسی کا مذاق اڑا رہا ہو۔ ایک طویل اور عذاب ناک وقت گزارنے کے بعد یہ تفریح بڑی مشکلوں سے اسے میسر آئی تھی۔ اب تک یہ جانور! ویران علاقے میں بسیرا کرنے والی یہ آدم خور خونخوار عفریتیں اس کی بے بسی سے تفریح حاصل کرتی آئی تھیں اب اس کی باری تھی اور قدرت کی طرف سے ملنے والے اس سنہرے موقع کو وہ یونہی ضائع نہیں کر سکتا تھا اس ویران و غیر آباد اور انسانی وجود سے قطعی خالی! اس جگہ پر وقت گزاری اور گزشتہ عذاب ناک لمحات کو بھلانے کے لئے اس سے بہتر تفریح اور کیا ہو سکتی تھی؟

خدا بہتر جانتا ہے کہ آنے والے لمحات میں اسے کن حالات سے دوچار ہونا تھا؟ اس کی زندگی کے کتنے پل باقی رہ گئے تھے؟ اس لئے وہ ہر فکر سے بے نیاز ہو کر نہر کے پانی میں اپنے آپ ہنستے اور قہقہے اگلتے ہوئے ڈبکیاں لگا تا رہا اور کناروں پر کھڑی بلیوں کو بچوں کی طرح زبان نکال کر چڑاتا رہا وہ خونخوار بلیاں بھی لڑاکا عورتوں کی طرح دور کھڑی اس پر غراتی رہیں۔

اور جب غیر محسوس طور پر اندھیرا مسلط ہونے لگا تو بابو نے دیکھا کہ مایوس ہو کر خونخوار بلیوں نے اپنے اپنے ٹھکانوں کی جانب لوٹنا شروع کر دیا۔"یاہو۔" خون خوار بلیوں کو مایوسی سے لوٹتے دیکھ کر وہ پہلی بار بے حد خوش ہوا۔

لگا تار کئی گھنٹوں تک پانی میں رہنے کے بعد وہ ڈرتے ڈرتے نہر کے کنارے پر پاؤں رکھ کر باہر نکل آیا اس نے نہر کے ٹھنڈے و صاف پانی میں اتنا نہایا تھا کہ اس کے کپڑوں اور جسم پر لگی تمام گندگی، جما ہوا خون اور خون کے داغ دھبے سب کچھ ڈھل کر صاف ہو گئے تھے لیکن صاف ستھرا ہو جانے کے باوجود اسے اپنے ہاتھوں پیروں کو دیکھ کر اپنے آپ سے کراہیت محسوس ہو رہی تھی کیونکہ ان جگہوں کا کٹا پھٹا گوشت پانی میں رہنے کے باعث پھول کر اس قدر گندی صورت اختیار کر چکا تھا کہ اس سے خود کو دیکھا نہ جا رہا تھا۔

اس نے اپنے جسم سے گیلے کپڑے اتار کر ایک سوکھے درخت کی سوکھی ٹہنیوں پر پھیلا کر ڈال دیئے اور خود برہنہ کھڑا اپنے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

اندھیرے کی چادر میں چھپتا مسجد کا ہیولہ دیکھ کر اس کے پھولے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ آن ٹھہری۔ دراصل یہی مسجد اس کی منزل تھی اسے بالکل درست اندازہ تو نہ تھا لیکن یہ اس کا خیال سا تھا کہ اگر درمیانی راستے میں کسی مصیبت نے آن کر نہیں گھیرا تو وہ پندرہ سے بیس منٹ کے اندر اس مسجد تک پہنچ سکتا تھا جہاں سے بلند ہونے والی اذان کی آواز نے اسے زندگی کی نوید سنائی تھی۔

دھیرے دھیرے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا بابو نے مسجد کی جانب پیش قدمی کرنے کا ارادہ صبح تک کے لئے ملتوی کر دیا کیونکہ اس ویران و غیر آباد نامعلوم سی خوف ناک جگہ پر جہاں جہنمی مخلوقات کا بسیرا تھا اور جن کی خونخواریت کی ایک جھلک وہ دیکھ بلکہ بھگت چکا تھا وہ دوبارہ ایسا کوئی رسک لینے کو تیار نہ تھا اس نے یہ سوچ کر اپنے دل کو راضی کر لیا جہاں کئی گھنٹے اس نے مختلف اذیتیں جھیلتے ہوئے کاٹ ڈالے تھے وہاں ان چند گھنٹوں کی کیا اہمیت؟

وہ اسی درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گیا جس پر اس نے اپنے گیلے کپڑے سکھانے کے لئے پھیلا رکھے تھے۔ وہ اپنی حفاظت کے طریقوں پر غور کرنے لگا۔

غور کرنے کے دوران وہ بے دھیانی میں کبھی اپنے ہاتھوں، کبھی پیروں، کبھی سینہ، کبھی پیٹھ اور کبھی اپنے چہرے کو بار بار کھجاتا رہا۔ کھجانے کے بعد وقتی طور پر اسے کھجلی کی ہوئی جگہ پر سکون حاصل ہو جاتا لیکن یہ سکون دیر تک برقرار رہنے نہ پاتا اور اگلے ہی لمحے پھر اسی جگہ پر کھجلی پیدا ہونے لگتی۔ وہ ایک جگہ سے کھجا کر فارغ بھی نہ ہونے پاتا کہ ایک دم سے کسی دوسری جگہ پر کھجلی شروع ہو جاتی دوسری جگہ کی کھجلی مٹنے بھی نہ پاتی کہ کسی تیسری جگہ پر کھجلی کی آگ اس قدر شدت سے بھڑک اٹھتی کہ اسے کھجائے بغیر سکون میسر نہ آتا......اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے پورے جسم میں ناقابل برداشت کھجلی پھیل کر رہ گئی......حفاظت کے طریقوں پر غور فرمانے کا موقعہ ہی نہ مل سکا وہ ادھر ادھر یہاں وہاں بے دردی سے اپنے جسم اور چہرے کو کھجانے لگا......صرف چند ہی لمحات کے اندر کھجلی نے اسے پاگل سا کر کے رکھ دیا جسم کے ان تمام کھال و گوشت سے عاری حصوں پر کھجلی ہو رہی تھی جو آدم خور چوہوں کی خوراک بن چکے تھے۔

"اف خدایا! اس قدر وحشیانہ کھجلی سے آج سے قبل اس کا کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ کھجا کھجا کر وہ حال سے بے حال ہونے لگا لیکن کھجلی کی

شدت تھی کہ بڑھتی ہی جارہی تھی وہ جتنا اپنے جسم اور چہرے کو کھجائے جارہا تھا اسی قدر کھجانے کی طلب پیدا ہونے لگتی اس نئی مصیبت نے اسے بری طرح بوکھلا کر رکھ دیا اس نے بے رحمی وسفاکی کی حد کر ڈالی۔اس بے دردی سے وہ اپنے جسم اور چہرے کو کھجانے لگا کہ اس کے زخموں سے نئے سرے سے خون کا رسنا شروع ہوگیا......اس کے ہاتھ کی انگلیوں کے ناخنوں میں اس کے جسم کے خون آلود گوشت کے ذرات بھر کر رہ گئے......وحشیانہ کھجلی لحہ بہ لحہ اپنے عروج کو چھوتی رہی اسے اپنے پورے جسم کو کھجانے یا جسم کی وحشیانہ کھجلی مٹانے کے لئے اپنا ایک ہاتھ ناکافی محسوس ہونے لگا تو اس نے درخت کے سوکھے وکھر درے تنے سے اپنی پیٹھ اور سینہ رگڑ کر اپنی کھجلی مٹانے کی بھرپور کوشش شروع کردی لیکن خدا کی پناہ!

کھجلی مٹنے کا نام تک نہ لے رہی تھی......وہ پاگل سا ہوا تھا اور جسم اور چہرے کو کھجاتے کھجاتے گدھوں کی طرح دھول مٹی سے بچھے فرش پر لوٹنے لگا......اس کی آنکھوں سے آنسو اور لبوں سے سسکاریاں خارج ہونے لگیں کھجلی کے ساتھ ساتھ اسے یہ سوچ بھی پاگل کئے دے رہی تھی کہ وہ کب تک لالچ کے تحت اپنی عمل والی غلطی کی سزا بھگتتا رہے گا۔

تا حال تو اسے کھجلی نے ہلکان کر کے رکھ دیا تھا وہ بے دردی سے زمین سے خود کو رگڑنے لگا۔

''یا اللہ! مجھے معاف کردے میرے مالک! اب اور برداشت نہیں ہوتا......مجھ پر اپنا رحم فرما، میں اس ویرانے میں بے گوروکفن مرنا نہیں چاہتا، مجھے موت ہی دینی ہے تو مجھے میری ماں کی آغوش میں دے میں ایک بار اس کے پیروں کو چوم کر اپنی نافرمانیوں کی معافی مانگنا چاہتا ہوں! بے شک میں تیرا ایک نافرمان بندہ ہوں جس نے کبھی تیرے آگے اپنا سر نہیں جھکایا لیکن تو تو بے انتہا مہربان اور رحم کرنے والا ہے مجھ پر بھی اپنا رحم......؟''

کھجاتے ہوئے اور یہ الفاظ ادا کرتے کرتے اس کی ہمت ٹوٹ کر رہ گئی اور وہ ہوش وحواس سے قطعی بے گانہ ہوگیا۔

☆......☆......☆

جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اپنے آپ کو ایک کمرے میں ایک چار پائی کے اوپر پڑے دیکھ کر اسے خوشگوار سی حیرت نے آن گھیرا اس نے لیٹے ہی لیٹے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

مٹی کی دیواروں اور کھجور کے پتوں کی چھت سے بنا یہ کمرہ چھوٹا ہونے کے باوجود سکون کے لحاظ سے جنت کے کسی ٹکڑے سے کم نہ تھا کمرے میں سامان کے نام پر ایک چار پائی! جس پر اسے لٹایا گیا تھا کونے میں رکھا پانی کا ایک چھوٹا سا مٹکا، مٹی کی پیالی، چکنی مٹی سے بنا سوکھی لکڑیوں سے جلنے والا چولہا اور کھانے پینے کے چند صاف ستھرے برتنوں کے علاوہ ایک کونے میں بچھی چٹائی تھی جس پر ایک مصلٰی تہہ کیا ہوا اور رحل پر کپڑے میں لپٹا قرآن پاک رکھا تھا۔ قرآن پاک رکھنے کی جگہ قد آدم جتنی اونچی بنائی گئی تھی۔

بابو نے محسوس کر لیا کہ اس کے جسم پر اب تک بھی کپڑے نہ تھے البتہ ململ کی ایک چادر گردن سے لے کر پیر تک اسے اوڑھا کر اس کا برہنہ وجود ڈھانپ دیا گیا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کمالات کس ہستی نے انجام دیئے تھے؟ کیونکہ کمرے میں اس کے علاوہ دوسرے کسی انسان کا وجود نہ تھا اور اس کی نگاہیں کسی انسان کے وجود کو دیکھنے کے لئے ترس رہی تھیں۔

اور اس سے پہلے کہ وہ چار پائی سے اٹھنے کی کوشش کرتا دروازے پر لگا ٹاٹ کا پردہ ہٹاتے ہوئے ایک بزرگ شخص کمرے میں داخل ہوا اور بابو کو بیدار پا کر اس کے چہرے پر پدرانہ مسکراہٹ وخوشی نے آن کر بسیرا کر لیا۔

ایک نورانی چہرہ شخصیت اور سب سے بڑھ کر اپنے جیسے ایک انسان کو اپنی نگاہوں کے سامنے پا کر بابو کی آنکھوں کو وہ تازگی میسر آئی کہ وہ بھی بے اختیار خوشی کی زیادتی سے مسکرا اٹھا۔

''اللہ کا شکر ہے تمہیں ہوش تو آیا میں 36 گھنٹوں سے تمہیں ہوش میں لانے کی اپنی سی ہر ممکن کوشش کئے جا رہا تھا......اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' بزرگ نے اسی پدرانہ محبت سے پوچھا۔

''بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔'' بابو نے جواب دینے کے بعد اٹھنے کی کوشش کی۔

''لیٹے رہو! ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔'' بزرگ کے حکم پر اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش ترک کر دی۔

''پانی۔'' مٹکے کو دیکھ کر اس کی کئی گھنٹوں کی پیاس بھڑک اٹھی اور پیاس کا احساس بیدار ہوتے ہی اسے نہر کا ٹھنڈا پانی یاد آ گیا جانے وہ کون سی ایسی نادیدہ قوت تھی جس نے شدید پیاس کے باوجود اسے نہر کا پانی منہ میں ڈالنے سے منع رکھا اگر خدانخواستہ وہ پیاس کی شدت سے پاگل ہو کر خوب سیر ہو کر نہر کا پانی پی لیتا تو......؟ اس سے آگے وہ سوچ نہ سکا خوف سے اس کا پورا وجود جھرجھرا اٹھا نہر میں نہانے کا اسے یہ خمیازہ بھگتنا پڑ گیا تھا کہ وحشیانہ کھجلی نے اس کے ہوش وحواس اڑا کر رکھ دیئے تھے اگر یہی پانی اس کے جسم کے اندر داخل ہو جاتا تو کیا ہوتا؟؟

یہ لو! پانی پیو۔'' بزرگ کی محبت سے بھرپور آواز نے اس کی سوچوں کے تسلسل کی ڈور کو درمیان ہی سے کاٹ کر رکھ دیا۔

بزرگ ہستی نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور مٹی کے پیالے کو اس کے نصف سالم ہونٹوں سے لگا دیا وہ گھونٹ گھونٹ ٹھنڈا میٹھا پانی حلق سے نیچے اتارتا رہا اس کے رگ وپے میں ٹھنڈک سی اترتی چلی گئی جب مٹی کے چھ سات پیالے پانی کے اس نے پیئے تب کہیں جا کر اس کے جسم کو

تازگی میسر آئی اور اس کی پیاس بجھی۔

بزرگ ہستی نے جھک کر چارپائی کے نیچے سے مٹی کا ہی بنا ہاون دستہ کھینچ کر باہر نکالا اور اس میں سے کچھ پسی ہوئی جڑی بوٹیاں نکال کر اس کے لیپ بابو کے چہرے اور جسم کے زخموں پر لگانے لگا۔

جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ مرہم نے جونہی اس کے زخموں کو چھوا ایک ٹھنڈک کا احساس اس کے رگ وپے میں سرایت کرنے لگا اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے جلتے ہوئے توے پر کسی نے پانی کے چھینٹے مارنے شروع کر دیے ہوں اس کے جسم پر لگے زخم بھی توے کی مانند سلگ رہے تھے اور اسے سلگائے دے رہے تھے۔

''بابا! میں کہاں ہوں؟ یہ کون سی جگہ ہے؟ اور! آپ کون ہیں؟'' اس نے اپنے دماغ میں کھلبلی مچاتے سوالوں کو لفظوں میں بیان کیا۔

''تمہارے پہلے سوال کے جواب میں، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت تم محفوظ جگہ پر ہو اور رہا یہ سوال۔ ''یہ کون سی جگہ'' ہے تو مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ یہ عبرت کی جگہ ہے! اس کی وضاحت میں کچھ اس طرح کروں گا کہ بہت سے انسان یہ سوچ کر برائیوں اور گناہوں کے دلدل میں دھنستے چلے جاتے ہیں کہ انہیں ان کی برائیوں اور گناہوں کی سزا قیامت کے دن ملے گی بلکہ بعض نابکاروں کو تو قیامت کے دن پر ہی ایمان نہیں ہوتا۔ یا...... ہوتا بھی ہے تو پختہ نہیں ہوتا...... ڈگمگ اور متزلزل سا ایمان ہوتا ہے لیکن غفلت کی نیند سوئے ہوئے وہ بدبخت انسان یہ نہیں جانتے کہ اللہ کی نادیدہ و بے آواز لاٹھی کسی بھی دن ان پر برس سکتی ہے...... عبرت کی یہ جگہ ایسے ہی انسانوں کے لئے بنائی گئی ہے شیطان کی ہدایتوں پر عمل کرنے والے اور شیطان کے بتائے ہوئے راستوں پر قدم بڑھانے والے خود بہ خود عبرت کی اس جگہ یا اس مقام تک آن پہنچتے ہیں۔'' بزرگ ہستی کی ان باتوں نے اسے شرمندگی کے حوالے کر ڈالا اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے بزرگ نے اس کی ہستی کے متعلق یہ سب کہا ہو۔

''یہاں اللہ کی وہ مخلوق بستی ہے جسے عام فہم زبان میں ہم ارواح خبیثہ کہتے ہیں...... یعنی بدروحیں، چڑیلیں اور بھوت پریت وغیرہ! لیکن انہی کے درمیان کچھ نیک روحیں بھی یہاں بس رہی ہیں جو تم جیسے بھولے بھٹکے انسان جو غلطی سے یا اپنے کسی گناہ کی سزا بھگتنے کے لئے اس جگہ آن نکلتے ہیں انہیں ارواح خبیثہ کی شرانگیزیوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں...... اس جگہ کی ایک دلچسپ اور ناقابل یقین بات یہ ہے کہ یہاں سے زندہ بچ کر اپنے گھروں کو لوٹ جانے والے انسان! جب کچھ عرصے بعد یہاں آنے کے بارے میں سوچتے ہیں تو لاکھ ڈھونڈنے پر بھی انہیں یہ جگہ مل کے نہیں دیتی۔'' بزرگ ہستی کے لبوں پر مسکراہٹ آن ٹھہری۔

''ایسا کیوں ہے؟'' بابو کے لہجے میں حیرت سی در آئی۔

''اللہ کے بھید اللہ جانے۔'' بزرگ نے پر تجسس انداز سے جواب دیا۔

''آپ کو یہاں ڈر نہیں لگتا؟'' بابو نے فوراً سے ایک اور سوال کر ڈالا۔

''میں اپنے آپ کو سزا دینے کے لئے یہاں رہ رہا ہوں اور جب سزا ہی بھگتنی ہے تو ڈر یا خوف کو پالنے کا کیا جواز؟'' بزرگ نے جواب دیا۔

''سزا؟ کیسی سزا؟'' اس نے بزرگ ہستی کے جھریوں بھرے چہرے کی جانب تکتے ہوئے ناسمجھی سے دریافت کیا۔

وہ یہ سوچے بنا نہ رہ سکا کہ بزرگ ہستی چہرے، بالوں اور جسمانی ساخت کی وجہ سے جس قدر معمر دکھائی دے رہے تھے اس کے برعکس ان کی آواز میں وہ تھرتھراہٹ یا کپکپاہٹ نہیں محسوس ہونے پا رہی تھی جو اس عمر میں ہر شخص کی آواز میں رونما ہونے لگتی ہے اس بزرگ کی آواز میں جوانوں کی سی دلکشی اور بادلوں کی سی گرج چمک تھی جبکہ بزرگ ہستی کی بھویں تو کیا پلکوں تک کے بال دودھ کی طرح سفید تھے۔

''میری کہانی سن کر کیا کرو گے؟ بس اتنا جان لو کہ اپنی نافرمانی اور نادانی کی سزا بھگت رہا ہوں اب میرے اس جملے سے تم کوئی سی بھی کہانی بنا سکتے ہو مجھے یقین ہے کہ تمہارے دماغ میں جو بھی کہانی آئے گی وہ 75 فیصد میری کہانی سے ملتی جلتی ہوگی کیونکہ زن، زیور اور زمین کے حصول کے پیچھے بھاگنے والے تمام انسانوں کی کہانی ایک جیسی ہی ہوتی ہے؟'' بزرگ کی یہ بات بابو کے لبوں پر مہر خاموشی ثبت کر گئی اس نے دیکھا کہ اپنے کسی اندرونی کرب نے بزرگ کے چہرے پر دکھ کے گہرے سائے رقصاں کر دیئے تھے۔

''ذرا پلٹ جاؤ! مجھے یہ مرہم تمہاری پیٹھ اور پچھلی ٹانگوں کے زخموں پر لگانا ہے۔'' بزرگ ہستی کے کہنے پر بابو ایک جانب کروٹ لے کر مرہم لگوانے کی حالت میں آ گیا۔ وہ بزرگ ہستی نہایت مہارت اور آہستگی سے اس کے زخموں پر مرہم رکھنے لگی۔

''تھوڑی دیر تک یونہی کروٹ کئے رہنا دوا کے خشک ہونے کے بعد تم سیدھا لیٹ جانا...... یہ دوا مکمل طور پر خشک ہونے کے بعد اپنا اثر دکھائے گی اور یہ میں تمہیں پہلے ہی بتلائے دیتا ہوں کہ جب دوا کا اثر شروع ہوگا تو تمہیں اپنے زخموں میں کھچاؤ اور جلن سی محسوس ہونا شروع ہو جائے گی اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کھچاؤ اور جلن میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا جو تمہیں نہایت صبر و ضبط اور تحمل سے برداشت کرنا ہوگا۔ خبردار! زخموں پر لگا مرہم کھرچ کر اتارنے یا اپنے زخموں کو کھجانے کی کوشش نہ کرنا اگر تم نے ایسی کوئی حماقت کی تو تمہارے جسم پر لگے زخم ناسور بن کر رہ جائیں گے، یہ دوا اسی لئے ہے کہ یہ تمہارے زخموں کو بالکل سکھا کر رکھ دے گی پھر زندگی میں کبھی ان زخموں میں تمہیں خارش یا جلن پیدا ہوگی اور نا ہی ان میں بدبو دار مواد پیدا ہوگا۔'' بزرگ نے کہا تو وہ ''جی'' کہہ کر رہ گیا۔

''یہ کون سی دوا ہے؟ اس دوا کا نام کیا ہے؟'' بابو نے دریافت کیا بابو کی یہ بات سن کر بزرگ بے اختیار ہنس پڑے۔

''اس دوا کا کوئی نام نہیں ہے...... اور اس لئے یہ دوا بے نام ہے، میں نے قیمتی جڑی بوٹیوں کو اپنے ہاتھوں سے ہاون دستے میں پیس کر خود تیار کیا ہے...... اس دوا کی بے شمار خوبیوں میں ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ یہ فوری طور پر زہر کے اثرات کا خاتمہ کر کے رکھ دیتی ہے۔'' بزرگ نے وضاحت کی۔

''زہر کے اثرات؟ کیسا زہر؟ مجھے تو کسی زہریلے جانور نے نہیں کاٹا؟'' بابو نے حیرت کا اظہار کیا۔

''جس نہر میں تم کودے اور تیرتے ہوئے دوسرے کنارے تک آئے، اس نہر کا پانی زہریلا ہے، نہر کے اس پانی میں ایک ایسا زہر ملا ہوا ہے کہ انسان ہو یا جانور! اگر اسے اس نہر کا پانی چھو لے یا وہ نہر کے زہریلے پانی کو چھو لے تو اس جاندار کو پاگل کر دینے والی، وحشیانہ کھجلی شروع ہو جاتی ہے اگر اڑتالیس گھنٹوں کے اندر اس وحشیانہ کھجلی کا کوئی سودمند علاج نہ کیا گیا تو اپنے جسم کو کھجاتے کھجاتے اس جاندار کی موت واقع ہو جاتی ہے۔'' بزرگ نے کہا۔

''نہر کا پانی زہریلا کس طرح ہوا؟'' بابو اپنے جسم میں ہونے والی کھجلی کے لمحات یاد کر کے جھرجھرا اٹھا۔

''میں نے کچھ دیر قبل کہا تھا کہ یہ عبرت کی جگہ ہے بلکہ اس جگہ کو تم زمین کی دوزخ کہہ سکتے ہو اور دوزخ میں ہر چیز قدرت کی پیدا کردہ ہوتی ہے، اس نہر کا پانی بھی برسوں سے ایسا ہی ہے، اس پانی کو زہریلا کرنا کسی اور طاقت کے بس کی بات نہیں ہے۔'' بزرگ نے جواب دے کر اس کی معلومات میں حیران کن اضافہ کیا۔

باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی پہلے میں تمہاری بھوک مٹانے کا کوئی معقول بندوبست کرلوں۔'' بزرگ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''دوا سوکھنے کے بعد خود سے جھڑتی رہے گی، تم ناخن سے کھرچ کر اتارنے کی کوشش مت کرنا، تم آرام کرو میں تمہارے کھانے پینے کے لئے کچھ لے کر آتا ہوں۔'' بزرگ نے کہا۔

اور بابو نے دیکھا کہ کمرے سے نکلنے سے قبل بزرگ نے دیوار سے لٹکے ہوئے آئینے کا رخ پلٹ دیا اور پھر مطمئن سا ہو کر باہر نکل گیا۔

بابو کو بزرگ کی یہ حرکت کچھ عجیب سی محسوس ہوئی آخر آئینے کا رخ پلٹ کر رکھ دینے میں کیا راز پوشیدہ تھا؟

جب کئی لمحات گزر گئے اور بزرگ لوٹ کر نہ آیا تو دوا کو خشک ہوتے پا کر وہ چارپائی سے اٹھ بیٹھا۔ اٹھتے ہی اس نے جسم پر رکھی ململ کی چادر اتار کر اپنی ستر پوشی کی اور اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسی دیوار کی جانب قدم بڑھانے شروع کر دیئے جس پر آئینہ لٹکا ہوا تھا اور بزرگ نے جانے سے قبل اس آئینے کا رخ پلٹ دیا تھا۔

دیوار کے پاس اور آئینے کے قریب پہنچ کر وہ کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ بزرگ کی اجازت کے بغیر اسے آئینے کو پلٹ کر دیکھنا چاہئے یا نہیں؟

کہیں ایسا نہ ہو کہ اس آئینے کو پلٹتے ہی وہ کسی اور نئی مصیبت میں گرفتار ہو کر رہ جائے؟ لیکن پھر اس نے یہ سوچ کر آئینے کی جانب بڑھنا شروع کر دیا کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

اب اس کا اس بات پر ایمان پختہ ہو چکا تھا کہ جب تک اس کی زندگی ہے دنیا کی کوئی طاقت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

اور پھر جونہی اس نے آئینے کا رخ پلٹ کر آئینے میں خود کو دیکھا......؟ بے اختیار اس کے لبوں سے ایک وحشت انگیز چیخ نکل کر رہ گئی۔

کیونکہ آئینے میں ایک انتہائی بدصورت و بھیانک انسان کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

اس کے سر کے تمام بال یہاں تک کہ بھوئیں اور پلکوں تک کے بال دودھ جیسے سفید تھے، اس کے چہرے پر بے شمار گہری جھریوں کا جال سا تنا ہوا تھا اور سونے پر سہاگہ! اس کے چہرے کی کھال جگہ جگہ سے بری طرح نچی ہوئی تھی جیسے کسی موذی جانور نے اپنے بھیانک پنجوں اور ٹھونگوں سے اس کے چہرے کی یہ درگت بنائی ہو۔ اس کے دونوں کان بھی کٹے ہوئے تھے اور ہونٹوں کی شناخت بھی مشکل سے ہی ہو پا رہی تھی۔

اگر آئینے میں دکھائی دینے والا چہرہ کسی اور انسان کا ہوتا تو بابو کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا، اس کے لبوں سے نکلنے والی چیخ اس لئے تھی کہ وہ چہرہ! بھیانک اور بدصورت چہرہ کسی ایرے غیرے کا نہیں بلکہ بابو کا اپنا چہرہ تھا۔

''اے خدا! یہ سب کیا ہے؟ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔'' اس نے دوبارہ آئینے کا رخ پلٹ دیا اب اس کی عقل میں یہ بات آ گئی تھی کہ

بزرگ نے جانے سے قبل کیوں آئینے کا رخ پلٹ دیا تھا۔شاید وہ بابو کو اس صدمے سے بچانا چاہتے تھے جو آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر اسے پہنچا تھا۔

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو گیا، زندگی بچ جانے کی ساری خوشی خاک میں مل کر رہ گئی...... اس رنگ و روپ میں اسے کون پہچان پائے گا؟ سب اس کے اس کراہیت آمیز روپ سے نفرت کریں گے اسے دھتکار کر رکھ دیں گے۔

گویا قدرت نے اس کی تمام تر شخصیت کو ہی بدل کر رکھ دیا تھا اپنی نوجوانی کے آغاز پر ہی وہ بڑھاپے کی انتہا تک جا پہنچا تھا۔

وہ چارپائی پر جا بیٹھا اپنے جھریوں سے بھرے جسم اور ہاتھوں و پیروں کو دیکھ دیکھ کر روتا رہا اور سوچتا رہا کہ اس کا جرم واقعی اتنا بڑا اور ناقابل معافی تھا کہ جس کی اسے اتنی کڑی سزا مل رہی تھی؟

اور اس کا جرم اس کے علاوہ اور کیا تھا کہ اس نے ایک لڑکی سے شدید محبت کرنے کی غلطی کر ڈالی تھی؟ یا یہ کہ اپنی محبت کو پانے کے لئے اس نے بظاہر ایک آسان راستے کا انتخاب کیا تھا؟ وہ یہ سوچتا رہا اور اپنے آپ کو پیٹتا رہا۔

پہلے پہل وہ گھٹ گھٹ کر روتا رہا پھر آہستہ آہستہ اس کے لبوں سے رونے کی آواز برآمد ہونے لگی اور مزید چند لمحوں کے اندر وہ بچوں کی طرح دھاڑیں مار مار کر رونے لگا...... اس قدر رویا...... بے حد و حساب رویا کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

”رو کیوں رہے ہو؟ کیا ہوا تمہیں؟“ بزرگ جونہی کمرے میں داخل ہوا اسے بچوں کی طرح روتے دیکھ کر ایک دم سے ٹھٹکا کر رہ گیا اور بے اختیار اس نے گردن گھما کر دیوار پر لگے آئینے کی جانب دیکھا، آئینے کی جگہ کی غیر محسوس تبدیلی اسے ایک طویل سانس لینے پر مجبور کر گئی۔ بابو کے دھاڑیں مار کر رونے کی وجہ اس کی سمجھ میں آ چکی تھی اسے شک ہی نہیں یقین سا تھا کہ قدرت کی ستم ظریفی یا اپنے کسی گناہ کی سزا بھگتنے والا یہ انسان! آئینے میں اپنی صورت دیکھ چکا تھا اس بزرگ نے اپنی جھولی میں بھرے انواع و اقسام کے کچھ عجیب سے پھل ایک جانب رکھے اور بابو کی جانب بڑھا۔

اس نے بابو کو چپ کروانے کی قطعی کوئی کوشش نہ کی اس کے خیال میں بابو کے لئے کھل کر رونا بہت ضروری تھا کیونکہ دل میں بھرا غبار نکالنے کا اس سے آسان راستہ کوئی دوسرا نہ تھا۔

اور جب کئی لحات تک رونے کے بعد اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو بزرگ نے ایک پلیٹ میں پھل کاٹ کر اس کے قریب کئے۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس نے ایک دم سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”کچھ تو کھالو۔“ اس نے بابو سے کہا اور اپنے ہاتھ سے ایک پھل کا ٹکڑا اٹھا کر اس کی جانب بڑھایا۔

سچ تو یہ ہے کہ بھوک کی شدت سے بابو کی آنتیں بلبلا رہی تھیں۔اس لئے اس نے بزرگ شخص کے ہاتھوں سے پھل کا ٹکڑا لے کر حیرت و ناسمجھی سے دیکھنا شروع کر دیا شاید وہ پھل کو شناخت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کوشش اس لئے کہ اس نے اپنی زندگی میں ایسا عجیب و غریب پھل نہیں دیکھا تھا۔

”یہ؟ یہ کیا ہے؟“ اس نے اپنی الجھن لفظوں میں بیان کر دی۔

”تریاق! اس زہر کا تریاق جس نے تمہاری یہ حالت بنائی ہے...... یہ دوا بھی ہے غذا بھی ہے اور اسے تم چاہو تو پھل بھی کہہ سکتے ہو پھل

اس لئے کہ یہ تمہیں توانائی مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ پروٹین اور وٹامن کی کمی بھی پوری کرے گا۔" بزرگ شخص نے مسکراہٹ بکھیری۔

"لیکن یہ ہے کیا؟ اس پھل کا کوئی نام تو ہوگا؟" بابو نے کہا۔

"تم ہر چیز کا نام کیوں پوچھتے ہو؟" بزرگ کے لہجے کی شوخی اور الفاظ بابو کو بھی مسکرانے پر مجبور کر گئے۔

"درحقیقت یہ بھی ایک جڑی بوٹی ہے۔ اس جڑی بوٹی کی بھی بے شمار خوبیاں اور فوائد ہیں جو میں تمہیں اس لئے نہیں گنواؤں گا کہ میری ہر بات تمہارے سر کے اوپر سے گزر جائے گی اور تم سوالات پر سوالات کر کے میرا سارا بھیجہ چاٹ جاؤ گے...... تمہارے لئے صرف اتنا جان لینا کافی ہوگا کہ میں بھی برسوں سے یہی کچھ کھا کر اب تک زندہ ہوں...... کبھی کبھار میں ان جڑی بوٹیوں کو آگ پر پکا کر اور کبھی پیس کر کھاتا ہوں...... اس لئے بے خوف ہو کر کھا لو کیونکہ یہ کھانے کی چیز ہے۔" بزرگ نے پلیٹ کی جانب ہاتھ بڑھا کر ایک ٹکڑا اٹھا لیا اور بابو کو دکھانے کے لئے اپنے منہ میں رکھ کر چبانا شروع کر دیا۔

اسے کھاتے دیکھ کر بابو کے اندر بھی تحریک جاگی اور اس نے بے نام کے اس عجیب سے پھل کا ٹکڑا منہ میں رکھ لیا بڑی ہمت کر کے اس نے دانتوں کے درمیان اسے آہستہ سے چبانا شروع کیا اور واقعی اسے پھل کا سا ذائقہ اور مٹھاس محسوس ہوئی اور اس نے وہ ٹکڑا ختم کر کے پلیٹ کی جانب ہاتھ بڑھا کر ایک اور ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈال لیا، اس کے بعد اس کا ہاتھ رکنے نہیں پایا اور اس نے چند لمحوں کے اندر پوری پلیٹ صاف کر ڈالی۔

"ان جڑی بوٹیوں کے بارے میں آپ کو اتنی معلومات کیوں کر ہے؟

جہاں تک میرا خیال ہے یہ ایک علم ہے جو سیکھنے اور سمجھنے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔" بابو نے پانی کے مٹکے کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا خیال بالکل درست ہے! اور مجھے ان جڑی بوٹیوں کے بارے میں اس لئے معلوم ہے کہ میرے والد مرحوم حکیم تھے اور بہت چھوٹی سی عمر میں انہوں نے مجھے بھی حکمت کی تعلیم دینا شروع کر دی تھی۔...... وہ بہت نیک رحم دل اور خدا ترس انسان تھے...... انہوں نے پوری زندگی لوگوں کی انواع واقسام کی تکالیف اور بیماریوں کا مفت علاج کرتے ہوئے گزار دی وہ کہا کرتے تھے کہ اللہ نے میرے ہاتھوں میں شفا انہی غریب لوگوں کی تکالیف اور بیماریاں دور کرنے کے لئے رکھی ہے۔" وہ کسی سے علاج اور دوا کا پیسہ اس لئے نہیں لیتے تھے کہ اللہ نے دولت وثروت سے پہلے ہی بہت نواز رکھا تھا اور مجھے بھی وہ اکثر یہی نصیحت کیا کرتے تھے۔" دولت کمانے کے لئے حکمت مت سیکھنا۔ لیکن......؟" وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

"پتہ نہیں کیوں؟ اپنے والد کی کوئی اچھی عادت اور خصوصیات مجھ میں کیوں نہیں تھی؟ میرا دل بہت سخت تھا جس میں خدا ترسی یا ترحم قطعی نہیں پائے جاتے تھے ان کی وفات کے بعد میں نے ان کی جگہ لے لی۔ اللہ نے شفا میرے ہاتھوں میں بھی بہت رکھی تھی لیکن میں کسی کا مفت علاج کرنے اور بڑی محنت شاقہ کے بعد حاصل ہونے والی نادر و نایاب جڑی بوٹیوں سے تیار ہونے والی ادویات کسی کو مفت دینے کے حق میں نہ تھا......

میرے نزدیک یہ ایک بے وقوفی اور حماقت تھی اور میں ایسی بے وقوفی کرنے کے حق میں نہ تھا۔

میں اپنی دن رات کی محنت سے ان جڑی بوٹیوں سے مختلف تکالیف اور بیماریوں کے معجون تیار کر کے رکھتا تھا میں نے ان ادویات کی

قیمت مقرر کردی اوران ادویات کی قیمت اتنی تھی کہ کسی غریب شخص کی جیب ان ادویات کی قیمت ادا نہیں کر سکتی تھی اور نا ہی میں غریبوں کے لئے ادویات تیار کرنا پسند کرتا تھا۔

ادویات تو کیا؟ میں غریبوں کو مفت مشورہ بھی دینا پسند نہیں کرتا تھا..... میں نے اپنے مشوروں، علاج اور ادویات کی الگ الگ اور بہت بھاری فیسیں مقرر کر دی تھیں..... یہی وجہ تھی کہ میرے مریضوں کی تعداد کم ہوتے ہوتے بہت محدود ہو کر رہ گئی، غریب مجھ سے مایوس ہو کر لوٹ گئے میرے محدود مریض بھی کوئی عام ہستیاں نہ تھیں اس وقت کے امیر لوگ میرے زیر علاج تھے جن کا علاج میں دانستہ بہت لمبا کھینچا کرتا تھا تا کہ دولت کی آمد کا کوئی ایک راستہ بھی بند نہ ہونے پائے..... حالانکہ اگر میں چاہتا تو ایک ہفتے کے اندر مریض کو بھلا چنگا کر کے فارغ کر سکتا تھا لیکن میں ایسا کرنا بھی بے وقوفی ہی خیال کرتا تھا اور میری یہی بے وقوفانہ سوچ یا کم عقلی مجھے اس عبرت کدے میں کھینچ لائی اور آج تک میں اس جگہ سے نکل نہیں پایا..... بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں نے یہاں سے نکلنے کی کوشش ہی نہیں کی اپنی ہستی کو اس جگہ کے سپرد کر دیا اور بھولے بھٹکے اس عبرت کدے میں آنے والوں کے لئے زندگی کا پیغام بن کر رہنے لگا۔'' بزرگ نے کہا۔

''کیوں؟ آپ نے یہاں سے نکلنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟'' بابو کو اس بزرگ کی کہانی میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔

''کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر میں لوٹ کر اپنے بیوی بچوں کے پاس چلا بھی جاتا تو کوئی مجھے پہلے کی طرح قبول نہیں کرے گا..... ان کی محبت شدید نفرت میں تبدیل ہو کر رہ جاتی اور میری بیوی میرے ساتھ سونا تو دور کی بات شاید کلام تک کرنا پسند نہیں فرماتی، جانتے ہو کیوں؟ اس لئے! اس لئے!'' بزرگ نے یہ کہہ کر ایک دم سے دونوں ہاتھوں کی مدد سے اپنا ڈھیلا کرتا اوپر اٹھا کر اپنا گردن سے ناف تک کا دھڑ اسے دکھایا۔

اگر بابو بروقت اپنے آپ پر قابو نہ پالیتا تو ایک بار پھر خوف دہشت کے مارے اس کے لبوں سے ایک آواز خارج ہو کر رہ جاتی تاہم وہ اپنے دل کی بکھر جانے والی دھڑکنوں کو بروقت سنبھال نہ سکا اور حیرت و خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بزرگ کے وجود کو تکتا رہ گیا جسے ایک جیتے جاگتے انسان کا وجود کہنا اس کے خیال میں بے وقوفی تھی۔ اور بابو کا یہ خیال اس لئے بھی درست کہا جا سکتا تھا کہ بزرگ کا نصف دھڑ بچا ہوا بہت بھیانک ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔

''یہ؟ یہ سب کیا ہے؟ بابو اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

''قدرت کا عذاب اور کیا۔'' بزرگ نے اپنا کرتا نیچے کر کے اپنا عبرت ناک جسم ڈھانپتے ہوئے اس طرح مسکرا کر کہا جیسے اسے اپنی اس حالت کا کوئی صدمہ یا دکھ نہ ہو۔

''لیکن آپ کی یہ حالت.....؟'' بابو اپنے سوال کی خاص وضاحت نہ کر سکا۔

''اسی عبرت کدے میں پہنچ کر ہوئی ہے۔'' بزرگ نے جواب دیا۔

''لیکن آپ یہاں! اس عبرت کدہ میں کس طرح آج پہنچے؟'' بابو نے کہا۔

''دولت کی لالچ میں..... دولت کی ہوس مجھے اس عبرت گاہ تک کھینچ کر لے آئی دولت، شہرت اور جھوٹی عزت پانے کی ہوس۔'' بزرگ

کے لہجے میں دکھ سا گھل کر رہ گیا۔

اور پھر بزرگ نے اپنی کہانی سناتے ہوئے بتایا کہ ایک دن میرے عالی شان اور قیمتی ساز و سامان اور پردوں سے آراستہ مطب میں۔ ایک ایسا غریب شخص آیا جس کے گردن سے لے کر ناف تک کے جسم پر کچھ ایسے عجیب دانے نکل آئے تھے کہ بڑی تیزی سے اس کے جسم کا گوشت جھڑ کر اس کی ہڈیوں سے الگ ہو رہا تھا...... ہر طرح کے ڈاکٹری و روحانی علاج کروانے کے بعد اور سب سے مایوس ہو کر وہ میری شہرت سن کر بہت دور سے میرے پاس آیا تھا اور مجھے اپنی اس بیماری کی تفصیل سنا کر وہ میرے پیروں پر گر پڑا اور بچوں کی طرح روتے ہوئے مجھ سے التجا کی میں اس کی زندگی بچا لوں کیونکہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو اس کی بیوی بچے بے سہارا ہو کر رہ جائیں گے۔

لیکن مجھ پر اس کے رونے دھونے یا اس کی درد بھری کہانی کا رتی برابر اثر نہ ہوا اور میں نے اس کی بیماری کا علاج کرنا تو دور کی بات قمیض اٹھا کر اس کے جسم پر موجود پھوڑوں تک کو دیکھنا گوارہ نہ کیا اور اسے دوٹوک الفاظ میں یہ کہہ دیا۔

''اگر تم میری فیس دے سکتے ہو تو میں تمہیں اس مرض سے ہمیشہ کے لئے نجات دلا سکتا ہوں بصورت دیگر میرے پیروں پر گرنے یا اپنی بیوی بچوں کے بے سہارا ہو جانے کی من گھڑت کہانی سنا کر تم مجھے رام نہیں کر سکتے۔''

اس شخص نے اللہ کی مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر قسم اٹھائی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے بالکل سچ کہہ رہا ہے اور یہ کہ اس کا زندہ رہنا بہت ضروری ہے لیکن بغیر منہ مانگی فیس لئے میں کسی کو اپنا مشورہ تک دینا گوارہ نہیں کرتا تھا پھر اپنی قیمتی ادویات اور توجہ میں کیسے اسے یونہی ہمدردی یا خدا ترسی کے نام پر دے دیتا لیکن میں نے اس سے صاف کہہ دیا کہ ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

''اگر تم میری فیس ادا کر دو تو میں تمہارا علاج کر سکتا ہوں نہیں تو تم جا سکتے ہو۔''

میرے اس جواب نے اسے بت سا بنا دیا وہ ایسی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا جن میں ایک حسرت اور جینے کی طلب مچل رہی تھی۔

اور پھر وہ مایوس لوٹ گیا اپنی موت سے ایک دن پہلے وہ دوبارہ میرے مطب میں آیا اور بولا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ میری زندگی کے کتنے لمحات باقی رہ گئے ہیں لیکن خدا گواہ ہے کہ ہر دن موت کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر میرے لبوں سے تمہارے لئے یہی بددعا نکلی ہے کہ اللہ کرے تم بھی کسی ایسی ہی بیماری کا شکار ہو جاؤ اور تمہارے اپنے بچے اور بیوی تم سے نفرت محسوس کریں اور چاہتے ہوئے بھی تم اپنا علاج نہ کر سکو۔''

کہتے ہیں مظلوم کی بددعا میں بہت اثر ہوتا ہے اور شاید یہ اسی مظلوم کے دل سے نکلی بددعا کا اثر تھا کہ میں بھولے بھٹکے اس عبرت گاہ تک آن پہنچا اور یہاں عجیب و غریب لیکن کرب انگیز تکالیف جھیلتا ہوا آج خود ایک عبرت کا نشان بن کر رہ گیا ہوں۔'' بزرگ نے یہ کہہ کر چپ اختیار کر لی۔

''آپ کی یہ حالت کیسے ہوئی۔'' بابو نے دریافت کیا۔

''اپنی زندگی بچانے کے لئے میں دن بھر اس عبرت گاہ میں بسنے والی خونخوار و آدم خور مخلوق سے بھاگتا دوڑتا ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں ایک سایہ دار درخت پا کر میں اس درخت کی چھاؤں میں جا بیٹھا تا کہ سکون کی چند سانسیں لے سکوں، سکون میسر آتے ہی مجھ پر نیند کا حملہ ہو گیا اور

میں ہر بات سے بے نیاز ہو کر سو گیا۔

آج جب میں سکون کے ان چند لمحات کا تصور کرتا ہوں تو میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کائنات کے تخلیق کار نے انسانوں کے لئے نیند بھی کیا اہم چیز بنائی ہے، اللہ کی بے شمار نعمتوں میں نیند بھی ایک بہت بڑی نعمت ہے جس کی قدر وہی انسان کر سکتا ہے جسے بے خوابی کا عارضہ لاحق ہو یا پھر جس کی اہمیت میرے جیسے کسی انسان سے پوچھی جا سکتی ہے جو اس عبرت گاہ میں مختلف کرب انگیز اذیتیں سہتا ہوا نیند کی آغوش میں جا چھپا ہو۔

''نیند ایک پیاری چیز ہے اگر غفلت کی نہ ہو۔'' مجھے نہیں پتہ میں کب تک سوتا رہا؟ اور خدا جانے کب تک سویا رہتا کہ ایک دم سے اپنے جسم پر کسی چیز کے رینگنے کے احساس نے میری نیند اڑا کر رکھ دی...... میں نے دیکھا کہ میرے جسم پر گردن سے ناف تک عجیب وغریب کیڑوں نے قبضہ کر رکھا تھا عجیب وغریب اس لئے کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسے کیڑے کبھی نہیں دیکھے۔ بالکل سرخ رنگ کے جیسے لہو سے تخلیق کئے گئے ہوں اور شکل وجسامت میں کسی حسین عورت کی نازک ولمبی انگلیوں کی مانند لیکن اس قدر خطرناک کہ انہیں دیکھ کر میری جان نکل کر رہ گئی!

مجھے یہ سوچ کر حیرت نے آن گھیرا کہ یہ کیڑے ایک دم سے کہاں سے آن وارد ہوئے؟ اور انہوں نے کب میرے دھڑ کو اپنے حصار میں لیا مجھے کچھ علم نہ ہو سکا؟ اور اب وہ میرے جسم کا گوشت نہایت سہولت اور رغبت سے کھا رہے تھے مجھے اپنے جسم کے اس حصے میں سوئیاں سی چبھتی محسوس ہو رہی تھیں جوان کیڑوں کے گھیرے میں تھا شاید ان کیڑوں کی مرغوب غذا انسانی گوشت ہی تھا...... چند لمحات تک تو میری عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا کہ میں کیا کروں؟ اور کیا نہ کروں؟ لیکن آخر کب تک؟ آخر مجھے ان گوشت خور کیڑوں سے اپنے جسم کو تو بچانا ہی تھا میں خوف ودہشت سے بت بن کر اپنے جسم کی درگت بنتے نہیں دیکھ سکتا تھا اس لئے میں نے اپنے آپ کو متحرک کیا اور اپنے وجود سے قمیض اتار کر دور پھینکی......

اف خدایا! کیڑوں کو دیکھ کر میرے جسم میں خوف کی پھریریاں سی دوڑنے لگیں کیونکہ وہ تعداد میں اتنے زیادہ تھے کہ ایک دوسرے کے وجود سے گتھم گتھا ہوئے جا رہے تھے اور سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ میرا گوشت نوچ کر کھا رہے تھے اور مجھے اذیت بھی محسوس نہ ہونے پا رہی تھی...... تاہم خوف ودہشت سے چیختے چلاتے ہوئے میں نے جھٹک جھٹک کر ان کیڑوں کو اپنے نصف وجود سے زمین پر گرانے شروع کر دیئے...... جو ایک دوسرے کے اوپر چڑھے ہوئے تھے وہ تو بآسانی زمین پر گرتے رہے...... لیکن جو میرے جسم کے گوشت میں اپنے سوئیوں جیسے پیر پیوست کئے میری جسم سے کسی جونک کی مانند چپٹے ہوئے تھے ان کو اپنے جسم سے الگ کرنا بہت مشکل تھا...... جب میں انہیں اپنے جسم سے کھینچ کر الگ کرنے کی کوشش کرتا تو میرے جسم کا گوشت بھی ادھڑ کر رہ جاتا...... اگر ہزاروں نہیں تو سینکڑوں کیڑے میں نے اپنے وجود سے نوچ نوچ کر پھینکے...... اور انہیں اپنے جوتوں تلے کچلتا رہا...... بلکہ کچل کچل کر ان کا خاتمہ کرتا رہا...... اور مجھے اعتراف ہے کہ جب میں نے ان کیڑوں سے اپنے دھڑ کو آزاد کروایا تو میرے دھڑ کا گوشت وہ کھا چکے تھے۔

ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کیڑے صاف میرے نصف دھڑ کا اوپری گوشت ہی کھانے کے لئے بطور خاص نازل کئے گئے تھے کیونکہ میرے جسم کے اندرونی تمام اعضاء بالکل محفوظ تھے...... بالکل ٹھیک کام کر رہے تھے۔ میں ان کیڑوں سے اپنے وجود کو رہائی دلوا کر ابھی سکون کی سانس بھی لینے نہ پایا تھا کہ مردہ کیڑوں کی تعداد سے چار گنا زیادہ تعداد میں کیڑوں کو زمین پر رینگتے ہوئے اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر میری سیٹی گم ہو کر

رہ گئی، میں حواس باختہ سا ہو کر بھاگ کھڑا ہوا اور بے اختیار اس نہر میں کود پڑا جس میں کودنے کے بعد آدمی کی شخصیت ہی بدل کر رہ جاتی ہے۔"

بزرگ کی اس بات نے بابو کو حیرت سے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

"تو کیا آپ......؟" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا اور نہ ہی اسے کچھ کہنے کی ضرورت تھی وہ شخص بابو کے ادھورے جملے کا بھی مطلب سمجھ چکا تھا۔

"ہاں میری عمر 42 سال ہے......لیکن میں جانتا ہوں کہ تم مجھے ایک سو 42 سال کا کوئی انسان سمجھ کر مجھے اتنی عزت واحترام دے رہے تھے جس کا میں خود کو مستحق نہیں سمجھتا۔" اس شخص نے کہا۔

"آخر اس نہر میں ایسا کیا طلسم پوشیدہ ہے کہ آدمی ایک دم سے بوڑھا ہو کر رہ جاتا ہے۔" بابو نے دکھ سے دریافت کیا۔

"میں نے کہا ہے کہ یہ عبرت کی جگہ اور یہاں ہم جیسے برے انسانوں کے ساتھ کچھ بھی انہونی ہو جائے کم ہے......اس نہر میں ایسا کوئی طلسم پوشیدہ نہیں ہے یہ صرف ہمارے برے اعمال کی سزا ہے جو ہم نے بھگتی ہے اور جب تک زندگی ہے یونہی بھگتتے رہیں گے......میں نے اگر اس مظلوم آدمی کا علاج کر دیا ہوتا تو آج میرے جسم کی یہ حالت نہ ہوتی......اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ میں چاہتے ہوئے بھی اپنا علاج کرنے سے قاصر رہوں گا۔" اس شخص نے ایک کرب سے کہا۔

"کیا محبت کرنا بھی بہت بڑا گناہ ہے؟" بابو نے سوال کیا۔

"نہیں! بڑا تو کیا چھوٹا گناہ بھی نہیں ہے لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟" اس شخص نے دریافت کیا۔

"مجھے تو قدرت نے ایسی کڑی سزا محبت کرنے ہی کی دی ہے۔" بابو نے دکھ سے کہا۔

میں نہیں مانتا کہ قدرت کسی کو محبت کرنے کی ایسی کڑی سزا دے سکتی ہے۔" اس شخص نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا اور پھر بابو نے اس شخص کے اصرار کرنے پر اسے اپنی کتاب زندگی کا ایک ایک ورق پڑھ کر سنا دیا جو وہ شخص نہایت توجہ سے اقرار میں گردن ہلاتے ہوئے سنتا رہا۔

"تمہاری ساری کہانی سن کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تمہیں یہ سزا ماں باپ سے نافرمانی، ان کے دل دکھانے، اپنی بہنوں کو اپنی خوشیوں کی راہ کی رکاوٹیں سمجھنے اور سب سے بڑھ کر اپنی غرض میں اندھے ہو جانے کی ملی ہے......دراصل ہم اپنا احتساب خود نہیں کر پاتے کہ ہم سے کب، کہاں، کون سی غلطی سرزد ہوئی ہے؟ ہمیں جب اپنی غلطیوں کی سزا ملتی ہے تو ہم قدرت کو کوسنے لگتے ہیں کہ ہم سے ایسی کیا غلطی یا گناہ سرزد ہوا ہے جو ہمیں ایسی کڑی سزا دی گئی لیکن وہ جو دنیا کا تخلیق کار ہے وہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کیسے کب اور کیسی سزا ہے؟ دراصل ہم جیسے لوگ سزا پانے سے قبل اس بات کا اندازہ ہی نہیں کر پاتے ہیں کہ ہماری باتوں یا حرکات سے کسی کو کتنی تکلیف پہنچی ہے؟ کون کس کرب سے گزرا ہے؟......لیکن وہ تو جانتا ہے؟" اس نے یہ کہہ کر چند لمحوں کا وقفہ اختیار کیا۔

"اور دوسری بات تم میں یقیناً کوئی ایسی اچھی اور قابل تعریف عادت تو ضرور ہو گی جو شیطان کو گراں گزر رہی تھی اور اس مردود نے تمہیں اپنے جال میں پھانسنے کے لئے یہ سارا ڈرامہ رچایا تھا۔" اس شخص کی یہ بات سن کر بابو کے دماغ میں چھناکا سا ہوا۔

"وہ برگد والے بابا......وہ غائب وجود خیر خواہ؟ کیا وہ سب شیطان کے ہتھکنڈے تھے؟" بابو کا دماغ ہل کر رہ گیا اور بابو نے اپنے

دوست لٹو کو سنائی ہوئی کہانی اسے سنادی اور پھر خیر خواہ کی بات کے علاوہ معصومہ کی بات بھی۔

''میرا خیال تو یہی ہے..... تمہارے دوست نے جو تمہیں برگد والے بابا کی کہانی سنائی ممکن ہے وہ سچ ہو؟ اور جہاں تک غائب وجود خیر خواہ کی بات ہے وہ اگر خود شیطان نہیں تھا تو یقیناً شیطان ہی کا کوئی چیلا ہوگا بہر حال وہ جو کوئی بھی تھا کم از کم تمہارا خیر خواہ ہرگز نہیں تھا اگر ایسا ہوتا تو جب تم حصار توڑ کر بھاگے وہ تمہیں تحفظ مہیا کر سکتا تھا؟ جب برگد والے بابا کے ٹھکانے سے وہ 55,50 کلو میٹر کا فاصلہ چٹکی بجاتے ہی طے کرتا ہوا تمہیں چلے کی جگہ تک پہنچا دیا کرتا تھا تو کیا وہاں سے تمہیں با حفاظت گھر پہنچانا اس کے لئے کیا کوئی مشکل تھا؟'' اس شخص کی باتیں بابو کے دماغ کو جھنجھوڑتی رہیں۔

''کیا معصومہ کی محبت بھی ایک ڈرامہ تھی؟'' اس کا دل یہ سچائی تسلیم کرنے کو کسی بھی طور تیار نہ تھا۔

''کیا کہا جا سکتا ہے؟ یہ تو وہاں پہنچ کر ہی تمہیں معلوم چلے گا۔'' اس شخص نے کہا۔

''کیا میں یہاں سے نکل پاؤں گا؟'' وہ ایک دم سے خوش ہو کر پوچھ بیٹھا۔

''کیوں نہیں؟ لیکن اپنے جسم کے زخم بھرنے کے بعد۔'' اس شخص نے مسکرا کر کہا۔

''یہ زخم کب تک بھر پائیں گے؟'' وہ بے صبری سے پوچھ بیٹھا۔

''اللہ نے چاہا تو ہفتے دس دن کے اندر تمہارے تمام زخم خشک ہو کر ٹھیک ہونا شروع ہو جائیں گے پھر تم اپنے گھر جا سکو گے؟'' اس شخص نے کہا۔

''کیا اس عبرت گاہ سے باہر نکلنے کا بھی کوئی راستہ ہے؟'' بابو نے حیرت سے دریافت کیا۔

''انسان جب دنیا میں آتا ہے تو دنیا سے جانا بھی ہے اس لئے اس عبرت گاہ میں آنے والے اس عبرت کدہ سے باہر بھی نکلتے ہیں۔'' اس شخص نے مسکرا کر جواب دیا۔

''آپ نے کہا کہ آپ برسوں سے یہاں رہ رہے ہیں اور یک و تنہا یہاں رہتے ہوئے آپ زندگی کے دن کیسے بسر کر رہے ہیں؟ آپ کو یہاں ڈر نہیں لگتا؟'' بابو نے ایک اور سوال کیا۔

''زندگی کے دن رات بسر نہیں کر رہا بلکہ کاٹ رہا ہوں کیونکہ سزا ہمیشہ کاٹی جاتی ہے...... اپنوں کی دھتکار، نفرت اور طعنے وطنز کے تیر سہنے سے میں نے بہتر یہی سمجھا کہ خود کو اس طرح سزا دیتا رہوں، اس طرح کرنے سے میں کم از کم اپنے بیوی بچوں کے دل میں زندہ تو رہوں گا۔'' اس شخص نے کہا۔

''یہ جگہ کیوں محفوظ ہے؟ آپ نے یہ جگہ خود تلاش کی یا کسی رحم دل انسان نے...... ؟ جیسا کہ آپ مجھے یہاں لائے۔'' بابو نے کہا۔

''یہ جگہ اس لئے محفوظ ہے کہ اس کے قریب ایک مسجد تعمیر ہے مجھے نہیں معلوم کہ یہ مسجد کس نے تعمیر کی یا یہ کہ کتنے برسوں سے اس مسجد کی عمارت یہاں کھڑی ہے؟ لیکن اس عبرت کدے میں بھٹکنے والے انسانوں کی سزا جب ختم ہونے لگتی ہے تو وہ خود بہ خود اس مسجد کی جگہ آن نکلتا ہے یا اسے اس مسجد کی عمارت دکھائی دینے لگتی ہے...... مجھ میں تو اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں یہاں پہنچ پاتا بس سزا کی گھڑیاں تمام ہوئی تھیں اس لئے جب

ہوش آیا تو خود کو اس کمرے میں پایا...... اگرچہ میں نے کسی وجود کو اپنے قریب نہیں پایا لیکن پھر بھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی ہے جو میرے ارد گرد متحرک ہے اور میری ہر ضرورت کا خیال رکھ رہا ہے کیونکہ مجھے کھانے کے لئے پھل وغیرہ از خود مل رہے تھے...... پھر جب مجھ میں ہمت جاگی تو وہ نادیدہ وجود جو میری دیکھ بھال کر رہا تھا وہ شاید مجھے ٹھیک ہوتے دیکھ کر چلا گیا...... لیکن جانے سے قبل وہ میرے سرہانے اس جگہ سے نکلنے کا راستہ اس سامنے کی دیوار پر کندہ کر گیا...... لیکن اپنے جسم کی یہ حالت اور جوانی سے ایک دم سے بڑھاپے کی انتہائی حد تک پہنچ جانا، دیکھ کر میں نے یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''یہاں سے نکلنے کا راستہ اس جنگل سے ہو کر نکلتا ہے۔'' اس شخص نے دیوار پر کھدے ہوئے نقشے کے ایک مقام پر انگلی رکھتے ہوئے بابو کو بتایا۔

بابو کے جسم پر آئی تمام چوٹیں بالکل ٹھیک ہو چکی تھیں اور سارے زخم بھی خشک پڑ گئے تھے صرف ٹوٹا ہوا بازو جڑ نہیں پایا تھا کیونکہ اس شخص کو اس کے بازو کی مڑی ہوئی ہڈی کا بل دور کرنا نہیں آتا تھا۔

''یہاں کثرت سے شر پسند ارواح خبیثہ کا بسیرا ہے...... تمہیں بہت احتیاط برتنی پڑے گی...... یہاں میں سوائے اس تعویذ کے تمہاری زندگی کی حفاظت کے لئے تمہیں کچھ اور نہیں دے سکتا...... یہ تعویذ بھی مجھے اس دیوار پر لٹکا ملا تھا جس پر یہاں سے نکلنے کا راستہ کندہ ہے شاید یہ تعویذ وہی نادیدہ ہستی میری حفاظت کے لئے چھوڑ گئی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں اس تعویذ کی اب مجھ سے زیادہ تمہیں ضرورت ہے میں تو پہلے ہی اللہ کے گھر میں اللہ کی حفظ و امان میں رہ رہا ہوں۔'' اس شخص نے کہا اور اپنے ہاتھوں سے تعویذ بابو کے گلے میں پہنا دیا تو بابو بے اختیار اس کے وجود سے لپٹ پڑا۔

''اللہ نگہبان۔'' اس شخص نے بابو کو خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ بابو نے الوداعی نگاہوں سے مٹی کے چھوٹے سے کمرے کے در و دیواروں کو دیکھا اور کمرے سے باہر کی جانب چل پڑا۔

پورے جنگل پر بھیانک ترین سناٹا مسلط تھا اس قدر گہرا سکوت طاری تھا کہ وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کا شمار کر سکتا تھا اگر حشرات الارض کی آوازوں نے گونج مچا نہ رکھی ہوتی تو وہ خود کو کسی کنوئیں کا باسی تصور کرتا۔

☆......☆......☆

''اللہ کی مقدس کتاب کے مقدس و متبرک الفاظ سے لکھا ہوا تعویذ جب تیرے گلے میں ہے تو تجھے یہاں بسنے والی بری روحوں، چڑیلوں اور بھوتوں سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

اس غیر مانوس مردانہ آواز کے سماعتوں میں پڑتے ہی بابو نے چہرہ بلند کر کے دیکھا تو اپنے سامنے ایک نورانی چہرے والے شخص کو کھڑے پا کر اسے اللہ جانے کیوں سکون و اطمینان سا حاصل ہوا؟

''ڈر و خوف انسان کے دل و دماغ پر حاوی ہو کر اس کی عقل و سمجھ کو کھا ڈالتا ہے...... نگل لیتا ہے اور انسان کا جہاں دل چاہے اس سمت بھاگ کھڑا ہوتا ہے...... اس لمحے وہ یہ بھی سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتا کہ وہ کہیں غلط سمت میں تو نہیں جا رہا؟'' اس نورانی چہرے والے کی مسکراہٹ نے بابو کے اندر اٹھ کر کھڑے ہونے کی ہمت جگائی۔

''تجھے غلط سمت میں دوڑتے دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا میں نے سوچا کہ تیری رہنمائی کی جائے۔'' نورانی چہرے والے شخص نے آگے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد وہ مزید کوئی بات کئے آگے بڑھتا رہا بابو بھی مہر خاموشی ثبت کئے اس کے پیچھے ہی پیچھے چلتا رہا۔

جوں جوں وہ گھنے جنگل میں آگے بڑھتے رہے اندھیرا گہرے سے گہرا ہوتا چلا گیا۔ بابو یہ سوچے بنا نہ رہ سکا کہ اگر وہ یک وتنہا اس جنگل میں داخل ہوتا تو یقیناً بھٹک چکا ہوتا اور نا ہی اس کی نگاہوں کی بتیاں گہرے اندھیرے میں راہ میں حائل کسی رکاوٹ کو دیکھ پا رہی تھیں۔

''احتیاط سے اترنا! آگے ڈھلان ہے اور ڈھلان پر چھوٹے بڑے پہاڑی پتھر بچھے ہوئے ہیں۔'' پرنور چہرے والے کی صرف آواز بابو کو سنائی دی اس کا وجود اندھیرے کا حصہ بن کر بابو کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

''مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔'' بابو نے بے بسی سے جواب دیا۔

''لاؤ...... اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔'' ان الفاظ کے ختم ہوتے ہی اس شخص نے بابو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا بابو کو ایسا لگا جیسے ٹھوس برف کا کوئی ٹکڑا کسی نے اس کی ہتھیلی سے لگا دیا ہو اسے یہ سوچ کر اطمینان حاصل ہوا کہ اس سے ہمدردی کرنے والا شخص بھی اگرچہ ایک روحانی وجود تھا لیکن وہ جنگل میں بسنے والی شر پسند روحوں جیسا نہیں تھا۔

''یہ جنگل اور اس کے اردگرد کی جگہیں میرے لئے اجنبی ہیں مجھے جنگل سے باہر نکلنے کے بعد بھی آپ کی رہنمائی کی ضرورت پیش آئے گی۔'' بابو نے کہا۔

''میرا کام ہی تیرے جیسے انسانوں بلکہ بھٹکے ہوئے انسانوں کو راستہ دکھانا ہے..... تو فکر مت کر میں تیری رہنمائی کے لئے تیرے ساتھ ہوں۔'' اس نے جواب عنایت ہی فرمایا تھا کہ عین اسی لمحے ریل کے انجن کی طویل چیخ نے جنگل کے ماحول کو مرتعش کر کے رکھ دیا بابو کو لگا جیسے صور اسرافیل پھونک دی گئی ہو۔

''کیا آگے کہیں ریلوے اسٹیشن بھی ہے؟'' بابو نے خوش ہو کر دریافت کیا بہت دور سے آتی ریل کی چھک چھک کی آواز بابو کو سناٹے کے باعث صاف سنائی دے رہی تھی۔

''ہاں! ہم اسی سمت جا رہے ہیں۔'' نیک روح کی صرف آواز سنائی دی۔

چند قدم آگے بڑھتے ہی دائیں بائیں گنجان درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا بابو نے شدت سے یہ بات محسوس کی کہ عجیب وغریب چیخ و پکار کی آوازیں ہر سمت سے بلند ہو رہی تھیں وہ ایسی آوازیں تھیں جن کو نا تو انسانوں کی چیخ و پکار سے تشبیہ دی جا سکتی تھی اور نا ہی درندوں کی ہیبت ناک دھاڑ یا دل دہلا کر رکھ دینے والی چنگھاڑ کہنا مناسب تھا۔ یہ آوازیں انسانوں کی چیخ و پکار اور جانوروں کی بھیانک ترین غراہٹوں کے باہم ملاپ سے پیدا ہونے والی بہت ہی عجیب وغریب اور لرزا براندام کر کے رکھ دینے والی آوازیں تھیں۔

اف خدایا! ایسی بھیانک آوازیں تھیں کہ دل کی دھڑکنیں بکھیر کر رکھ دے ایسی بھیانک آوازیں اس نے آج سے پہلے کبھی نہیں سنی تھیں،

ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سیکڑوں خونخوار بلیاں ناک سے بولنے والی عورتوں کی آواز میں آپس میں جھگڑ رہی ہوں...... کئی مرد شیر کی مانند دھاڑ رہے ہوں اور کئی انسانوں کے بچے کتوں کی مانند بھونک اور ایک دوسرے پر غرا رہے ہوں خوف نے بابو پر اپنا جال پھینکنا شروع کر دیا۔

''یہ آوازیں کیسی ہیں؟'' بابو کے لہجے اور لفظوں سے خوف چھلکتا محسوس ہو رہا تھا۔

''تو چپ چاپ چلتا رہ...... ادھر ادھر کی آوازوں پر دھیان مت دے۔'' جواب ملا۔

رات کی ابتدا ہوتے ہی جنگل میں ایسا بھیانک اندھیرا اتر آیا تھا جیسے آدھی سے زیادہ رات گزر چکی ہو یہی وجہ تھی کہ زمینی کیڑوں کی سیٹیاں اور سرگوشیاں سوئیوں کی مانند دماغ میں چبھ رہی تھیں۔ چمگادڑوں کے غول کے غول سیاہ ہیولوں کی مانند فضا میں تیرتے ہوئے نظر آ رہے تھے اور درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندوں کی خوابناک صدائیں بہت ہی پراسرار محسوس ہو رہی تھیں۔

اس جگہ گھٹتے چاند کی روشنی کے باعث آنکھوں کو کچھ دھندلا سا دکھائی دینا شروع ہو چکا تھا اور یہاں ہوائیں بھی کچھ اس طرح محو رقص تھیں کہ زمین پر گرے ہوئے زرد وخشک پتے چمگادڑوں ہی کی طرح فضا میں اڑ رہے تھے اور ایک دم سے چہرے سے بھی آن ٹکرائے جا رہے تھے۔

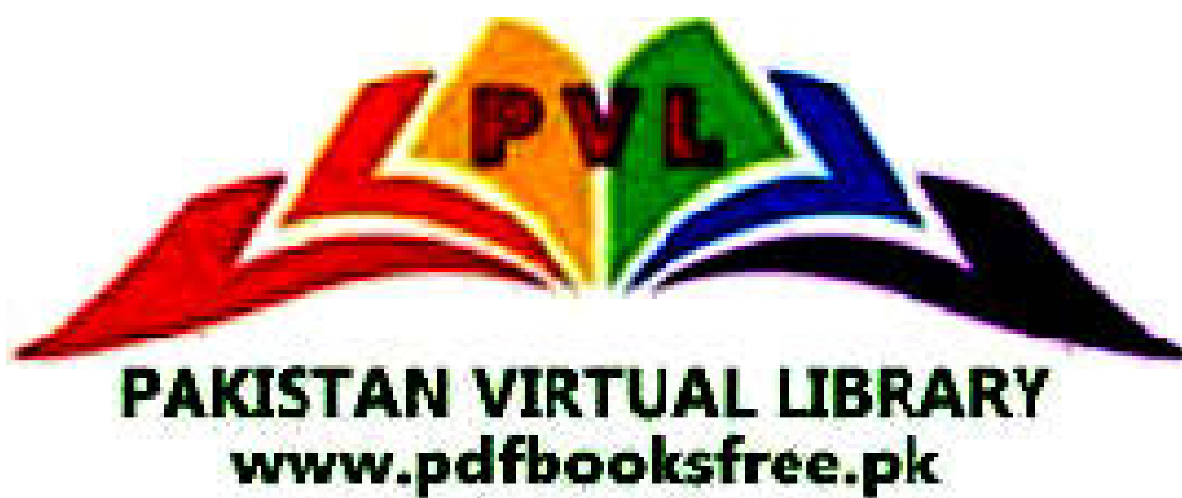
بہر حال اللہ اللہ کر کے وہ اس روح کی راہنمائی میں بھیانک جنگل کی حدود سے نکل کر ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔

''کوئی دیر ہے کہ ریل گاڑی پہنچتی ہی ہوگی میری حد بس یہیں تک ہے...... ریل یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرتی کیونکہ انسانی روپ میں اس جنگل میں بسیرا کرنے والی بدروحیں بھی موقعہ سے فائدہ اٹھا کر ریل میں گھس جاتی ہیں اور مسافروں کو ہراساں کرنے کا فریضہ انجام دینے لگتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس اسٹیشن سے سوار ہونے والے انسانوں کو یا تم جیسے کسی بھولے بھٹکے انسان کو سوار ہوتے دیکھ کر لوگ ہراساں ہونے لگتے ہیں...... بہر حال یہاں سے نکلنے کا یہی ایک راستہ ہے اس لئے تمہیں ہر حال میں آنے والی ریل گاڑی میں سوار ہو کر اس حدود سے نکلنے کی کوشش کرنا ہے۔'' نیک روح نے بات ختم ہی کی تھی کہ ریل کی چھک چھک سنائی دینے لگی۔

''چلتا ہوں۔'' پرنور چہرے والے اجنبی نے کہا اور جانے کے لئے پلٹ گیا۔ بابو نے دیکھا کہ صرف دو چار قدم آگے بڑھانے کے بعد اس کا وجود از خود غائب ہو کر رہ گیا۔

بابو کے لئے ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل ہو رہا تھا وہ دل ہی دل میں خدا سے دعائیں طلب کر رہا تھا کہ کسی خون آشام چڑیل کی آمد سے پہلے ریل گاڑی آن پہنچے اور اسے مایوسی نہیں ہوئی جب اس نے ریل گاڑی کے ہیولے کو قریب آتے ہوئے دیکھا تو اس کے لبوں پر خوشی سے بھرپور مسکراہٹ نے آن کر بسیرا کر لیا۔

☆......☆......☆


PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

صبح سویرے اپنے علاقے کی حدود میں قدم رکھتے ہی مارے خوشی کے بابو کا دل بلیوں اچھلنے لگا وہ تو مسکراتی نگاہوں سے سب کو بڑی اپنائیت ومحبت سے گھورے جا رہا تھا لیکن اسے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ اس کے قریب سے گزرنے والا اس کے محلے کا ہر شخص اسے عجیب نگاہوں سے تک رہا تھا ان میں سے کسی ایک کی نگاہوں میں بھی اس کے لئے شناسائی کا عکس نہیں لہرا رہا تھا بلکہ محلے کی بچیاں اسے دیکھ کر ایک دم سے دوڑ پڑی تھیں...... کئی عورتوں نے اسے دیکھ کر انتہائی بری سی شکل بنا کر اپنے ناک و منہ اس طرح اپنے دوپٹوں سے ڈھانپ لئے تھے جیسے انہوں نے کوئی کراہیت آمیز چیز یا بدبودار گندگی کا ڈھیر دیکھ لیا ہو۔

اس نے دیکھا کہ پہلوان دودھ والا بھی اپنے پہاڑ جیسے وجود کے ساتھ اپنی دکان میں دودھ سے بھری دو بڑی لوہے کی کڑاہیوں کے درمیان بیٹھا اسے مشکوک نگاہوں سے گھورے جا رہا تھا۔

''کس کو ڈھونڈ رہے ہو بابا جی؟ کوئی کھو گیا ہے؟ آپ کہاں سے تشریف لائے ہو؟ پہلے کبھی آپ کو نہیں دیکھا؟'' اس سے پہلے کہ وہ پہلوان دودھ والے کو مخاطب کر پاتا پہلوان کے لبوں سے ادا ہونے والے الفاظ نے اسے وہ تلخ سچائی یاد دلا دی جو چند لمحوں کے لئے اس کے دماغ کی سلیٹ پر سے ایک دم سے مٹ کر رہ گئی تھی۔

ایک دکان پر لگے آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر وہ کرب کی زیادتی سے سسک اٹھا۔ وہ بے اختیار پھوٹ کر رونے لگا اسے روتے دیکھ کر کئی لوگ اس کے اردگرد جمع ہونا شروع ہو گئے۔

''یہ بابا کون ہے؟ یہ رو کیوں رہا ہے؟'' ہر لب سے یہی سوال ادا ہو رہے تھے لیکن جواب کسی کے پاس نہ تھا۔

''میں بابو ہوں بابو، عبداللہ کا بیٹا۔'' اس کے لبوں سے ادا ہوئے الفاظ نے کچھ ایسا جادو کر کے رکھ دیا کہ لمحے بھر کے لئے وہاں موجود لوگوں پر ایسی گہری خاموشی طاری ہو کر رہ گئی اور اس سے پہلے کہ لوگوں کے سوالات اسے پاگل کر کے رکھ دیتے ہجوم کو چیرتا ہوا لٹو کا وجود نمودار ہوا اور بابو کی جانب بڑھنے لگا۔

''بابو؟'' سر سے پاؤں تک بابو کو بدلا ہوا پا کر لٹو کو شدید دھچکا لگا لیکن فی الحال اس نے کوئی سوال پوچھ کر بابو کو مزید اذیت پہنچانا گوارہ نہ کیا اور اسے ہجوم سے نکالتا ہوا اپنے گھر کی راہ ہو لیا۔

راستے میں بابو پر بے ہوشی کا شدید حملہ ہوا اور وہ لٹو کی باہوں میں جھول کر رہ گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک اسپتال کے کمرے میں پایا اسے بہت تیز بخار نے گھیر رکھا تھا۔ لٹو کو اپنے سرہانے کھڑے پا کر اس نے اسپتال کے تولیے سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ وہ ایسا بھیانک چہرہ کسی کو نہیں دکھائے گا جسے دیکھ کر لوگوں کو کراہیت محسوس ہو یا وہ اس کی جانب دیکھ کر بے اختیار کان پکڑ کر یا ناک رگڑتے ہوئے توبہ استغفار کرنے لگیں یا ان کی نگاہوں میں نفرت رقصاں دکھائی دے۔ اس میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ وہ کسی کی نفرت کے تیر سہہ پاتا کیونکہ وہ پہلے ہی اتنا کچھ سہہ چکا تھا کہ مزید کچھ سہنا اس کو جنونی بنا کر رکھ دیتا۔

''اب کیسی طبیعت ہے بابو؟'' لٹو اسے ہوش میں آتے دیکھ کر مسکرا کر پوچھ بیٹھا۔

''ماں! اماں کا کیا حال ہے؟'' اس نے بے چینی سے دریافت کیا۔

''تیری ایک رات کی گمشدگی نے چاچی کی آدھی جان نکال لی تھی یاد ہے نا تجھے؟ تو پھر تو خود سوچ تیرے مہینے بھر کی گمشدگی نے چاچی پر کیا اثر ڈالا ہوگا؟'' لٹو کے چہرے پر چھا جانے والے دکھ نے بابو کا دل دھڑکا کر رکھ دیا۔

''کیا ہوا؟ اماں کو!'' وہ تڑپ اٹھا۔

''پہلے تو تیری گمشدگی کا صدمہ ہوا پھر آرام سے سو گئیں قبر کی گہرائیوں میں کبھی نہ اٹھنے کے لئے۔'' لٹو کے اس جواب نے اس پر بجلیاں سی گرا کر رکھ دیں وہ بت سا بنا لٹو کی صورت تکتا رہ گیا۔

''ابا! ابا تو ٹھیک ہے نا؟'' اسے ایک دم سے عبداللہ کا خیال آ گیا۔

''ہاں! چاچا زندہ ہے لیکن اپنا دماغی توازن کھو چکا ہے، کسی کو نہیں پہچانتا، دن بھر بھوکا پیاسا گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومتا پھرتا رہتا ہے اور ہر آنے جانے والے کو روک کر یہی پوچھتا رہتا ہے کہ تم نے میرے بابو کو تو کہیں نہیں دیکھا؟ دن میں سینکڑوں نہیں تو دسوں چکر وہ تھانے کے لگاتا ہے اور تمہاری گمشدگی کی رپورٹ لکھواتا ہے۔'' لٹو کی یہ بات اس کے ضبط کا امتحان بن گئی اور وہ اپنے ہاتھ سے بے دردی سے اپنا چہرہ پیٹتا رہ گیا۔

''یہ میں نے کیا کر دیا...... اپنی خود غرضی کی قربان گاہ پر اپنے ماں باپ کے وجود قربان کر ڈالے، واقعی مجھ جیسا انسان ایسی ہی سزا کا مستحق تھا۔'' وہ ضبط نہ کر کے رو پڑا دفعتاً اس کے دماغ میں خیال کا کوندا سا لپکا۔

''اور میری دو بہنیں؟'' وہ اپنے ایک ہاتھ کی مدد سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے ایک دم سے پوچھ بیٹھا اس کا دل یہ سوچ کر بیٹھا جا رہا تھا کہ اللہ جانے اس کی بہنوں کا کیا انجام ہوا ہوگا؟

''انہیں تیرا بہنوئی رمضان اپنے ساتھ اپنے گاؤں لے کر چلا گیا ہے۔'' لٹو نے جواب دیا۔

اس نے شکر ادا کیا کہ کوئی تو اچھی خبر اسے سننے کو ملی۔

''لیکن میری تجھ سے یہ التجا ہے کہ تو ان کے سامنے مت جانا...... اول اس لئے کہ وہ تجھے چاچی کی اچانک موت اور چاچا کے پاگل پن کا ذمہ دار سمجھتے ہوئے تجھ سے بے حد و حساب نفرت کرنے لگی ہیں اور دوسرے اس لئے کہ تیرا یہ عبرت ناک روپ ان کے دل و دماغ پر بھی کوئی برا اثر ڈال سکتا ہے۔'' لٹو کی یہ بات اس کے دل میں ڈھیروں دکھ بھر گئی وہ اپنے آنسو روکنے کی کوشش میں جت گیا۔

☆......☆......☆

اسپتال سے خارج ہوتے ہی وہ سیدھا جانم کے مکان کی سمت بڑھا۔ حسب معمول اس کے مکان کا دروازہ کھلا پا کر وہ بے دھڑک اندر داخل ہو گیا ایک کمرے میں جانم اور اپنی چاہت معصومہ کو پا کر وہ خوشی سے پاگل ہوا تھا۔

''کون ہیں آپ بابا؟ اور اس طرح منہ اٹھائے کیسے مکان میں گھس آئے؟'' جانم غصے کی شدت سے باؤلی کتیا کی مانند غراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور نفرت و حقارت سے اسے گھورنے لگی۔

لیکن اس کی سماعتیں جانم کی آواز سننے سے قاصر تھیں کیونکہ وہ سراپا آنکھیں بنا اپنا محبت معصومہ کو تکتے ہوئے اپنی نگاہوں کی پیاس بجھاتا رہا۔

''میں نے کہا کون ہیں آپ بابا؟'' اس بار جانم کے لہجے کی گرج اسے ہوش کی دنیا میں کھینچ لائی۔

''میں...... میں بابو ہوں۔'' اس نے خوشی سے بھرپور لہجے میں جواب دیا لیکن اس لمحے اس کی ساری خوشیوں پر پانی پھر کر رہ گیا جب جانم اور معصومہ دونوں کے لبوں سے خوف و دہشت میں ڈوبی ہلکی چیخ خارج ہو کر رہ گئی۔ معصومہ ایک دم سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی جانم کی پشت پر جا چھپی اس کی ہرنی جیسی آنکھوں میں اپنی ہستی کے لئے خوف کی پرچھائیاں پا کر وہ غم و غصے کی زیادتی سے کانپ کر رہ گیا۔

''بابو! یہ تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے؟''

''20 لاکھ روپے کے حصول کے پیچھے اپنا سب کچھ گنواں بیٹھا ہوں...... طاقت، جوانی، خوب صورتی! یہاں تک کہ اپنے گھر والوں کو بھی کھو چکا ہوں...... یہ...... یہ معصومہ مجھ سے اتنا ڈر کیوں رہی ہے؟ میرے دل میں اب بھی تمہارے لئے وہی محبت ہے جو پہلے تھی۔'' جذبات کی رو میں بہہ کر وہ دو قدم آگے بڑھا۔

''پلیز! پلیز امی اس سے کہیے یہ وہیں رک جائے میرے قریب آنے کی کوشش نہ کرے، مجھے اس کی شکل سے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' معصومہ کے لبوں سے ادا ہونے والے یہ الفاظ! زہر میں بجھے ایسے تیر تھے جو اس کے لبوں کی کمان سے سنسناتے ہوئے نکلے اور عین بابو کے دل میں آن کر پیوست ہوتے رہے...... اذیت کی زیادتی نے اسے بلبلا کر رکھ دیا وہ کسی خونخوار بھیڑیے کی مانند غرا کر رہ گیا۔

''تم اپنی جگہ پر ہی کھڑے رہو۔ اور یہ بتاؤ کہ 20 لاکھ روپے لائے ہو؟'' جانم نے لہجے میں مصنوعی محبت بھر کر دریافت کیا۔

''نہیں! میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔''

''اب اس کی ضرورت نہیں۔'' جانم کے یہ الفاظ اسے بری طرح چونکا گئے۔ اس نے اپنی قہر برساتی نگاہوں کا زاویہ خطرناک ترین دھار والے خنجر سے ہٹا کر جانم کے چہرے پر مرکوز کر دیا۔

''میری بیٹی نے جس بابو سے محبت کی تھی۔ یا...... اگر سچائی سے کام لے کر بولوں تو یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ محبت کرنے کا ڈرامہ رچایا تھا تم وہ بابو ہی نہیں رہے تو محبت کہاں سے برقرار رہے گی؟''

''معصومہ یہ تمہاری امی کیا کہہ رہی ہیں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا...... تم بتاؤ کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟'' اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا اور آنکھوں میں گویا شرارے سے لپک رہے تھے۔

''نہیں! میں تم سے محبت نہیں کرتی...... پہلے بھی نہیں کرتی تھی اور اب تو ناممکن ہے۔'' معصومہ کے اس جواب سے اس پر کچھ ایسا جنون سوار ہو گیا کہ وہ چھت کی جانب چہرہ اٹھا کر اپنے منہ کا دہانہ کھولے اپنے جسم کی تمام تر طاقت سے چیخ پڑا۔

اس کی چیخ میں ایسا کرب، ایسی اذیت، ایسا درد پوشیدہ تھا جیسے کسی انسان سے کسی نے اس کی زندگی کا کل اثاثہ یا متاع حیات چھین لیا ہو۔

جانم اور معصومہ اس کے چہرے پر چھا جانے والی دہشت اور خوفناکیت کو دیکھ کر اپنی پوری جان سے لرز اٹھیں...... لیکن اس لمحے انہوں نے

دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا جب انہوں نے کسی ہارے ہوئے جواری کی مانند بابو کو مرے مرے قدموں سے دروازے کی جانب بڑھتے دیکھا جانم نے اپنا تیر نشانے پر لگتے دیکھ کر چہرہ گھما کر معصومہ کی جانب مسکرا کر دیکھا۔

یہ محض جانم کا خیال سا تھا کہ اچانک بابو دروازے کے قریب پہنچ کر رکا اور اگلے ہی لمحے اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور چہرے پر بھیانک ترین درندگی طاری کیے برق رفتاری سے اپنے پورے وجود کے ساتھ گھوم پڑا اور اپنی کوئلوں کی مانند دہکتی انگارہ نگاہوں سے جانم اور معصومہ کے خوف زدہ چہروں کی طرف دیکھا۔

☆......☆......☆

لٹو پاگلوں کی طرح بابو کو پورے علاقے میں کھوجتا پھر رہا تھا خبر ہی کچھ ایسی اس کی سماعتوں سے آن کر ٹکرائی تھی کہ وہ اپنی جان سے کانپ کر رہ گیا تھا جب اپنے تمام مخصوص ٹھکانوں پر اسے کہیں بھی بابو نہیں ملا تو اس نے اپنے اندازے کے مطابق قبرستان کا رخ کیا کیونکہ کل رات ہی بابو نے اس کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔

''میں ماں کی قبر پر جانا چاہتا ہوں......اس کی زندگی میں تو میں اس سے معافی طلب نہیں کر سکا کم ازکم اس کی قبر سے لپٹ کر ہی اپنی غلطیوں کی معافی تو مانگ سکتا ہوں کہیں یہ حسرت بھی پوری ہونے سے نہ رہ جائے۔'' اس کے لہجے میں بسا کرب لٹو کو بری طرح تڑپا گیا۔ وہ بابو سے بہت کچھ پوچھنے اور جاننے کا خواہش مند تھا لیکن وہ اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پا رہا تھا کہ بابو سے کوئی سوال کر سکے اس لئے اس نے بابو کو زلفاں بیگم کی قبر کی پہچان کے لئے کچھ نشانیاں بتا دیں تا کہ جب اس کا دل چاہے وہ اپنی ماں کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے جا سکے۔

اور لٹو کو مایوسی نہیں ہوئی قبرستان کی حدود میں قدم رکھتے ہی اس نے دور ہی سے بابو کو زلفاں بیگم کی قبر سے لپٹے دیکھ لیا وہ تیز تیز قدم اٹھائے اس کی جانب بڑھنے لگا قریب پہنچ کر اس نے دیکھا کہ بابو کا پورا وجود اس طرح ہل رہا تھا جیسے وہ رو رہا ہو اور وہ واقعی ماں کی قبر سے لپٹ کر بالکل بچوں کی ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔

لٹو کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے اس نے بابو کو رونے دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے دل میں بھرا غبار اسی طرح باہر آئے گا۔

''خود کو سنبھال میرے یار! اس طرح تو تو بیمار ہو جائے گا تیری تو پہلے ہی حالت بہت بری ہو رہی ہے۔'' کئی لمحات گزرنے کے بعد جب لٹو نے دیکھا کہ بابو کے رونے کی شدت میں کمی واقع ہونے لگی ہے تو اس نے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے اسے تسلی دی۔

''میں ٹھیک ہوں! تو یہاں؟'' اس نے قبر پر سے سر اٹھاتے ہوئے دریافت کیا اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور قبر کی مٹی اس کے چہرے سے چپک کر رہ گئی تھی۔

''خبر ایسی ہے کہ سن کر تو بھی اچھل پڑے گا؟'' لٹو کے الفاظ بھی اس کے تجسس کو ابھار نہ سکے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ لٹو اسے کون سی دھماکہ خیز خبر سنانے کے لئے آیا ہے؟

''جانم اور اس کی حسین و جمیل بیٹی معصومہ کو کسی نے ان کے مکان میں گھس کر دن دھاڑے قتل کر ڈالا ہے...... بلکہ قتل کہنا بھی غلط ہے کسی

نے نہایت بے رحمی وسفا کی سے انہیں ذبح کرڈالا ہے۔ دونوں عورتوں کے سر، بازو اور ٹانگیں ان کے جسموں سے کاٹ کر الگ الگ کردی گئی ہیں...... دونوں عورتوں کے وجود اپنے ہی خون میں نہائے پڑے ہیں پولیس نے آن کر تفتیش کا آغاز کردیا ہے دیکھیں وہ بے رحم قاتل بے نقاب ہوتا ہے یا نہیں؟

''بابو! کہیں تو نے تو......؟ لٹو اپنے دل کی بات نامکمل الفاظ میں ادا کرنے کے باوجود بیان کر گیا۔

''اس نے یہ کیوں کہا کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی؟ اس نے جھوٹی محبت کا ڈرامہ رچا کر میرے جذبات کا مذاق اڑایا میرے جذبات و احساسات سے کھیلتی رہی......اور جب میں اس کے لائق نہ رہا تو کسی ٹوٹی ہوئی جوتی کی مانند مجھے ٹھوکر مار کر اپنی زندگی سے نکال پھینکنے کی کوشش کرنے لگی جس لڑکی کو پانے کے لئے میں شیطان کے بچھائے گئے جال میں پھنستا چلا گیا اور اپنی جوانی، طاقت، اپنی وجاہت تک کھو بیٹھا اپنی پیاری ماں کو کھو بیٹھا...... اپنے باپ اور بہنوں کے پیار سے محروم ہو کر رہ گیا......تو خود ہی بتا لٹو؟ کیا میں اسے معاف کردیتا؟ اس کھیل میں ہر طرح سے ہار تو میرا مقدر بنی ہے اس کتیا کا کیا بگڑا؟ اس نے تو مجھے نادین کا رہنے دیا اور نا ہی دنیا کا......وہ ماں بیٹی بھی دراصل شیطان ہی کی چیلیاں تھیں، میں نے ان دونوں کو ذبح کر کے کسی بے رحمی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے ان دونوں کا اس سے بھی زیادہ بھیانک انجام ہونا چاہئے تھا۔

''پھر تو ایسا کر یہاں سے بھاگ جا نہیں تو پولیس تجھے پکڑ کر حوالات میں بند کردے گی تجھے چودہ سال کے لئے جیل بھی ہو سکتی ہے۔'' لٹو نے اپنے مشورے سے نوازا۔

لٹو کی یہ بات سن کر وہ تلخی سے ہنس پڑا۔''میں بھاگ بھاگ کر بہت تھک چکا ہوں۔ اب مجھ سے اور نہیں بھاگا جاتا۔ جو گناہ میں نے کیا ہے مجھے اس کی سزا ابھی اسی دنیا میں مل جائے تو اچھا ہے آخرت میں مجھے اس کی گرفت سے کون بچائے گا؟ میں نے تو کوئی ایسی نیکی بھی نہیں کی جو مجھے اس عذاب سے بچا سکے؟ میری ڈھال بن کر میری حفاظت کر سکے۔'' اس احساس نے اس کے دل کو گویا مسل کر رکھ دیا اور اپنی گزشتہ زندگی کا ایک ایک پل اسے یاد آ کر خون کے آنسو بہانے پر اسے مجبور کر گیا۔

☆......☆......☆

کسی انجانی قوت کے زیر اثر اس کے قدم از خود مسجد کی سمت اٹھنے لگے اس نے اپنی زندگی میں کبھی مسجد کو اندر سے نہیں دیکھا تھا اور نا ہی اسے یہ معلوم تھا کہ کس وقت؟ کون سی نماز ادا کی جاتی ہے؟ وہ مسجد کی سیڑھیوں پر ہی بری طرح لڑکھڑا کر رہ گیا وہ اپنے اندر مسجد میں داخل ہونے کی ہمت نہ پا سکا اور مسجد کی چوکھٹ پر ماتھا ٹیکے زار وقطار رونے لگا اتنا رویا کہ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

''سنو! تم نے میرے بابو کو کہیں دیکھا ہے......وہ کئی دنوں سے گھر نہیں آیا اس کی ماں اس کی راہ تک رہی ہے......خدا جانے کہاں چلا گیا ہے؟'' اپنے والد عبداللہ کی آواز سن کر اس نے چہرہ اٹھا کر اور گردن گھما کر دیکھا اور اپنے سامنے باپ کو کھڑے پا کر باپ کی حالت نے اسے دکھوں کی اندھی کھائی میں دھکیل کر رکھ دیا۔

بکھرے ہوئے سفید بال، بے تحاشہ بڑھی ہوئی داڑھی مونچھیں، بابو کے وجود کو کھوجتی پر امید نظریں، سفید وزردی میں گھلا چہرہ لاغر جسم اور

پھٹے ہوئے کپڑے! وہ واقعی کوئی جنونی، کوئی پاگل دکھائی دے رہا تھا۔

''ابا! مجھے معاف کر دو ابا'' وہ بے اختیار عبداللہ کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگا۔

''ارے کون ہو بھئی تم؟ میرے پیر تو چھوڑو! مجھے اپنے بیٹے کی تلاش میں جانا ہے۔ چھوڑو مجھے۔'' عبداللہ نے اسے خود سے دھکیل کر دور ہٹایا اور اس کی جانب دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔

جب تک پولیس جانم اور معصومہ کے قتل کی تحقیقات مکمل کر کے اس تک پہنچتی اور اسے پکڑ کر لے جاتی اس نے زلفاں بیگم کی قبر کے قریب اپنا ٹھکانہ بنالیا تھا۔

اور پھر ایک دن پولیس نے بابو کو گرفتار کرلیا۔ دو عورتوں کو وحشیانہ انداز سے ذبح کرنے کے جرم میں اسے پھانسی کی سزا سنائی گئی۔

اب اسے اپنے مرنے کا کوئی دکھ نہیں تھا کیونکہ مرنے سے قبل وہ شیطان کے دو حسین ہتھیاروں کا وجود مٹا چکا تھا، اپنی دانست میں جانم اور معصومہ کو جان سے مار کر اس نے نیک کام کیا تھا جو قانون کی نظر میں ایک سنگین جرم سہی لیکن اس کی نظر میں قطعی جرم نہ تھا۔

کیونکہ اگر شیطان کی وہ چیلیاں زندہ رہتیں تو اپنے ''شیطانی جال'' میں بابو جیسے انسانوں کو یونہی پھانستی رہتیں۔ اور بابو کسی اور بے قصور نوجوان کو اپنی طرح عبرت کی علامت بنتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

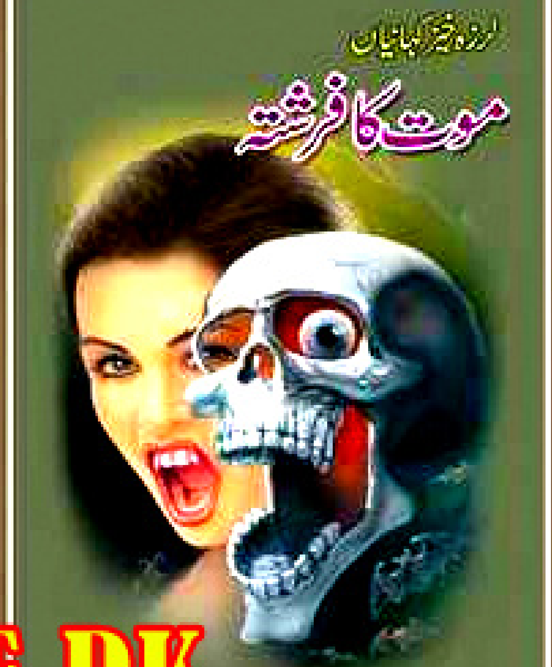
ختم شد

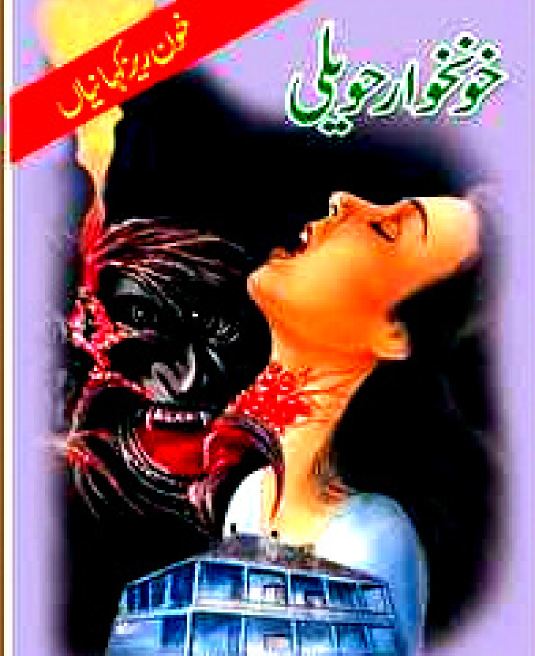
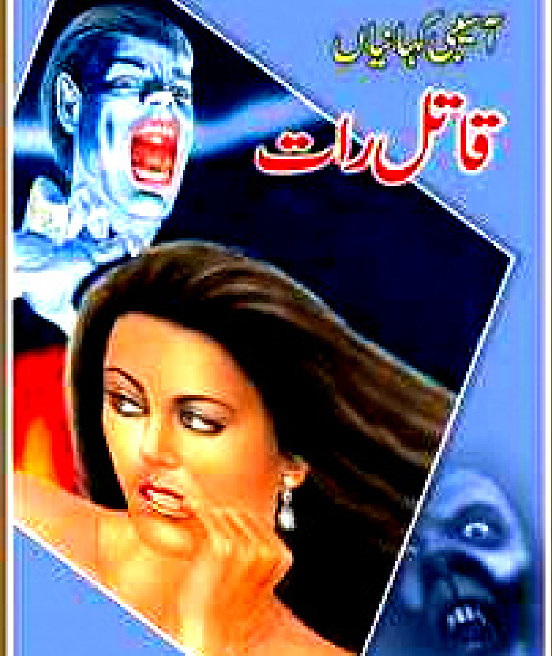

پراسرار کہانیاں
لمبے ہاتھ

بھیانک کہانیاں
بھٹکتی روح

وحشت ناک کہانیاں
لاش کا ہنگامہ

وحشت ناک کہانیاں
کفن چور

قلماقنی

لرزہ خیز کہانیاں
موت کا فرشتہ


ہولناک کہانیاں
بدروحیں

خون ریز کہانیاں
خونخوار حویلی

آسیبی کہانیاں
قاتل رات